قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2015، قیمت -/15₹

ماہنامہ اُردو دُنیا
دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

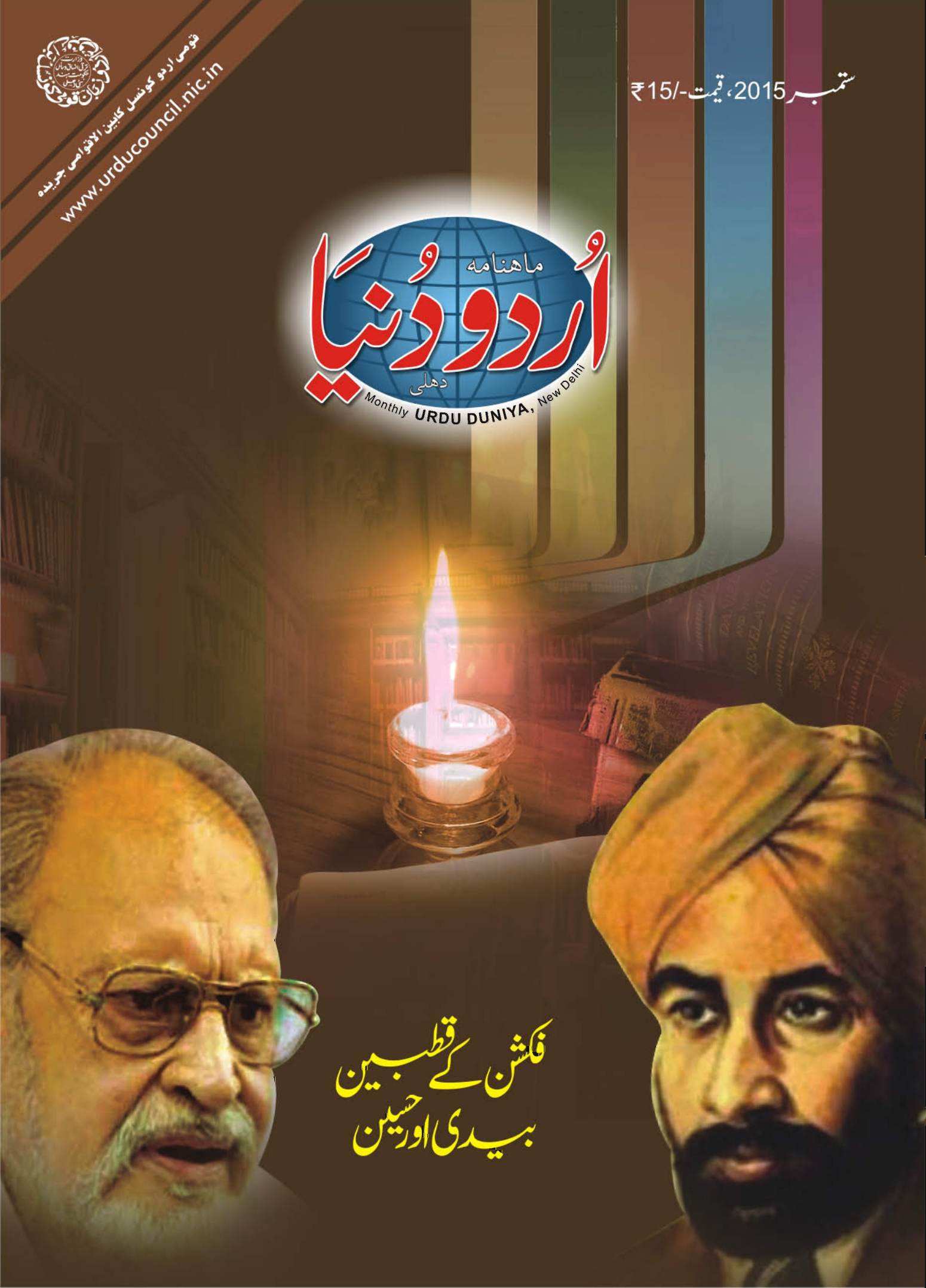

فکشن کے قطبین
بیدی اور حسین

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ♦ کامکس کہانی ♦ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

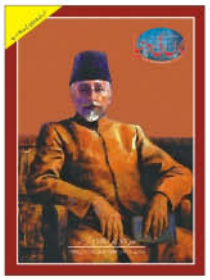

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے　　سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ:09 ستمبر 2015

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

قلمی خاکہ

پروفیسر ارتضیٰ کریم سہیل انجم 8

انٹرویو

تنقید کسی بھی دور میں ایمان دار نہیں رہی: مشتاق احمد نوری صدف اقبال 9

گوشہ راجندر سنگھ بیدی

زندگی نامہ: راجندر سنگھ بیدی جمیل اختر 12

راجندر سنگھ بیدی کا افسانوی جہان محمد بشیر مالیرکوٹلوی 19

بیدی کے افسانوں میں عورت کا احتجاج شائستہ فاخری 21

راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقی انفرادیت شکیل احمد 23

بیدی کی 'لاجونتی' حاذق فرید 26

راجندر سنگھ بیدی: مشاہیر کی نظر میں 28

گرم کوٹ راجندر سنگھ بیدی 30

گوشہ عبداللہ حسین

عبداللہ حسین: شخصیت وفن زیب النسا سعید 34

وقت ناول کا اصل امتحان ہے اقبال خورشید 37

عبداللہ حسین کے فن پر مذاکرہ اکرم کامل 41

قید طاہر مسعود 44

عبداللہ حسین کے دو ناولٹ ممتاز احمد خان 47

عبداللہ حسین کی کہانیوں کے کرداروں کا المیہ انیس اکرام فطرت 51

عبداللہ حسین: قدح قدح تیری یادیں

سبو سبو تیرا غم غلام ابن سلطان 57

کہانی اور کتنی دور جائے گی (نظم) نصیر احمد ناصر 60

'اداس نسلیں' کا ایک مختصر باب عبداللہ حسین 61

خراجِ عقیدت

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام عظیم انسان و سائنس داں محمد خلیل 63

بشر نواز: کروگے یاد تو ہر بات یاد آئے گی حمید سہروردی 66

بشر نواز کا رنگِ سخن خان مقیم خان 68

سرور عثمانی اور 'مفاہیم' شاہین نظر 70

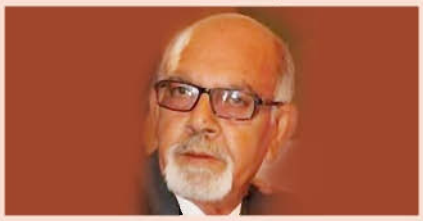

اظہارِ تشکر

اخبارات اور اداروں کا شکریہ 72

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 74

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 81

ہماری بات

تحریکیں صرف سماجی، سیاسی، معاشی نظریات پر ہی اثر انداز نہیں ہوتیں بلکہ زبان وادب بھی تحریکوں سے متاثر ہوتے ہیں۔تحریکیں طلوع وغروب کے عمل سے گزرتی رہتی ہیں مگر کچھ تحریکیں ایسی ہیں جن کے اثرات اجتماعی طرز احساس پر قائم رہتے ہیں۔وہ اپنا وجود کھو چکی ہوتی ہیں مگر اس کے جوہری عناصر ذہنوں میں زندہ رہتے ہیں۔

ادب میں بہت سی تحریکوں نے جنم لیا جس سے ادب کی ثروت اور وسعت میں اضافہ بھی ہوا اور تخلیق کاروں نے ان تحریکوں کے اثرات بھی قبول کیے۔انھیں میں ایک ترقی پسند تحریک بھی ہے۔اس تحریک نے نہ صرف سماجی اقداری نظام کو بدلنے کی کوشش کی بلکہ عوامی شعور اور احساس کو بھی بیدار کیا۔ایک تبدیلی کی لہر پیدا کرنے میں اس تحریک کا رول بہت اہم رہا ہے۔اس تحریک نے انفرادیت کے بجائے اجتماعیت پر زور دیا۔انحطاط پذیر سماجی تصورات اور مسلمات کے خلاف آواز بلند کی۔استعماریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف احتجاج کیا۔انسانی وجود سے جڑے ہوئے بنیادی مسائل پر توجہ مرکوز کی جن میں بھوک، غربت، جہالت اور توہم پرستی خاص طور پر اہم ہیں۔معاشی، سماجی اور سیاسی جبر کے خلاف بھی جنگ کا آغاز اسی تحریک نے کیا۔ طبقاتی نظام، معاشرتی استحصال کا خاتمہ امن، انصاف اور مساوات پر اس تحریک کا زور رہا ہے۔اس تحریک سے جڑے ہوئے تخلیق کاروں نے جو ادب پیش کیا اسے احتجاجی ادب کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ اردو کے بہت سے تخلیق کاروں نے اس تحریک کا اثر قبول کیا اور اسی کے منشور کے مطابق ادب تخلیق کرتے گئے۔ترقی پسند تحریک سے جڑی ہوئی تخلیق کاروں کی ایک بڑی کہکشاں ہے۔اسی تحریک نے منٹو، عصمت، کرشن چندر جیسے عظیم افسانہ نگار دیے جو اپنی لازوال تخلیقات کی وجہ سے ادب کے اجتماعی حافظے میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔راجندر سنگھ بیدی بھی اسی تحریک سے جڑے ہوئے فنکار تھے۔ان کی پیدائش یکم ستمبر 1915 کو ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے 2015 ان کی پیدائش کی صدی ہے۔صدی کی مناسبت سے مختلف ادبی ادارے، انجمنیں یقینی طور پر ان پر سیمینار اور گوشوں کا اہتمام کریں گی۔'اردو دنیا' نے بھی ان کے فکر وفن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک گوشے کا اہتمام کیا ہے جس میں مقتدر ادیبوں کی تحریریں شامل ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ ان مضامین کے ذریعے بیدی کی شخصیت اور فن کے تمام اہم پہلو سامنے آجائیں۔یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ہم عصروں کرشن چندر اور منٹو کے مقابلے میں بہت کم لکھا ہے لیکن بیدی کے بیانیے میں جو تنوع دکھائی دیتا ہے وہ دیگر افسانہ نگاروں کے یہاں کم ہے۔بیدی کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے کرداروں کی مناسبت سے پنجابی اور ہندی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا ہے۔

اس شمارے میں ایک گوشہ معروف فکشن نگار عبداللہ حسین سے بھی مختص ہے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔عبداللہ حسین ایک عظیم ناول نگار کے طور پر پوری اردو دنیا میں مقبول تھے۔انھوں نے 'اداس نسلیں' جیسا عظیم ناول دیا جو تنقیدی ڈسکورس میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ان کے ناولوں میں ہمارے سماج، سیاست اور ثقافت کی کشمکش اور تناؤ کی مکمل تصویر ملتی ہے۔اس گوشے میں جو تحریریں شائع کی جارہی ہیں ان کی فراہمی کے لیے چودھری ابن النصیر صاحب کا شکریہ بھی ضروری ہے۔

عبداللہ حسین کے علاوہ کچھ ایسی شخصیتوں نے بھی اس جہانِ رنگ وبو سے اپنا رشتہ توڑ لیا جن کے وجود سے کائنات میں روشنی تھی۔ان میں ایک نمایاں شخصیت ممتاز سائنس داں، میزائل مین، سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی ہے جن کی زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

دوسری اہم شخصیت بشر نواز ہیں جن کا تعلق شعر وادب کی دنیا سے ہے۔ان کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا۔ان دونوں شخصیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے بھی مضامین شامل کیے جارہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اردو دنیا کا یہ شمارہ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

کرشن بھاوُک
201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' کے جولائی کا دیدہ زیب و جاذب نظر شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے میں 'شاعر' جیسے پرانے اور موقر مجلّے کے مدیر افتخار امام صدیقی صاحب سے جناب اشتیاق سعید کا مشافہہ لائقِ ستائش ہے۔ آج سے چالیس سال قبل سنہ 1975 میں صدیقی صاحب پٹیالہ تشریف لائے تھے۔ انھوں نے مقامی اسٹیٹ لائبریری کے کشادہ ہال میں جب 'اس میں کوئی شکوہ ....' مطلع والی مشہور غزل ترنم سے سنائی تو تمام سامعین جھوم جھوم اٹھے تھے۔ انھیں کے بموجب وہ ہمیشہ 'کچھ نہ کچھ نیا کرنے کی کوشش' (ص 10) کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے تمام تر اپاہج پن اور معذوری کے باوصف آج بھی یہ جریدہ 'شاعر' کا وقار و معیار بدستور قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر بانو سرتاج کا مضمون بھی بطور ادیبہ ان کی مقبولِ عام شہرت کا ہی ضامن ثابت ہوا ہے۔ اس میں ادیباؤں کی ہندی و مراٹھی زبانوں کی نمائندہ کہانیوں میں تانیثیت کی بخوبی خط کشی کوزے میں سمندر مقید کرنے کے مصداق ہے۔ اگرچہ صادقہ نواب سحر نے اپنے جاندار و شاندار مضمون 'اردو ناول نگاری میں خواتین...' میں ڈاکٹر بچن سنگھ کی ہندی کتاب 'ہندی ساہتیہ کا دوسرا اتہاس' میں خاتون قلمکاروں کو فقط 13 سطور میں ہی نپٹا دینے کی واجب بات کہی ہے، تاہم اسی ہندی ادبی تاریخ میں اول بار ہی متوسط دور کے ہندی ادب میں غالب، ذوق وغیرہ متعدد شعرا کی مفصل تاریخ درج کی گئی ہے، جو کہ ایک قابلِ ستائش قدم ہے۔ کیا کسی اردو ادبی تاریخ میں تا حال کبھی کسی دور کے ہندی ادبا کا ذکر کیا گیا ہے؟

یہ شمارہ 'اردو ادب اور خواتین' جیسے اہم موضوع پر مبنی ہے۔ فوزیہ خانم کا مضمون بھی لائق ستائش ہے۔ اس میں بلند پایہ شاعرہ عذرا پروین کو بھی شامل کرنا تھا، جن کی شاعری خصوصاً تانیثیت کے عناصر سے مملو ہے۔ محمد عبد العزیز سہیل کے مقالے میں اردو تحقیق میں انٹرنیٹ کی افادیت و اہمیت کی نشاندہی قابلِ تحسین ٹھہرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

حسن طباعت و کتابت سے مزین اور محققانہ اور معلوماتی مضامین پر مشتمل اردو دنیا جولائی 2015 کا شمارہ باصرہ نوازا ہوا۔ حسب ذیل مضامین بہت زیادہ پسند آئے۔ گوشۂ اردو ادب اور خواتین کے تحت: اردو ادب میں خواتین کا حصہ، بھوپال کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ نواب شاہ جہاں بیگم، اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ، اردو ادب میں تانیثیت - گوشۂ زبان و تعلیم کے تحت: دانش مندی بمعنی کتاب دانی - ادبی مباحث کے تحت: جدید اردو شاعری اور شاد عارفی - شخصیات کے تحت عاشق اردو و جاہت علی سندیلوی۔

فارسی زبان اور تجھی نرائن شفیق - تہذیب اور ثقافت کے تحت: تصوف اور ہندوستان، اردو شاعری اور حلقہ تصوف زیادہ بہتر ہوتا اگر تصوف اور اسلامی تصوف کے مابین بنیادی فرق کو واضح کیا جاتا۔ اصطلاحات کے اگر آسان زبان میں مترادفات دیے جاتے تو بہت اچھا ہوتا۔

پچھلے نمبر میں راقم السطور کے مراسلے میں دو بڑی فاش غلطیاں نظر آئیں۔ ایک تو عہد اسلامی کے بجائے عہد اور دوسرے قائدین کے بجائے قانون۔

میرا جملہ یہ تھا کہ ''اس طرح یہ صحیح نہیں کہ امت مسلمہ کے زوال کے ذمے دار علما ہیں۔ مسلمانوں کے زوال کی وجہ اسلامی تعلیمات کے صریح مخالف غیر اسلامی اثرات کے تحت زندگی گزارنا اور غیر اسلامی زندگی گزارنے والے قائدین کی پیروی کرنا ہے۔''

علیم صبا نویدی
266، تریلی کین ہائی روڈ، فلیٹ نمبر 16، دوسری منزل،
رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی

اردو دنیا جولائی کا شمارہ ملا، نہایت افسوس کی بات ہے کہ محترمہ دردانہ قاسمی صاحبہ نے اپنے مضمون میں کرناٹک اور تمل ناڈو کی خواتین کی ادبی خدمات پر اپنی نگاہِ التفات ڈالنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ موصوفہ کا مضمون 'اردو ادب میں خواتین کا حصہ' عنوان کے اعتبار سے بہت خوبصورت ہے مگر ان کی تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے ہاں خواتین کی ادبی خدمات سے متعلق معلومات کا فقدان ہے۔ بظاہر ان کا تعلق ایک عظیم اردو مرکز (علی گڑھ) سے ہے مگر موصوفہ نے موضوع کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موصوفہ نے خواتین کی ادبی خدمات کے تعلق سے 'بہارستانِ ناز' مطبوعہ 1864 مولف حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی کا تذکرہ نہیں پڑھا ہے۔ اس تذکرے میں ایک سو چوہتر شاعرات کا ذکر موجود ہے اس تذکرے کی اشاعت کے بعد 1876 میں لندن یونیورسٹی میں عورتوں کو امتحان میں شرکت کرنے کی اجازت ملی تھی۔ غالباً اس تذکرے کے بعد 1944 میں مولوی نصیر الدین ہاشمی کا ایک اور تذکرہ 'حیدر آباد کی نسوانی دنیا' منصۂ شہود پر آیا۔

ناچیز کو کچھ یاد آرہا ہے کہ 1902 میں مولوی محمد عباس لاہوری کی کتاب 'مشاہیر نسواں' بھی شائع ہوئی ہے جو غالب لائبریری دہلی کا مخزونہ ہے۔ 1944 میں مولوی نصیر الدین ہاشمی کا دوسرا تذکرہ 'خواتین دکن کی اردو

خدمات' منظرعام پر آیا جو آج بھی ادارۂ ادبیات دکن، حیدرآباد کے کتب خانے میں موجود ہے۔ 1956 میں مولوی فصیح الدین بلخی کا تذکرہ 'تذکرۂ نسوانِ ہند' منظرعام پر آیا جس میں ہندوستان کی پانچ سو خواتینِ ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ محترمہ دردانہ قاسمی کا مضمون انٹرنیٹ کا مرہونِ منت ہے جو حالیہ ادب کی معلومات سے لیس ہے۔

'صادقہ نواب سحر کا مضمون 'ناول نگاری میں خواتین کا حصہ' بھرپور تشنگی لیے ذہن وفکر کے مدار پر چکر لگاتا ہے۔ موصوفہ نے بنگلور (کرناٹک) کی ناول نگار فریدہ رحمت اللہ کا نام ناول نویسی میں خاص طور پر لیا ہے۔ جبکہ فریدہ سے بہت پہلے ایک اور ناول نگار خاتون محترمہ حسنی سرور مرحومہ بھی موجود تھیں جو کرناٹک کی تاریخ ادب اردو میں بہت نمایاں اور اہم مقام رکھتی تھیں۔ صادقہ نے بھی اپنے موضوع کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کیا ہے۔ ایک اور تمل ناڈو کی تاریخ ساز ناول نگار محترمہ حجاب امتیاز علی تاج کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ صادقہ نے شاید نقوش لاہور کے شخصیات نمبر کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ حضرت شوکت تھانوی نے حجاب کی تفصیلی انٹرویو لیا تھا جو 'نقوش' نمبر میں شائع ہوا تھا۔ محترمہ ساجدہ شیروانی نے مضمون 'اردو ادب کی چند کم معروف شاعرات' میں 'کم معروف شاعرات' کہہ کر بہت آسانی سے دامن بچالیا ہے۔ بحیثیت مجموعی مندرجۂ بالا تینوں خواتین کے تحقیقی مضامین قدیم ادب کا وسیع مطالعہ رکھنے والے ذہنوں پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتے۔

محمد اختر صدیقی
پروفیسر، فیکلٹی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'اردو دنیا' جولائی 2015 کا شمارہ زیرمطالعہ ہے۔ اردو کونسل کے نئے ریجنل سینٹرس کے قیام کا تصور نہایت اہم ہے۔ میں وزارتِ ترقی انسانی وسائل کے تحت نیشنل کاؤنسل فار ٹیچر ایجوکیشن کے سابق چیئرمین کی حیثیت سے، جس کے اپنے ریجنل دفاتر بڑی اہمیت کے حامل ہیں، یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو کونسل کے مجوزہ ریجنل مراکز ہندوستان کے طول وعرض میں اردو کے سفر کو آگے بڑھانے میں بے حد مددگار ہوں گے۔ فروغ اردو کی سمت اردو کونسل کی خدمات میں یہ ایک Multiplier کا کام انجام دیں گے۔ اور اردو کو نہ صرف بہت سی کھوئی ہوئی زمین واپس حاصل کروانے میں معاون ہوں گے بلکہ نئے علاقوں میں اردو کو متعارف کرانے اور وہاں اس زبان کی شجرکاری و آبیاری میں کلیدی رول ادا کریں گے۔

آج علم کی ترسیل اور پھیلاؤ میں نئی ٹیکنالوجی اہم رول ادا کررہی ہے کونسل کے کمپیوٹر مراکز کی اس سمت میں مستقل کی جانے والی خدمت کی آپ نے صحیح ستائش کی ہے۔ اس خدمت کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے اردو تعلیم کے Massive open ontime courses (MOOCs) شروع کرنے کی جانب بھی اگر کچھ اقدام کیا جائے تو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر اردو سیکھنے والوں کے لیے ایک اہم سہولت مہیا ہوجائے گی جو یقیناً اردو زبان کی ترویج وترقی میں نمایاں اضافہ کرے گی۔

فاضی محمد ایوب
محلّہ سوداگران، جودھپور، راجستھان

ماہ جولائی 2015 شمارے میں دیگر مضامین کے ساتھ جناب ناشر نقوی کا مضمون 'تصوف اور ہندوستان' کافی اہمیت کا حامل ہے۔ مضمون کے آخری پیراگراف میں صوفیوں، اولیا کے نام سے چل رہے اعلیٰ درجے کے تعلیمی ادارے یونیورسٹیز کی جانکاری بھی ملی۔ محترمہ زرنگار صاحبہ کا مضمون اردو شاعری اور فلسفہ تصوف اپنے موضوع سے انصاف کرتا ہے۔ اردو دنیا کی رسائی غیرممالک تک ہورہی ہے۔ خدا کرے کہ رسالہ ایسے ہی کامیابی کی منازل طے کرتا رہے۔

عبداللہ عثمانی
4/16 گریواڑہ دیوبند

اردو دنیا کا تازہ شمارہ جولائی 2015 نظرنواز ہوا جس کے اکثر مشمولات اردو ادب اور خواتین پر محیط ہیں۔ اردو کے قارئین کے لیے اردو دنیا امید کی کرن ہے۔ 'ہماری بات' نہایت پرمغز ہونے کے علاوہ اردو کے لیے نئی راہوں اور امکانات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ افتخار امام صدیقی سے اشتیاق سعید کا مکالمہ خوبصورت پیش کش ہے۔ اردو ادب کے حوالے سے خواتین کی حصے داری، دردانہ قاسمی کا مضمون مختصر ہے لیکن موضوع اتنا وسیع ہے کہ کئی کتابیں بھی اس کی تکمیل نہیں کرسکتیں۔ محترم ڈاکٹر محمد نعمان خان کا مضمون معلوماتی ہے مگر اس میں نواب صدیق حسن خاں قنوجی کی بیگم نواب شاہجہاں کا سنہ وفات درج نہیں ہوسکا۔ علاوہ ازیں ناول نگاری میں خواتین کا حصہ اردو کی چند اہم معروف شاعرات عمدہ مضامین ہیں آخرالذکر ساجدہ شیروانی کا مقالہ ان کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ 'اردو ادب میں تانیثیت' اور 'انٹرنیٹ: اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی کا جدید ذریعہ' بڑی محنت سے لکھے گئے مضامین ہیں۔ 'اردو میں افسانچہ نگاری' پسند آیا آج ادب کی یہ صنف کافی مقبول ہے۔ علاوہ ازیں شخصیات کے حوالے سے 'گیبریل گارسیا مارکیز' خوب ہے۔ محترم ناشر نقوی کا مضمون 'تصوف اور ہندوستان' قابل داد ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان میں صوفیائے کرام نے نہ صرف اردو زبان کو پروان چڑھایا بلکہ یہاں کی قومی یک جہتی کو مضبوط کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ محترمہ زرنگار کا مقالہ 'اردو شاعری اور فلسفۂ تصوف' ان کی ادبی صلاحیت کا مظہر ہے۔

محمد فرحان فادری
34 فیرس لین کلکتہ

میں آپ کے موقر ماہنامے کا مستقل قاری ہوں۔ جولائی 2015 کے شمارے میں خواتین اور ادب کے حوالے سے بہت سے مضامین پڑھنے کو ملے۔ مجھے سب سے زیادہ ناشر نقوی کا مضمون 'تصوف اور ہندوستان' پسند آیا۔ یہ مضمون بہت معلوماتی اور وقیع ہے۔ صفحہ 53 پر مصنف سے ایک غلطی سرزد ہوگئی کہ خانوادہ، صوفیہ میں قادریہ سلسلہ کا نام درج نہیں کیا۔ قادریہ سلسلے سے بھی بہت سے سلسلے منسلک ہیں۔ نقشبندیہ اور سہروردیہ سلسلہ بھی اس سے وابستہ ہیں۔

نوشاد علی ریاض احمد
کرلا، بمبئی

جولائی 2015 کے اردو دنیا میں خواتین اور اردو سے متعلق متعدد قیمتی مواد پڑھنے کو ملے۔ افتخار امام صدیقی کا مکالمہ بیحد عمدگی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ بانو سرتاج کے مضمون میں بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر دیس راج سپرا
ہریانہ اسٹیٹ اردو تعلیمی بورڈ، شاہ آباد مرکنڈا، ضلع کروکشیتر، ہریانہ

ماہ جولائی کا 'اردو دنیا' موصول ہوا۔ اس کا عنوان 'اردو ادب اور خواتین' قابلِ ستائش ہے۔ جو مضامین شائع کیے گئے ہیں وہ حقیقت میں اردو ادب کا خزانہ ہیں۔ پروفیسر ناشر نقوی کا موضوع 'تصوف اور ہندوستان'، 'جدید اردو شاعری اور شاد عارفی' وغیرہ موضوعات نے اردو دنیا میں چار چاند لگادیے ہیں۔

عمران عاکف خان

85، ڈیگ گیٹ، گلپاڑہ، بھرت پور، راجستھان

جولائی کا شمارہ وقت پر موصول ہوا، طبیعت دیکھ کر خوش ہوگئی۔ اس وقت تو خوشی کی انتہا نہیں رہی جب اندرونی صفحات میں اردو ادب اور خواتین کے عنوان سے معلوماتی اور مفید مضامین کا سلسلہ پڑھنے کو ملا۔ کتابوں کے تبصروں کے بعد مختصر تبصروں کے اضافے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ اس کے علاوہ مدیر شاعر افتخار امام صدیقی کا انٹرویو تو بہت ہی خوب رہا۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی مشاہیر اردو کے انٹرویوز کا سلسلہ جاری رہے گا۔

شہناز کنول غازی

علی گڑھ (یوپی)

صادقہ نواب سحر کا مضمون 'اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ' ماہنامہ 'اردو دنیا' جولائی 2015 میں پڑھا۔ یہ مضمون آج کی اس ضرورت پر ہے کہ اردو کی ان خواتین قلم کاروں کو روشنی میں لانا ہے جنھیں اردو کی دنیا میں وہ مقام نہیں ملا جس کی یہ مستحق تھیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے تحت جو خواتین منظر عام پر آئیں ان کی تحریروں پر تنقید، تبصرہ و گفتگو ہوتی تھی اور آج بھی ان ہی کو قلم کار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس تحریک سے

وابستہ جو خواتین نہیں تھیں ان کو ادبی حلقوں میں پذیرائی نہیں ملی۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ خواتین ہر گھر میں پڑھی جاتی تھیں اور نئی نسل کی ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ ان کے نام اور ناولوں کے موضوعات پر صادقہ نواب سحر نے بہت ہی اثر انگیز تبصرہ کیا ہے۔

قمر شمسی

حیدرآباد، اے پی

'اردو دنیا' شاہراہ ادب پر گامزن اور ترقی سے ہمکنار ہے۔ اس کے مندرجات قارئین بے حد دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ انٹرویوز زیادہ پسند کیا جارہا ہے۔ آپ انٹرویو کی اشاعت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھیں۔

روی سنگھ رانا

ایڈوکیٹ، نزد کچ چوک، ضلع منڈی، ہماچل پردیش

'اردو دنیا' جون کے شمارے میں نذیر فتح پوری کا مقالہ 'کالی داس گپتا رضا کی کتاب دوستی' اچھا لگا۔ ویسے تو ہر ادیب کتابوں کا شوقین ہوتا ہی ہے یا اسے ہونا چاہیے اور بقول مضمون نگار 'کالی داس گپتا رضا کی ساری زندگی کتابوں کے مطالعے، کتابوں کی تصنیف، کتابوں کی تالیف و تدوین اور اشاعت میں گزری۔'' نذیر صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ جنون کی حد تک کتابوں سے پیار کرتے تھے۔ میں اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ انھوں نے تین تین جگہوں پر اپنے ذاتی کتب خانے بنا رکھے تھے۔ یقیناً انھیں ماہر غالبیات یوں ہی نہیں مانا جاتا ہے۔ وہ اردو ادب اور خاص طور پر غالب کی شاعری کے بڑے سنجیدہ قاری رہے ہیں۔

نذیر صاحب کی ایک بات سے میں اتفاق نہیں رکھتا جب وہ رضا صاحب کو ادبی 'ساہوکار' کہتے ہیں۔ ایسی تشبیہ سے نذیر صاحب نے رضا صاحب کے رتبے کو زک پہنچائی ہے۔

ڈاکٹر معصوم شرقی

63/2، آر ایل بی لین (ویسٹ بنگال)

'اردو دنیا' کے جون کے شمارے میں مقصود الٰہی شیخ کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ کلکتے میں اس کا اچھا اثر رہا، کیونکہ موصوف کا کلکتے سے گہرا تعلق ہے۔ ان سے راقم الحروف سے خوشگوار مراسم ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد، تلنگانہ

جون 2015 کے شمارے میں مدیر صاحب نے ہماری بات کے تحت قدیم اور کلاسیک زبانوں کے سائنسی کردار کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے دنیا پر سائنس کی برتری و غلبہ پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ کی بات شمارے کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے اور مشمولات پر تجزیاتی تبصراتی اور تنقیدی نظر پڑتی ہے۔ عبدالحی صاحب نے مقصود الٰہی شیخ سے جو انٹرویو لیا ہے وہ کافی معلوماتی ہے۔ اردو کی سائنسی استعداد، اردو کے سائنسی ادب، ادب اور سائنس، حالی کا سائنسی شعور، سائنسی ادب کی اشاعت میں اردو کا بے نظیر کردار، سائنس، ٹکنالوجی اور ادب کی تثلیث، ہل: زرعی سائنس کا ایک اہم رسالہ، سائنس اور یوگ منزل ایک راستے دو، جیسے مضامین پڑھ کر اردو اور سائنس کے رشتوں سے مکمل آگاہی ہوئی۔

اردو دنیا کا شمارہ ماہ جولائی بھی موصول ہوا۔ سرورق سے اندازہ ہوگیا ہے کہ اس میں اردو ادب اور خواتین سے متعلق مشمولات و مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ اردو میں شاعرات کم افسانہ نگار و ناول نگار زیادہ ہیں اور ان خواتین ناول و افسانہ نگاروں کو اولیت و اہمیت دی گئی ہے جو نسائیت تحریک کی روح رواں ہیں۔

سید لطیف حسین ادیب

73، پھول والان، بریلی (یوپی)

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون 2015 باصرہ نواز ہوا۔ جملہ مشمولات اہم اور مفید مطلب ہیں۔ حسن ترتیب بھی قابل داد ہے۔ ڈاکٹر کالی داس گپتا رضا کے سرمایہ کتب کی گمشدگی کی خبر (ص 46) پڑھ کر افسوس ہوا۔ میری ناچیز رائے میں سرکاری و غیر سرکاری سطح پر ان کے ذخیرۂ کتب کو تلاش کرنا چاہیے۔ بہتر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر نامور شاعر، محقق اور ناقد اپنی زندگی میں ہی اپنے سرمایہ کتب کی حفاظت کا خیال کرے۔ مثال میں مشہور محقق ڈاکٹر حنیف نقوی (م 22 دسمبر 2014) نے اپنی وفات سے قبل وصیت کردی تھی کہ ان کا سرمایۂ کتب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری منتقل کردیا جائے جس پر عمل ہوا اور ان کی کتب محفوظ ہوگئیں۔ جناب فاروق ارگلی کا اداجعفری پر مبسوط مقالہ بہت پسند آیا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

نزد مولانا آزاد کالج، نیشنل کالونی، پلاٹ نمبر 34، اورنگ آباد

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا جون 2015 کا شمارہ اردو اور سائنسی شعور کافی خصوصیات کا حامل ہے۔ اسی طرح اردو کے فنکاروں پر بہت ہی جامع اور متاثر کن مضامین کی شمولیت ہے۔ ہماری مطبوعات کے تحت 'علاء الدین بہمن شاہ' کے متعلق مضمون شائع ہوا ہے جس کا ماخذ 'دکن کے بہمنی سلاطین' ہے۔ اس مضمون میں 'علاء الدین حسن' بہمن شاہ، پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس مضمون کے صفحہ پر سلطان علاء الدین خلجی کی تصویر شائع کی گئی ہے؟ جب کہ موضوع بحث علاء الدین حسن بہمن شاہ ہیں۔ میری رائے میں علاء الدین حسن بہمن شاہ کی تصویر ہوتی تو بہتر تھا۔ اس سے قارئین کو غلط فہمی ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔

آپ نے ایک اہم غلطی کی جانب توجہ دلائی۔

ادارہ اس غلطی کے لیے معذرت خواہ ہے۔

قلمی خاکہ

سہیل انجم

پروفیسر ارتضیٰ کریم

(ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند)

گورا رنگ، سراپا عزم و امنگ، کبھی شیشہ کبھی سنگ، اردو ادب کے دبنگ۔ بلیک اینڈ وہائٹ بال، پیشانی مظہر بلندی اقبال۔ ہونٹ پتلے، جیسے خوبصورت قتلے۔ گلین شیو صورت، جیسے کوئی مورت۔ چہرہ گول، خوبصورت ڈیل ڈول، زبان پر میٹھے بول، سینے میں دل انمول۔ رزم حق و باطل کے لیے سفاک ہیں، دوستوں کے لیے پرتپاک ہیں، آپ انتہائی بیباک ہیں، دریائے جرات و ہمت کے پیراک ہیں۔ بے حد سمجھدار ہیں، دوسروں کے مقابلے کہیں ہوشیار ہیں، آنکھیں طرحدار ہیں، تو باتیں گل گلشن گلزار ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے سابق صدرِ شعبہ اردو ہیں، آج کل خوب موضوع گفتگو ہیں۔ ایک مقبول پروفیسر ہیں، ساتھ ہی قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے ڈائرکٹر ہیں۔ یعنی گلشنِ اردو ادب اور باغِ تحقیق و تنقید کی بادِ شمیم، جنھیں دنیا کہتی ہے پروفسار ارتضیٰ کریم۔

بہار کے مردم خیز شہر گیا میں پیدا ہوئے، معزز خاندان میں ہویدا ہوئے، جانے کتنے آپ کے حسن پر شیدا ہوئے۔ پہلے سید علی کریم تھے، پھر ارتضیٰ کریم ہوئے، گویا اردو ادیبوں کے Cream ہوئے۔ کلام حیدری اور سید محمد حسنین اِن کے ابتدائی استاد ہوئے، اُن کی کرم فرمائیوں کے سبب یہ حلقہ یاراں میں شاد باد ہوئے۔ اُنھوں نے اِن کی شخصیت سازی کا آغاز کیا، اُنھیں اِن سے ایسی محبت تھی کہ اُنھیں اپنا ہم راز و دمساز کیا، بالآخر اُن کی تربیت میں اِنھوں نے کامیابیوں کا در باز کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی آئے، ڈی یو میں شعبہ اردو کے پروفیسر قمر رئیس کے زیر سرپرستی آئے۔ اُنھوں نے بھی اِن کے کردار کو صیقل کیا، دنیائے اردو ادب میں جوہر کامل کیا۔ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر اساتذہ شعبہ اردو کو بھا گئے، پھر تو پورے شعبے پر چھا گئے۔ پہلے استاد مقرر ہوئے، پھر اُسی شعبے کے صدر ہوئے۔ صدر شعبہ کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے، صرف دہلی ہی میں نہیں بلکہ دور دور ہوئے۔ دنیائے اردو ادب میں کون ہے جو اِن کو جانتا نہیں، اِن کی خدمات کو مانتا نہیں اور اِن کے کارناموں کو پہچانتا نہیں۔

اِنھیں مخطوطات سے دلچسپی ہے، کمیاب و نایاب کتابوں سے گہری علمی وابستگی ہے۔ جنھیں از سرِ نو زیور طباعت سے آراستہ کیا، طلبہ کے ذہنوں سے وابستہ کیا۔ اِن کے دورِ صدارت میں شعبہ اردو کی پچاسویں سالگرہ آ گئی، پھر تو اُسے ایسے منایا کہ پورے شعبے پر جوانی چھا گئی۔ جشن شعبہ کے حوالے سے پوری دنیا میں اردو کا ڈنکا بجایا، اِس خوبصورت زبان کی مقبولیت کا اسٹیج سجایا، اِس کے ساتھ ہی اپنی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوایا۔

اوائل عمر میں افسانہ نویسی کی، مگر جلد ہی حقیقت شناسی کی۔ جھوٹ موٹ کی باتوں سے تائب ہوئے، میدانِ تحقیق و تنقید کی طرف راغب ہوئے، ایسے جوہر دکھائے کہ دوسرے نقادوں پر غالب ہوئے۔ پھر تو چند برسوں میں ہی تصنیفات و تالیفات کی بھرمار کر دی۔ اپنی کتابوں سے ہر اہل اردو کی لائبریری بھر دی۔ اِن کی تصانیف زائد از بیس ہیں، یعنی بڑے ہی زود نویس ہیں۔ اِن کی زیر نگرانی ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے طلبہ کی خاصی تعداد ہے، جو مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شعبہ اردو میں بحیثیت استاد آباد ہے۔

اِن کی علمی کاوشوں اور انتظامی صلاحیتوں کا سب کو اعتراف ہے، اِن کی شخصیت آئینے کی مانند شفاف ہے۔ اب تو یہ حکومتِ ہند کو بھی بھا گئے، وزیر برائے فروغِ انسانی وسائل کے حواس پر چھا گئے، قومی کونسل کے دفتر میں ڈائرکٹر بن کر آ گئے۔ آتے ہی خوش کن اعلانات کی بھرمار کر دی، اہل اردو کی جھولی خوشیوں سے بھر دی۔ ریسرچ اسکالروں کو وظیفوں سے نوازیں گے، ملک بھر میں قومی کونسل کے مراکز کھلوائیں گے۔ اردو صحافت کے دو سو سالہ جشن کا ڈول ڈالیں گے، امید ہے کہ اردو صحافی بھی اِن سے کچھ نہ کچھ پا لیں گے۔ ایسے مواقع پر ہم جیسے چھوٹے موٹے صحافیوں کو بھی یاد رکھیں، ہم لوگوں کا بھی دل خوشیوں سے آباد رکھیں۔ کسی کو بھی شکوہ شکایت کی گنجائش نہ رہے، یہ کہنے کی کسی بھی دل میں خواہش نہ رہے۔ کہ: گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی، اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا منصب پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے، یہاں مخالفین ایک دو نہیں پورا لشکر ہے۔ یہاں دشمن بشکل دوست ملتے ہیں، جو بظاہر پھولوں کی طرح کھلتے ہیں، لیکن درحقیقت دوسروں کی کامیابیوں سے جلتے ہیں۔ خدا ایسے لوگوں سے بچائے، آپ کو کامیاب و کامران بنائے۔ آپ ہر آزمائش میں سرخ رو ہوں، حقیقتاً آپ محسنِ اردو ہوں۔ جو اردو اور اہلِ اردو کے کام نہ آئے ایسے افسر نہ بنیں، دعا ہے آپ اردو کونسل کے ڈائرکٹر ہی رہیں ڈکٹیٹر نہ بنیں۔

Suhail Anjum, 370/6A, Zakir Nagar, New Delhi-110025, Mob.: 9818195929
Email.: sanjumdelhi@gmail.com

انٹرویو

صدف اقبال

تنقید کسی بھی دور میں ایمان دار نہیں رہی
مشتاق احمد نوری سے مکالمہ

مشتاق احمد نوری 70 کی دہائی کے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی قوت اور توانائی سے اردو افسانے کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے 'تلاش'، 'بند آنکھوں کا سفر' اور 'چھت پر ٹھہری دھوپ' شائع ہو چکے ہیں۔ 'لمبے قد کا بونا' اور 'جن کی سواری' ادبی حلقوں میں خاص طور پر موضوعِ بحث رہے۔ ان کے افسانے ابلاغ و ترسیل کے المیے کے شکار نہیں ہیں۔ ان کا بیانیہ ان کی سب سے بڑی قوت ہے۔ رسالہ 'بہار' اور بہار اردو اکادمی کے ترجمان 'زبان و ادب' کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ موجودہ عہد کے اہم افسانہ نگار اور بہار اردو اکادمی کے نومنتخب سکریٹری سے حال ہی میں لیے گئے انٹرویو کے اقتباسات پیش خدمت ہیں:

صدف اقبال: میرا پہلا سوال آپ کی ابتدائی زندگی سے متعلق ہے۔ براہِ کرم اپنی تعلیم و تربیت اور ملازمت کے حوالے سے گفتگو کریں ساتھ ہی ادبی سفر کے آغاز پر بھی روشنی ڈالیں؟

مشتاق احمد نوری: میری پیدائش 7 مئی 1950 بروز اتوار 9 بجے شام پرانے پورنیہ جو کہ اب ارریہ ضلع کا گاؤں ہے۔ گوگی پوٹھیا میں ہوئی۔ ادبی سفر کا آغاز 1966 میں ہوا جب میں آزاد اکادمی ارریہ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میرے اردگرد کوئی ادبی ماحول نہیں تھا۔ خاندان میں دور تک کوئی ادیب نہیں گزرا۔ میرے ابا جناب حفیظ الدین احمد کو جاسوسی، رومانی اور طلسماتی ناول پڑھنے کا جنون تھا۔ کسی طرح میری رسائی ان کے خزانے تک ہوئی جو کہ ایک لکڑی کے صندوق میں بند پڑا تھا۔ پھر نہ جانے کتنی راتیں جاگ کر چراغ کی مدھم روشنی میں، میں نے اس خزانے پر ہاتھ صاف کر دیا۔ ادب کے نام پر جو پہلی خوراک میرے اندر اتری وہ ابن صفی کے جاسوسی، شکیل جمالی کے رومانی اور طلسمی ناول تھے جو الٰہ آباد کے مشہور ادارے نکہت پاکٹ بکس کے تحت شائع ہوتے تھے۔ جنوری 1967 میں بیسویں صدی کا سالنامہ ایک دوست کے یہاں دیکھا اور پوچھا یہ کیا ہے۔ اس نے کہا افسانہ نمبر ہے۔ میں نے رسالہ لیا اور اسی دن سب پڑھ گیا جب اسے واپس کیا تو اس نے پوچھا۔ کیسی لگی کہانیاں؟ میرا جواب تھا ایسی کہانیاں تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ پھر اس نے کہا لکھو۔ میں نے ایک ساتھ دو کہانیاں لکھیں اور اپنے اسکول کے استاد نصر حمید خلش کو دکھائی۔ انھوں نے تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''نوری اللہ نے جو صلاحیت تمہیں بخشی ہے اگر تم نے اس کا استعمال نہیں کیا تو حشر کے روز جواب دہ ہونا پڑے گا۔'' وہ دن اور آج کا دن میں ان کی بات بھول نہیں پایا۔ 1967 میں ہی میری پہلی کہانی 'دوروپ' 'دین دنیا' دہلی میں ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ میں بہار پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے ذریعہ بہار انفارمیشن سروس کے لیے منتخب ہوا اور 17 اگست 1977 کو نوکری جوائن کی۔ مختلف ذمہ داریاں رہیں۔ کبھی چیف منسٹر بہار کا پی آر او (PRO) رہا۔ کبھی کابینہ وزیروں کا پرائیوٹ سیکریٹری رہا۔ اور 1993 سے 1996 تک بہار اردو اکاڈمی کے سکریٹری کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔

ص ا: اس کے بعد آپ کے افسانے کہاں کہاں شائع ہوئے۔ کیا آپ نے کسی سے اصلاح بھی لی؟

مشتاق احمد نوری: اس زمانے میں شفیع مشہدی ارریہ میں پوسٹیڈ تھے۔ ان سے رابطہ ہوا۔ محبت ملی اور ساتھ ہی رہنمائی بھی۔ اس کے بعد میرے افسانے 'صبح نو' پٹنہ، 'زیور' پٹنہ، 'واقعات' نئی دہلی اور دیگر رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ گریجویشن کے دوران لکھنے کی رفتار قدرے سست رہی۔ 1968 سے 1971 تک کم لکھا لیکن 1972 سے رفتار بڑھی اور مختلف جگہ افسانے شائع ہوتے رہے۔ 1977 میں نوکری میں آنے کے بعد خوب لکھا اور شائع ہوتا رہا۔

ص ا: اب تک کن رسالوں میں آپ کی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں؟

مشتاق احمد نوری: شب خون الٰہ آباد، استعارہ دہلی، شاعر ممبئی، ذہن جدید دہلی، آج کل دہلی، شمع دہلی، بیسویں صدی دہلی، روح ادب، اندیشہ، ادب نکھار، ایوان اردو، الفاظ، اثبات نفی، نوخیز کلکتہ، انشا کلکتہ، مژگاں کلکتہ کے علاوہ کچھ اور رسالے جن کا نام ابھی یاد نہیں آ رہا۔ زبان و ادب پٹنہ، مباحثہ پٹنہ، تمثیل نو اور جہان اردو در بھنگہ، ابجد ارریہ کے علاوہ پاسبان، تعمیر ہریانہ، پرواز ادب پنجاب، سہیل گیا، آہنگ گیا، گلبن لکھنؤ، نیا دور لکھنؤ اور ہندوستان کے تمام سبھی معیاری رسائل میں شائع ہو چکا ہوں۔ ساتھ ہی پاکستان کے افکار، صریر، آئندہ، روشنائی، خیال، اجرا (کراچی) ادب لطیف (لاہور) وغیرہ میں میرے افسانے تواتر سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہندی کے مشہور رسالے ہنس اور کادمبنی کے علاوہ بھی دیگر ہندی رسالوں میں شائع ہوا ہوں۔ ساتھ ہی میں نے بچوں کے لیے بھی بہت لکھا ہے۔ کھلونا، پیام تعلیم، مسرت، نور ڈائجسٹ، ٹافی لکھنؤ اور بھی بچوں کے کئی رسالوں میں کہانیاں لکھی ہیں۔ کئی ویب میگزین میں بھی شامل ہوا ہوں۔

ص ا: آپ اردو افسانے کے مستقبل سے پر امید ہیں یا

مایوس کہ ایک سچ یہ بھی ہے کہ آج کا افسانہ نگار اپنے افسانوں کا قاری خود ہے۔

مشتاق احمد نوری: میں اردو افسانے کے مستقبل سے بالکل مایوس نہیں ہوں یہ سچ نہیں کہ افسانے کو قاری نہیں مل رہا۔ ہاں جدیدیت کے دور میں افسانہ قاری سے دور ہو گیا تھا۔ مگر جب سے کہانی میں روشن بیانیہ کی واپسی ہوئی ہے قاری کی تعداد بڑھی ہے۔ اب تو قاری تلاش کر کر کے پڑھتا ہے۔

ص ا: قرۃ العین حیدر، بیدی، کرشن، عصمت اور زاہدہ حنا میں آپ کسے بڑا مانتے ہیں؟

مشتاق احمد نوری: منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت اور زاہدہ حنا میں مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ فنکار ہیں جن کا ڈکشن الگ الگ ہے منٹو کا میدان الگ تھا۔ وہ زندگی کی سچائی بنا کسی لاگ لپیٹ کے لکھتے تھے۔ بیدی کا انداز اور کردار مختلف تھا اور کرشن چندر کا سفر رومانیت سے حقیقت کی طرف تھا۔ ان کی زبان بہت پیاری تھی۔ عصمت ایک نڈر اور بے باک فنکار تھیں۔ قرۃ العین حیدر بھی ایک بڑی فنکار تھیں۔ وہ تھوڑی ناسٹیلجک تھیں۔ وہ بھی اپنے ماضی سے زیادہ تر فکشن نکالتی تھیں۔ ان کے ڈکشن کا مقابلہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ زاہدہ حنا تو ہم لوگوں کے دور کی ہیں۔ ماضی ان کے یہاں بھی ہے۔ ان کی گرفت فکشن پہ گہری ہے۔ انھوں نے ایک ناول 'نہ جنوں رہا نہ پری رہی' بہار کے ماحول پر لکھا ہے۔ ان کے یہاں ہند و پاک کے مسائل دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

ص ا: نئی صدی میں افسانے کا کوئی نیا رخ سامنے آیا ہے؟

مشتاق احمد نوری: نئی صدی یعنی اکیسویں صدی میں وہی فکشن آیا جو بیسویں صدی کے آخر میں تھا لیکن نئے لکھنے والے سامنے آئے ان کی سوچ پرانے سے مختلف رہی۔ ان کا انداز تھوڑا جارحانہ ضرور ہے۔ آج کے دور میں پوری قوم خاص کر مسلمانوں کے جو مسائل ہیں وہ شدت سے آ رہے ہیں۔ پہلے لوگ پردے میں بات کرتے تھے۔ اشاروں میں سچائی پیش کرتے تھے لیکن آج مشرف عالم ذوقی جیسے جرأت مند اور بے باک افسانہ نگار بالکل دوٹوک گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں۔ آپ نہ ان کا قلم پکڑ سکتے ہیں نہ زبان۔ میں ذوقی کو اکیسویں صدی کا سپہ سالار مانتا ہوں۔ اس صدی کے رائٹر کا ڈکشن ہی تبدیل ہو گیا ہے۔ پاکستان کی نئی نسل کی تحریروں میں بھی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ لوگ بھی زمینی سچائی لکھ رہے ہیں۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ خواتین افسانہ نگاروں کی نئی کھیپ کافی متاثر کر رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی خواتین کا بول بالا ہے۔ ذکیہ مشہدی سے صدف اقبال تک ایک لمبی فوج ہے جس پر اردو فکشن بھروسہ کر سکتا ہے۔

ص ا: اپنے ہم عصروں میں آپ کسے پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

مشتاق احمد نوری: دیکھیے ہم عصروں پر گفتگو کرنا کائی بھری پھسلن پر چلنے کے مترادف ہے۔ میرے ہم عصروں میں شوکت حیات، عبدالصمد، حسین الحق، م ق خاں، بیگ احساس، غضنفر، شموئل احمد، سلام بن رزاق، معین الدین جینا بڑے، نورالحسنین، طارق چھتاری، سید محمد اشرف، عبید قمر، اسرار گاندھی، انور خان، علی امام، صدیق عالم، انیس رفیع بعد میں مشرف عالم ذوقی، قاسم خورشید، پیغام آفاقی، خورشید حیات، سید احمد قادری، اسلم جمشید پوری، خالد جاوید، ابرار مجیب، رفیع حیدر انجم، شاہد اختر، معین الدین عثمانی، ابن کنول، احمد صغیر، صغیر رحمانی، اقبال حسن آزاد، اختر واصف، عالم فیروز، شبیر احمد، ساجد حمید، رحمن عباس کے علاوہ بھی کئی لوگ ہیں جنھوں نے اردو فکشن کو وقار بخشا ہے۔ کئی نام اور ہیں جو ابھی ذہن میں نہیں آ رہے ہیں۔ پاکستان کے فکشن نگاروں کا نام الگ سے شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک بات گرہ میں باندھ لیجیے کہ ہر دور میں

بہار کے فکشن نگاروں نے ہی فکشن کی امامت کی ہے۔

ص ا: کیا آپ اس سچائی کا اعتراف کرتے ہیں کہ 1980 کے بعد کا عہد نئے آفاقی نظام کا ہے؟

مشتاق احمد نوری: یہ سچ ہے کہ 1980 کے بعد سے فکشن کی دنیا میں ایک نئے آفاقی نظام کا سورج طلوع ہوا۔ وہ دور جدیدیت کے خاتمے کا تھا۔ وہ تحریک اپنے آپ ختم ہوئی، اس دور نے فکشن کا بہت نقصان کیا۔ اس زمانے میں فکشن میں سب کچھ تھا کہانی کے علاوہ۔ 1980 سے نئے افسانوی دور کا آغاز ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

ص ا: کیا آپ 1980 کے بعد کے ادب کو مابعد جدیدیت سے منسوب کرنا چاہیں گے یا کوئی اور نام دیں گے؟

مشتاق احمد نوری: مابعد جدیدیت، جدیدیت کے مردہ کوکھ سے ہی جنمی ہے۔ لیکن تخلیق کسی تحریک کے زیر اثر ہمیشہ نہیں رہتی۔ ترقی پسندی کا اپنا سلوگن تھا اور اس دور میں تحریک کو سامنے رکھ کر شاعری کی جاتی تھی۔ فکشن اور مضامین لکھے جاتے تھے۔ جدیدیت کی امامت شمس الرحمن فاروقی کے پاس تھی۔ انھوں نے خود کو اسٹیبلش کیا۔ شب خون سے کئی فنکار سامنے آئے لیکن اس تحریک نے ادب خاص طور سے فکشن کا نقصان کیا اور شاعری بھی متاثر ہوئی۔ 80/84 کے بعد ادب کی واپسی ہوئی۔ لیکن کوئی ادب مابعد جدیدیت کے زیر سایہ نہیں لکھا جا رہا۔ یہ تو مرکز سے ہی انکار کرتی ہے۔ کیا کوئی ادب مرکز سے ہٹ کر تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ فنکار اب تحریک کو لے کر نہیں چلتے بلکہ تحریک انکے پیچھے بھاگ رہی ہے۔

ص ا: 1974 کے بعد کی نسل میں وہ تخلیقی فنکار جو تنقید بھی لکھ رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ سلام بن رزاق، منشا یاد، رشید امجد کی نسل کو پروموٹ کرنے کے لیے ناقد کا جو ٹیم ورک سامنے آیا تھا وہ آج کم دکھائی دیتا ہے؟

مشتاق احمد نوری: دیکھیے تنقید کسی بھی دور میں ایمان دار نہیں رہی۔ آپ جس دور کی جانب اشارہ کر رہی ہیں اس زمانے میں پروموٹ کرنے کا رواج تھا۔ اپنا اپنا گروپ تھا۔ جو اپنے لوگوں پر خاص توجہ دیتا تھا۔ کچھ تنقید اچھی بھی آئی۔ لیکن پروموشن نے تنقید کو روشن نہیں ہونے دیا۔ لیکن نئی نسل کے فنکاروں نے اس بھید بھاؤ کو محسوس کر لیا اور وہ خود اپنی تخلیق کے ساتھ تنقید بھی لے کر آئی۔ اب وہ کسی ناقد کے محتاج نہیں ہیں۔ اس طرح ناقد کی ایک اچھی ٹیم سامنے آ گئی ہے۔ وہ آج کے ادیب کو پرکھنا بھی جانتے ہیں اور کھری کھری لکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اب دس میں سے سات فنکار تخلیق کے ساتھ تنقید بھی لکھ رہے ہیں۔

ص ا: کیا آپ افسانے کی تنقید سے مطمئن ہیں؟

مشتاق احمد نوری: میں افسانے کی تنقید سے مطمئن تو نہیں ہوں لیکن یہ امید کرتا ہوں کہ اگلی دہائی فکشن کی تنقید کے نام ہوگی کیونکہ نئے ناقدوں کی جو کھیپ نظر آ رہی ہے ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

ص ا: تنقید کسی بھی دور میں ایمان دار نہیں رہی، شاید اسی لیے آج تخلیقی تنقید کی فضا ہموار ہو رہی ہے کہ میرے خیال میں تخلیقی تنقید، تخلیق کے از سر نو عمل سے گزرتی ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

مشتاق احمد نوری: تم نے اچھا سوال کیا۔ یہ سچ ہے کہ آج تخلیقی تنقید کی ضرورت ہے اور ایسی تنقید ایک تخلیق کار ہی کر سکتا ہے جس کی جانب میں نے اشارے کیے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے تخلیقی تنقید تخلیق کے از سر نو عمل سے گزرتی ہے۔ آج کی نسل یہی تو کر رہی ہے۔ ذوقی ہے خورشید اکبر ہے ابرار مجیب

ہے قاسم خورشید ہے، خورشید حیات ہے، ارشد عبدالحمید ہے اور بھی بہت سارے ہیں یہ سب تخلیقی تنقیدی ہی تو لکھ رہے ہیں۔

ص ا: اردو کے عالمی گاؤں کے کن افسانہ نگاروں نے آپ کو متاثر کیا؟

مشتاق احمد نوری: عالمی گاؤں اردو کا بڑا گاؤں ہے اس لیے انتخاب مشکل ہے۔ لیکن یہ کہہ دوں کہ ہم عالمی سطح پر اپنی پہچان بنانے لگے ہیں۔

ص ا: کیا یہ صدی خواتین قلمکاروں کی صدی ہے۔ خواتین کے کئی نئے نام سامنے آرہے ہیں۔ کیا خواتین اردو ادب کو ایک نیا چہرہ دینے میں کامیاب ہوں گی؟

مشتاق احمد نوری: ہاں تمھاری یہ بات بھی تسلیم کرنے لائق ہے کہ خواتین قلم کاروں کی یلغار ہے ہمارے زمانے میں قلم پکڑنے سے قبل دس بار شوہر کی جانب دیکھنا پڑتا تھا لیکن آج کی عورت اس معاملے میں محتاج نہیں ہے۔ کھلا آسمان اس کے سامنے ہے اس کے اندر کی صلاحیت باہر آنے کو بے تاب ہے۔ یہ صدی تو ان کی ہے۔ ہندو پاک میں یکساں حالت ہے اس معاملے میں پاکستان کی خواتین قدرے ایگریسیو بھی ہیں۔ ہمیں ان کا خوش آئند مستقبل واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ص ا: فکشن میں روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحہ فکریہ جو لکھنے کے وقت پیش رہتا ہے اس طرز عمل کے بیان میں کچھ کہنا چاہیں گے؟

مشتاق احمد نوری: دیکھیے فکشن کو میں شعوری نہیں لا شعوری عمل مانتا ہوں۔ کسی خالق کے سامنے تخلیقی لمحے میں کوئی نظریہ نہیں ہوتا وہ تو بس تخلیق کار ہوتا ہے۔ ہر تخلیق اپنا ڈکشن لے کر آتی ہے بعد میں لوگ اس میں نظریہ یا اور کچھ تلاش کرتے ہیں۔ روایت سے انحراف ضروری نہیں ہے۔ آپ اس کی تقلید بھی کر سکتے ہیں۔ ہر ماحول میں الگ الگ رویہ اپنایا جاتا ہے۔

ص ا: حکومت بہار نے ابھی ابھی آپ کو بہار اردو اکادمی کا سکریٹری بنایا ہے۔ آپ پہلے بھی اس عہدے کی ذمے داریاں نبھا چکے ہیں۔ پہلے اور اب میں کیا فرق ہے؟

مشتاق احمد نوری: میں حکومت بہار کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ پر بھروسہ کیا اور بہار اردو اکادمی کا سکریٹری منتخب کیا۔ میں 1993 سے 1996 تک اکادمی کا سیکریٹری تھا۔ تب اور آج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس زمانے میں سالانہ گرانٹ صرف 11 لاکھ تھا جسے میں نے سرکار کے تعاون سے 25 لاکھ تک پہنچایا لیکن اب گرانٹ دو کروڑ سے زائد ہے یہ الگ بات ہے کہ گرانٹ کی پوری رقم اخراجات کی پوری تفصیل نہ بھیجنے کی وجہ سے جاری نہ ہو سکی۔ لیکن میرے آنے کے بعد امید قوی ہے کہ سرکار سے یہ رقم فراہم ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

ص ا: اکادمی کے سکریٹری کے طور پر آپ کی ترجیحات کیا کیا ہیں؟

مشتاق احمد نوری: رہی بات اکادمی کی ترجیحات کی تو میں اپنے طور سے کوشاں ہوں۔ اللہ کا کرم ہے کہ سرکار کے پرنسل سکریٹری محترم جناب عامر سبحانی کی جو داخلہ سکریٹری بھی ہیں عنایتیں نصیب ہیں۔ ان کی قیادت اور مشورے سے اکادمی کافی آگے جا سکتی ہے۔ اکادمی کے مختلف کاموں کے لیے درجن بھر کمیٹیاں تشکیل دینی ہیں کہ میں بہار کے عام اردو داں کو اس میں شامل کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان کے مشورے سے کام کر سکوں۔ اکادمی کے آئندہ پروگراموں کا پروجیکٹ تیاری کے مراحل میں ہے۔ میں بہت جلد اکادمی کی مجلس عاملہ کی میٹنگ کرانے جا رہا ہوں جس میں وزیر اعلیٰ کی شرکت متوقع ہے۔ اس سال کئی سیمینار کرنے ہیں جن میں سہ روزہ فکشن سیمینار، پاپولر لٹریچر پر الگ سے سیمینار کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک مشاعرے کی بھی تجویز قابل غور ہے۔ خواتین ادیبوں پر

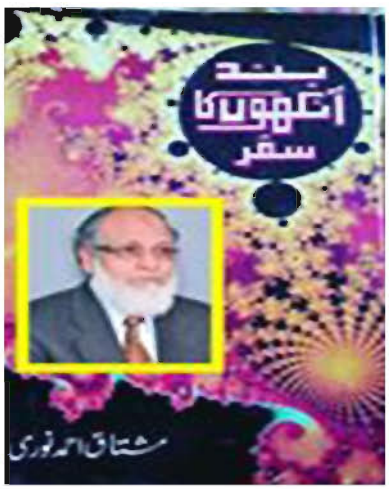

مشتمل ایک پروگرام الگ سے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سارے پروگرام قومی سطح کے ہوں گے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اکادمی کو پورے بہار میں اس کے سبھی اضلاع میں فعال بنانا ہے۔ اب تک سارے پروگرام پٹنہ میں ہوتے رہے ہیں لیکن اب ہر ماہ کسی نہ کسی ضلع میں اکادمی کا پروگرام ہوگا۔ اکادمی کے ترجمان 'زبان و ادب' کو مزید نکھارنے کی تگ و دو ہو رہی ہے۔

ص ا: یہ الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ کیا آپ زبان و ادب کے لیے کوئی ویب سائٹ بنائیں گے؟

مشتاق احمد نوری: جی آپ نے صحیح فرمایا۔ یہ الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے اور بہت جلد بہار اردو اکادمی کی ویب سائٹ منظر عام پر آجائے گی۔ ساری جانکاری کے ساتھ آپ 'زبان و ادب' بھی نیٹ پر دیکھ سکیں گے۔ کام ہو رہا ہے انشاء اللہ جلد ہی اکادمی کے کام کاج میں خوشگوار تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں گی۔

ص ا: رسالہ 'زبان و ادب' کا معیار آپ کی نظر میں؟ اس میں بچوں کا گوشہ بھی ہے جس سے رسالہ کمزور نظر آتا ہے۔

مشتاق احمد نوری: دیکھیے ماہنامہ 'زبان و ادب' کا جیسا معیار ابھی ہے میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس کا معیار بلند کرنے کے لیے ابھی تھوڑا وقت درکار ہے۔ میں نے اچھے ادیبوں سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا ہے۔ معیار ایڈیٹر نہیں بدلتا معیار کا ضامن تخلیق ہوتی ہے۔ اچھی تخلیق ملے گی معیار آپ سے آپ بلند ہو جائے گا۔ رہی بات بچوں کے گوشے کی۔ اس سے رسالہ کمزور کیسے ہوگا؟ اکادمی بچوں کے رسالہ کو الگ سے شائع کرنے کے لیے غور کر رہی ہے جیسے ہی بچوں کا رسالہ شروع ہوگا یہ گوشہ زبان و ادب سے ہٹا دیا جائے گا۔

ص ا: روحانیت اور ادب کا کیا رشتہ ہے؟

مشتاق احمد نوری: دیکھیے روحانیت اور ادب رشتہ با معنی ہے۔ روحانیت کا تعلق طریقت سے ہے۔ جو شریعت کے بعد کی منزل ہے۔ ادب کا تعلق جاری زندگی اور سماج سے ہے۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتی ہیں کہ سماج میں بھی روحانیت والے لوگ ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ روحانیت کو ادب کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ روحانیت کی بنیاد پر بہت سارے قلم کاروں نے افسانے لکھے ہیں۔

ص ا: تصوف کا تعلق واردات قلب سے ہے، کیا اس سلسلے میں آپ اپنے تجربات بیان کرنا چاہیں گے؟

مشتاق احمد نوری: تصوف کا تعلق واردات قلب سے ہے اس سلسلہ میں میں اپنے تجربات عوامی سطح پر شیئر نہیں کر سکتا۔

ص ا: اردو کی نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

مشتاق احمد نوری: نئی نسل کو میرا پیغام یہ ہے کہ وہ کسی سے بھی متاثر ہوئے بغیر اپنے دل کی آواز سنیں اور وہ جو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اپنی زندگی میں اسے لکھیں۔ کسی بھی فریم ورک میں رہ کر نمائندہ ادب نہیں لکھا جا سکتا۔ لکھنے سے قبل خوب پڑھیں۔ صرف فکشن ہی نہیں سارا ادب پڑھیں۔ اگر ممکن ہو تو ہندوستان کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ غیر ملکی ادب بھی پڑھیں۔ اس سے ذہن میں وسعت آئے گی۔ تحریر میں مصنوعی پن پیدا نہ کریں۔ ہر کہانی اپنا اسلوب اپنا ڈکشن لے کر آتی ہے۔ خود پر بھروسہ کریں۔ ایک بار لکھ کر خود ناقد بن کر اس کا جائزہ لیں جب یقین ہو جائے کہ اب سب ٹھیک ہے تو اسے پورے اعتماد کے ساتھ پیش کریں۔

(اس انٹرویو کے کچھ حصے عالمی اردو افسانہ فورم پر پیش ہوئے ہیں۔)

■

Sadaf Iqbal, Vill. Sondiha, Post: Bhadeya, Barachatti Distt Gaya -824220 (Bihar)
Mushtaq Ahmad Noori, A/103 Second Floor, Ali Nagar, Near Gulshan Plaza, P.O.: Anisabad, Patna - 800002 (Bihar)

جمیل اختر

زندگی نامہ

راجندر سنگھ بیدی

آغاز و انجام

اصل نام: راجندر سنگھ بیدی
قلمی نام: محسن لاہوری (شروع میں اس نام سے لکھنے کی ابتدا کی)
مستقل قلمی نام: راجندر سنگھ بیدی
آبائی وطن: گاؤں دَتے کی تحصیل ڈسکا، ضلع سیالکوٹ
پیدائش: یکم ستمبر 1915 (صبح 3 بج کر 47 منٹ پر)
مقام پیدائش: لاہور، ابتدائی زندگی لاہور میں گذاری۔
ہجرت: 1947۔
لاہور کے بعد قیام: جون 1947 میں لاہور میں فسادات شروع ہوئے تو اپنے بھائی ہرنس سنگھ بیدی کے پاس شملہ آ گئے۔ تقسیم کے وقت وہ شملہ میں تھے۔ بہت سے مسلمانوں کی جان بچائی۔ شملہ کے بعد خاندان کے لوگوں کے ساتھ فاضلکا میں سکونت اختیار کی۔
بمبئی آمد: 1949، مستقل سکونت: بمبئی
شادی: 19 سال کی عمر میں، 1934 میں ہوئی۔
وفات: 11 نومبر 1984

والدین

والد: ہیرا سنگھ بیدی (کھتری) ڈاک خانہ میں ملازم تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں لاہور منتقل ہوئے۔ بیدی کی پیدائش کے وقت وہ لاہور چھاؤنی کے علاقہ صدر بازار میں پوسٹ ماسٹر تھے اور سنت نگر کے ایک محلّہ شیام گلی میں سکونت پذیر تھے۔ وہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ انھوں نے 'زندگی کا سفر' کے عنوان سے اپنی سوانح حیات بھی لکھی۔
والدہ: سیوادئی (برہمن)

اجداد

دادا: گنپت سنگھ (بیدی)
نانا: رُلا رام (مجیٹھا، ضلع امرتسر کے رہنے والے تھے)

شریک حیات

نام: سوماوتی (مانکہ کا نام)، ستونت کور (سسرال کا نام)
وفات: 1977

اولادیں

لڑکا: نریندر بیدی: (فلم ڈائرکٹر تھا۔ جوانی دیوانی (1972)، بے نام (1974)، رفو چکر (1975)، صنم تیری قسم (82)، فلم بنائی۔
راج کمار بیدی:

تعلیم

ابتدائی: پانچویں جماعت تک، لاہور چھاؤنی کے صدر بازار اسکول میں حاصل کی۔
میٹرک: ایس بی بی ایس خالصہ اسکول لاہور (فرسٹ ڈویژن) 1931
انٹرمیڈیٹ: ڈی اے وی کالج، لاہور 1933
بی اے: داخلہ لیا مگر تعلیم مکمل نہیں کی جس کا قلق عمر بھر رہا۔
منشی فاضل: دارالعلوم السنہ شرقیہ میں داخلہ لیا ایک سال تعلیم بھی حاصل کی۔ لیکن فرقہ وارانہ فساد کی وجہ سے اس سلسلے کو بھی ترک کرنا پڑا۔

مشاغل

کلرک: پوسٹ آفس لاہور (1933)
1943 میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔
چھ ماہ تک دہلی میں حکومت کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ سے وابستہ رہے۔
آرٹسٹ: بحیثیت آرٹسٹ آل انڈیا ریڈیو لاہور سے وابستہ ہوئے۔ (1943)
اشاعتی ادارہ: سنگم پبلشرز لمیٹڈ کے نام سے اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ ساتھ ساتھ فلموں کے لیے لکھنے کا کام بھی شروع کیا۔ (1946)
ڈائرکٹر: جموں ریڈیو اسٹیشن۔ ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ کشمیر گئے تھے۔ شیخ عبداللہ نے اس عہدے کی پیش کش کی جو قبول کر لی۔ اگلے برس ان کی کوششوں سے سری نگر ریڈیو اسٹیشن کی بنیاد رکھی گئی۔ نائب وزیر اعلیٰ غلام محمد بخش سے اختلاف ہوا تو ملازمت چھوڑ دی اور دہلی آ گئے۔ (1949)
فلم سے وابستگی: 1943 میں مہیشوری فلم بمبئی اسٹوڈیو جوائن کیا تقریباً ایک ڈیڑھ سال بعد چھوڑ دیا۔ اس کے بعد مستقل ملازمت کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہوئی اور عارضی ملازمت تھوڑے تھوڑے وقفے کرتے رہے۔ دہلی سے ڈی ڈی کیشپ نے انھیں بمبئی بلا لیا اور ایک ہزار تنخواہ پر ملازم رکھ لیا اور بیدی نے فلمیں لکھنی شروع کر دی۔

عشق

فلم 'آنکھیں دیکھی' کی ہیروئن سمن سے بڑھاپے میں عشق کیا اور ازدواجی زندگی تلخ کر لی۔ ایک انگریز عورت سے بھی محبت کی۔ اس سے ایک بیٹی ہوئی جو لندن میں مقیم ہے۔

ادبی اعزازات

- ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (ایک چادر میلی سی پر) 1965
- پدم شری 1972
- غالب ایوارڈ (اردو ڈراما) 1978
- سجاد ظہیر، اردو ادب ایوارڈ

بیسٹ ڈائیلاگ فلمی اعزازات

- فلم فیئر ایوارڈ (فلم مدھومتی کے لیے) 1958
- فلم فیئر ایوارڈ (ستیہ کرم) 1970

بیسٹ اسٹوری

- فلم فیئر ایوارڈ (گرم کوٹ) 1955

ابتدائی دلچسپی (ادب کے علاوہ)

- تحریری اور تقریری مقابلوں میں حصہ لینا
- سنگیت اور تیراکی سے لگاؤ۔ سنگیت سیکھنے کی غرض سے گاندھرو مہاودیالیہ راوی روڈ، لاہور میں داخلہ بھی لیا اور دو ایک تمغے بھی حاصل کیے۔ کڑی ریاضت کو دیکھ کر اس شوق کو بھی ادھورا چھوڑ دیا۔
- ہاکی کا شوق۔ بچپن میں ہاکی خوب کھیلتے تھے۔
- مصوری کا شوق تھا۔ شروع میں لینڈ اسکیپ بنائی۔ پھر اُسے چھوڑ کر عورت کے پیکر پر اپنی توجہ مرکوز کی۔
- شاعری کا شوق تھا۔ انگریزی کے ہیرو نیک میٹر میں نظمیں لکھیں جو چھپیں۔ پھر اس کے بعد اردو میں شعر کہنے کی کوشش کی۔

نقش اوّل

- محسن لاہوری کے نام سے نظمیں، غزلیں اور افسانے لکھے جو لاہور کے روزناموں میں شائع ہوئے۔
- بندے ماترم پہلا افسانہ ہے جو محسن لاہوری کے نام سے لکھا۔ لیکن وہ شائع نہیں ہو سکا۔ 1930
- پہلا افسانہ: مہارانی کا تحفہ (ادبی دنیا لاہور 1937
- پہلی انگریزی نظم: باغ ارتھ (کالج میگزین میں شائع ہوئی جب فرسٹ ایئر کے طالب علم تھے) 1933
- پہلی پنجابی کہانی: دکھ سکھ، پنجابی رسالہ سارنگ میں شائع ہوئی جو اردو رسم الخط میں نکلتا تھا۔
- پہلا افسانوی مجموعہ: دانہ و دام 1940
- پہلا اسکرین پلے: فلم بڑی بہنیں 1949
- پہلی کہانی جس پر فلم بنی: گرم کوٹ 1955

ان شہروں سے وابستگی رہی

- لاہور (ابتدا تا 1947) • دہلی (مختلف اوقات)
- کشمیر (49-48) • شملہ 1947
- بمبئی 84-1949 آخری وقت تک

ادیب جن سے اثرات قبول کیے

- چیخوف • گورکی • ورجینیا وولف
- ژاں پال سارتر • ٹیگور • شرت چندر

افسانے جو اثرات کے تحت لکھے

- دس منٹ بارش میں : چیخوف کی کہانی سلیپ سے متاثر ہو کر لکھی۔
- دیوالہ : موپساں
- پان شاپ : ورجینیا وولف
- مہارانی کا تحفہ : ٹیگور

بیدی کی جہتیں

- افسانہ نگار • ناول نگار
- ڈراما نگار • فلم ڈائرکٹر
- اسکرپٹ رائٹر • ڈائیلاگ رائٹر
- اسکرین پلے رائٹر • شاعر (انگریزی، پنجابی، اردو)
- صحافی

راجندر سنگھ بیدی کی فلمیں (تقویمی ترتیب)

- بڑی بہنیں: 1949 • دل ربا: 1950
- داغ: 1952 • مرزا غالب: 1954
- گرم کوٹ: 1955 • دیوداس: 1955
- ملاپ: 1955 • بسنت بہار: 1956
- مسافر: 1957 • اب دلی دور نہیں: 1957
- مدھومتی: 1958 • بمبئی کا بابو: 1960
- انورادھا: 1960 • آس کا پنچھی: 1961
- میم دیدی: 1961 • رنگولی: 1962
- میرے بھی صنم: 1965 • انوپما: 1966
- دوج کا چاند: 1964 • بہاروں کے سپنے: 1967
- میرے ہمدم میرے دوست: 1968
- عزت: 1968 • ستیہ کام: 1969
- پیاسی شام: 1969 • دستک: 1970
- جلوا: 1971 • گرہن: 1972
- انھیمان: 1973 • پھاگن: 1973
- پھر کب ملوگی: 1974 • امانت: 1977
- نواب صاحب: 1978 • آنکھیں دیکھی: 1978
- مرد: 1985 • ایک چادر میلی: 1986

فلم سازی کے مختلف رنگ

بیدی نے ستر سے زائد فلموں میں مختلف حیثیتوں سے کام کیا ہے جس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

○ ڈائیلاگ لکھے:

- امانت • انھیمان • جلوہ
- داغ • ستیہ کام • انوپما
- میرے صنم • دوج کا چاند • آس کا پنچھی
- میم دیدی • انورادھا • بمبئی کا بابو
- مدھومتی • بڑی بہنیں • بہاروں کے سپنے
- مسافر • بسنت بہار • ملاپ
- گرم کوٹ • مرزا غالب

○ اسکرین پلے

- میرے ہم دم میرے دوست
- میرے صنم • بسنت بہار • دستک
- رنگولی • آس کا پنچھی • گرم کوٹ

○ بحیثیت ڈائرکٹر:

- آنکھیں دیکھی • نواب صاحب
- دستک • پھاگن

○ بحیثیت پروڈیوسر

- پھاگن • دستک
- رنگولی • گرم کوٹ

○ بحیثیت نغمہ نگار

- مرد: 1985

○ کہانی کار

- ایک چادر میلی سی • پھاگن
- دستک • پیاسی شام
- گرہن • گرم کوٹ

افسانوی مجموعے

1. دانہ و دام، مکتبہ اردو لاہور، اشاعت اوّل دسمبر 1939
2. گرہن، نیا ادارہ لاہور، اشاعت اوّل 1942
3. کوکھ جلی، کتب پبلشرز بمبئی، اشاعت اول 1949
4. اپنے دکھ مجھے دے دو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اشاعت اوّل 1965
5. ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اشاعت اوّل 1947
6. مکتی بودھ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اشاعت اوّل 1982

ڈراموں کے مجموعے

1. بے جان چیزیں، اشاعت اوّل 1943
2. سات کھیل، سنگم پبلشرز، بمبئی اشاعت اوّل 1946

ناولٹ

ایک چادر میلی سی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ 1962

(اس سے قبل یہ ناولٹ 'نقوش' افسانہ نمبر نومبر 1960 میں شائع ہو چکا تھا)

افسانوی مجموعوں میں شامل افسانے

دانہ و دام

1. بھولا
2. ہمدوش
3. من کی من میں
4. گرم کوٹ
5. چوکری کی لوٹ
6. پان شاپ
7. منگل اشٹکا
8. کوارنٹین
9. تلادان
10. دس منٹ بارش میں
11. حیاتین ب
12. پچھمن
13. ردعمل
14. موت کا راز

گرہن

1. گرہن
2. رحمٰن کے جوتے
3. بکی
4. اغوا
5. غلامی
6. ہڈیاں اور پھول
7. زین العابدین
8. لاروے
9. گھر میں بازار میں
10. دوسرا کنارہ
11. آلو
12. معاون اور میں
13. چیچک کے داغ
14. ایوالانش

مکتی بودھ

1. افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل
2. مکتی بودھ
3. ایک باپ بکاؤ ہے
4. چشمہ بددور
5. بولو
6. بلی کا بچہ
7. گیتا

مزاحیہ: خواجہ احمد عباس، چلتے پھرتے چہرے، بیوی یا بیماری مہمان، فلم بنانا کھیل نہیں

کوکھ جلی

1. لمس
2. کوکھ جلی
3. بے کار خدا
4. نامراد

5. مہاجرین 6. کشمکش
7. جب میں چھوٹا تھا (ایک مطالعہ)
8. ایک عورت 9. ٹرمینس
10. گالی 11. خط مستقیم اور توسین
12. ماسوا 13. آگ

اپنے دکھ مجھے دے دو

1. لاجونتی 2. جوگیا
3. بیل 4. لمبی لڑکی
5. اپنے دکھ مجھے دے دو 6. ٹرمینس سے پرے
7. حجام الہ آباد کے 8. دیوالہ
9. یوکلپٹس

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

1. ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (ایک اعتراف)
2. صرف ایک سگریٹ 3. کلیانی
4. متھن 5. باری کا بخار
6. سونفیا 7. وہ بڈھا
8. جنازہ کہاں ہے 9. تعطل
10. آئینے کے سامنے

مہمان ہند پاکٹ بکس، دہلی

1. مہمان 2. بیوی یا بیماری
3. چلتے پھرتے چہرے 4. خواجہ احمد عباس
5. ہاتھ ہمارے قلم ہوئے 6. حجام الہ آباد کے

بے جان چیزیں (ڈرامے)

1. کار کی شادی 2. ایک عورت کی نہ
3. روح انسانی 4. اب تو گھبرا کے
5. بے جان چیزیں 6. خواجہ سرا

سات کھیل

1. خواجہ سرا 2. چانکیہ
3. تلچھٹ 4. نقل مکانی (ہمایوں جنوری 1945)
5. آج 6. رخشندہ
7. پاؤں کی موچ (ایک عورت کی نہ)

اوّلین مجموعے میں شامل 'ایک عورت کی نہ' کا عنوان دوسرے مجموعہ میں 'پاؤں کی موچ' کر دیا گیا ہے۔ ڈرامہ ایک ہی ہے عنوان دو ہو گیا ہے۔

- خواجہ سرا اور نقل مکانی پر 1970 میں فلم دستک بنی۔

افسانوں کی الفبائی ترتیب

آ-ا

اغوا: گرہن
اکو: گرہن
ایوالانش: گرہن، ساقی جولائی 1940
ایک باپ بکاؤ ہے: مکتی بودھ، نیا دور کراچی، شمارہ 74-73
ایک عورت: کوکھ جلی
آگ: کوکھ جلی
اپنے دکھ مجھے دے دو: اپنے دکھ مجھے دے دو
آئینے کے سامنے: ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ب پ ت ٹ

بولو: مکتی بودھ، نقوش، جنوری 1976
بھولا (1932 میں لکھا): دانہ ودام، ادبی دنیا، سالنامہ 1938
پان شاپ: دانہ ودام، سالنامہ ادب لطیف
تلادان: دانہ ودام
بکی: گرہن
بلی کا بچہ: مکتی بودھ
بیوی یا بیماری: مکتی بودھ
بے کار خدا: کوکھ جلی
بیل: اپنے دکھ مجھے دے دو
باری کا بخار: ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
تعطل: ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
بیاہ کا منتر، ادبی دنیا، مئی 1938، (یہ افسانہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے)
ٹرمینس: کوکھ جلی
ٹرمینس سے پرے: اپنے دکھ مجھے دے دو، سویرا، شمارہ 32
پہاڑی کوا باقیات بیدی، افکار، کراچی، جنوری 1985،
شاہراہ 1953
تک شک: باقیات بیدی، پندرہ روزہ جام و مینا دہلی اگست 1974
پندار، آج کل ستمبر 1948 (یہ افسانہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے)

ج چ ح خ

چوکری کی لوٹ: دانہ ودام، ادبی دنیا، سالنامہ 1940
حیا تین ب: دانہ ودام
چیچک کے داغ: گرہن
چشمہ بدور: مکتی بودھ، نیا دور کراچی شمارہ (67-67)
جب میں چھوٹا تھا: کوکھ جلی
خط مستقیم اور توسین: کوکھ جلی، ہمایوں مئی 1946
جوگیا: اپنے دکھ مجھے دے دو
حجام الہ آباد کے: اپنے دکھ مجھے دے دو، ہفتہ وار عوامی دور نئی دہلی، 16 اور 23 اپریل 1961 (دو قسطوں میں)
جنازہ کہاں ہے: ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
خود غرض: باقیات بیدی، ادبی دنیا، لاہور، فروری 1938
جہلم اور تارد: باقیات بیدی، سالنامہ ساقی دہلی جنوری 1941
چھے ادب پارے: باقیات بیدی، گفتگو بمبئی، جلد 1، شمارہ 2، 1967

د ڈ ذ-ر ز

دس منٹ بارش میں: دانہ ودام
دوسرا کنارہ: گرہن
دیوالہ: اپنے دکھ مجھے دے دو

ر ز

ردعمل: دانہ ودام
رحمان کے جوتے: گرہن، ساقی جنوری 1942
زین العابدین: گرہن، ادبی دنیا، ستمبر 1940
رنڈوا، ادبی دنیا، اگست 1941

س ش

سارگام کے بھوکے: باقیات بیدی، روح ادب اور فن کار میں شائع ہوا۔ غالباً
شکار: باقیات بیدی، سیپ کراچی، افسانہ نمبر 1976
سونفیا: ہاتھ ہارے قلم ہوئے، سویرا 1936
صرف ایک سگریٹ: ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
غلامی: گرہن
فلم بنانا کھیل نہیں: مکتی بودھ
فرشتہ (ترجمہ): باقیات بیدی، چندن، لاہور، جنوری 1932

ک گ

کوارنٹین: دانہ ودام، ہمایوں جون 1938
گرم کوٹ: دانہ ودام، مصور بمبئی
گرہن: گرہن
گھر میں بازار میں: گرہن
گیتا: مکتی بودھ
کلیانی: ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، نیا دور کراچی، شمارہ 40-39
کوکھ جلی: کوکھ جلی
کشمکش: کوکھ جلی
گالی: کوکھ جلی

ل م

من کی من میں: دانہ ودام، ادبی دنیا، سالنامہ 1939
منگل اشٹکا: دانہ و دام، 'بیاہ کا منتر' ادبی دنیا مئی 1938 عنوان بدل کر مجموعہ میں آیا۔
موت کا راز: دانہ ودام
معاون اور میں: گرہن
مکتی بودھ: مکتی بودھ
مہمان: مکتی بودھ

مہاجرین: کوکھ جلی، آج کل یکم جون 1946
ماسوا: کوکھ جلی، ادب لطیف، سالنامہ 1946
متھن: ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
لچھمن: دانہ و دام
لاروے: گرہن، ساقی ستمبر 1941
لمس: کوکھ جلی
لاجونتی: اپنے دکھ مجھے دے دو
لمبی لڑکی: اپنے دکھ مجھے دے دو
مہارانی کا تحفہ: باقیات بیدی، ادبی دنیا لاہور، سالنامہ دسمبر 1937
مثبت اور منفی: باقیات بیدی، ادب لطیف، لاہور، اپریل مئی 1943

ن و ہ

ہمدوش: دانہ و دام
ہڈیاں اور پھول: گرہن، ادبی دنیا، سالنامہ 1941
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے: ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
نامراد: کوکھ جلی
ناگفتنہ: باقیات بیدی، ادب لطیف لاہور، اپریل 1942
نورا: باقیات بیدی، افکار کراچی، مئی جون 1951
وہ بڑھا: ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ی

یوکلپٹس: اپنے دکھ مجھے دے دو

ڈراما

نقل مکانی	ہمایوں	جنوری 1945

افسانہ ایک عنوان دو

منگل اشٹکا	دانہ و دام	بیاہ کا منتر	ادبی دنیا
حیاتین ب	دانہ و دام	وٹامن 'بی'	(دیگر اشاعتوں میں)

ایک عورت کی نا: بے جان چیزیں (ڈراما) پاؤں کی موچ (سات کھیل)

مجموعے جو دوسروں نے مرتب کیے

باقیات بیدی	شمس الحق عثمانی	اردو اکادمی دلّی
بیدی کے افسانے	سرفراز احمد	مکتبہ اردو ادب لاہور

خود نوشت

آئینے کے سامنے	راجندر سنگھ بیدی	جریدہ بیدی نمبر 1984
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی	جریدہ بیدی نمبر 1984
چلتے پھرتے چہرے	راجندر سنگھ بیدی	جریدہ بیدی نمبر 1984

مضامین

خود نوشت، قومی زبان کراچی، نومبر 1988
آئینہ، کتھایاترا بمبئی، مدیر کملیشور، ستمبر 1978
میں: کتابوں سے فلموں تک، ساریکا، راجندر سنگھ بیدی نمبر مارچ 1985
دیباچہ: دانہ و دام، باقیات بیدی
پیش لفظ: دانہ و دام، باقیات بیدی
پیش لفظ: گرہن، باقیات بیدی
پیش لفظ: سات کھیل، باقیات بیدی
پربودھ میتری/ پیش لفظ: ایک چادر میلی سی، باقیات بیدی، آج کل، اکتوبر 1984
علی گڑھ میں خطاب، ہماری زبان علی گڑھ، شمارہ 8، مارچ 1966
قلم اور کاغذ کا رشتہ، عصری آگہی راجندر سنگھ بیدی، اگست 1982
سوانحی اور تاریخی فلمیں، آج کل دہلی، دسمبر 1956
مختصر افسانہ، سوغات بنگلور، جولائی و اکتوبر 1962 جنوری 1963
اظہار خیال، ہفتہ وار ہماری زبان دہلی، 22 جون 1975
سچ نہ کسی کے حلق سے اُترا ہے، نہ اُترے گا، دھرم یگ، 26 دسمبر 1982
سلولائیڈ تخلیق: دستک، (اسکرپٹ)
ترک غمزہ زن (اپندر ناتھ اشک کا خاکہ)، الفاظ علی گڑھ، مارچ تا جون 1982
باقر مہدی کے تعلق سے، کتاب لکھنؤ، مئی 1973
میرا یار کرشن چندر، بیسویں صدی، مئی 1977
وجینتی مالا، ساریکا 16 تا 31 مارچ 1985
پیش لفظ: جالے، افکار کراچی، جنوری 1985
افتتاحیہ: گائے جا ہندوستان: دیویندر ستیارتھی، سنگم پبلشرز، لاہور 1946
پیش لفظ: اپنے آپ کا قیدی، احمد عثمانی، مالیگاؤں مہاراشٹر، 1975
خواجہ احمد عباس (خاکہ)، نیا دور کراچی، شمارہ 34-33، ص 51
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں، معاصر پٹنہ، اگست 1942
چلتے پھرتے چہرے، عصری آگہی، اگست 1982
میں اور میرا فن، آج کل، اپریل 1966
من کہ، آج کل، اکتوبر 1984
فلم بنانا کھیل نہیں: سماجی فلمیں، آج کل، اگست 1972
ایک افسانہ، ایک مباحثہ، ایک خط (افسانہ متھن)، ماہنامہ کتاب لکھنؤ، دسمبر 1968
شرکاء مباحثہ: مسیح الحسن رضوی، عثمان غنی، عابد سہیل، امرت لال ناگر
افسانوی تجزیہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل، جریدہ پاکستان، بیدی نمبر پاکستان، 1984
گیتا (خاکہ)، جریدہ پاکستان بیدی نمبر 1984
خط ڈاکٹر نذیر احمد کے نام، جریدہ پاکستان بیدی نمبر 1984

مکالمات

فلم اور ادب: راجندر سنگھ بیدی سے ایک ملاقات، نمائندہ سیاست، ہماری زبان علی گڑھ، 15 جون 1961
راجندر سنگھ بیدی سے ایک انٹرویو، پریم کپور، کتاب لکھنؤ، مئی 1965
بیدی کے روبرو: ایک انٹرویو: نریش کمار شاد، بیسویں صدی دہلی، جولائی 1966
بیدی سے ایک ملاقات: یونس اگاسکر (گوشہ) شاعر ممبئی، 1975
راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ: رام لعل، عصری آگہی، بیدی نمبر اگست 1982
بیدی سے ایک ملاقات: جاوید مشتاق، عصری آگہی، بیدی نمبر، اگست 1982
فن پرستی سے نقصان اٹھانے والا فن کار: رئیس صدیقی، قومی آواز دہلی، 10 جنوری 1983
بیدی، بارش اور زندگی کی شام: احمد سلیم اور سکھ بیر، جریدہ بیدی نمبر، موسم بہار 1984
راجندر سنگھ بیدی— کا انٹرویو: عصمت چغتائی اور فیاض رفعت، پندرہ روزہ آواز دہلی 16 فروری 1985، روبرو، شکیل اختر
راجندر سنگھ بیدی سے ایک یادگار ملاقات: جلیل باز یدپوری، کتاب نما، اکتوبر 1985
راجندر سنگھ بیدی سے ایک قلمبند ملاقات: مشتاق مومن، عصری آگہی، بیدی نمبر اگست 1982
راجندر سنگھ بیدی سے ملاقات کے تاثرات: لطیف الزماں خاں، فنون نومبر دسمبر 1987
بیدی سے ایک ملاقات: فیاض رفعت، آج کل ستمبر 1997

رسائل کے گوشے/خصوصی نمبر

ماہنامہ افکار کراچی (گوشہ)، جنوری 1985
ماہنامہ بیسویں صدی دہلی (نمبر)، مئی 1977
ساریکا (ہندی) (خصوصی نمبر)، 16 تا 31 مارچ 1985
جریدہ پشاور (بیدی نمبر)، موسم بہار 1984
کتھایاترا بمبئی (گوشہ)، ستمبر 1979
عصری آگہی دہلی (خصوصی شمارہ) اگست 1982
سہ ماہی سوغات بنگلور (گوشہ)، جولائی و اکتوبر 1962
ماہنامہ شاعر (گوشہ)، جنوری فروری 1975
الفاظ علی گڑھ (گوشہ)، نومبر دسمبر 1980
سہ ماہی انتساب سرونج، ایم پی (نمبر)

بیدی پر لکھے گئے خاکے

ہوئے تم دوست جس کے: یوسف ناظم، شاعر بمبئی، جنوری فروری 1975
راجندر سنگھ بیدی: کنہیا لال کپور، جریدہ راجندر سنگھ بیدی نمبر 1984
بیدی صاحب: پرکاش پنڈت، جریدہ راجندر سنگھ بیدی نمبر 1984
راجہ اور راجندر: راجہ مہدی علی خاں، جریدہ راجندر سنگھ بیدی نمبر 1984

سو ہے وہ بھی آدمی: مجتبیٰ حسین، جریدہ راجندر سنگھ بیدی نمبر 1984

بیدی کچھ یادیں: ہرنس سنگھ بیدی، جریدہ راجندر سنگھ بیدی نمبر 1984

بیدرد کردار نگار: ظ انصاری، جریدہ راجندر سنگھ بیدی نمبر 1984

بیدی سے متعلق کتابیں

بیدی نامہ: شمس الحق عثمانی

راجندر سنگھ بیدی۔ شخصیت اور فن: سید نثار مصطفیٰ، مکتبہ تصنیف و تالیف جمشید پور جنوری 1980

راجندر سنگھ بیدی (مونوگراف): وارث علوی، ساہتیہ اکادمی، دلی 1989

راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری اپنے دکھ مجھے دے دو کی روشنی میں: وہاب اشرفی

راجندر سنگھ بیدی شخصیت اور فن: جگدیش چندر ودھاون، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

راجندر سنگھ بیدی-ایک سماجی اور تہذیبی مطالعہ: محمود کاظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2012

راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ: وارث علوی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2010

راجندر سنگھ بیدی شخصیت اور فن: زیتون بانو، تاج سعید، مکتبہ ارژنگ پشاور 1984

انگریزی میں کتابیں

- Rajinder Singh Bedi, Sound and Whispers: Reflections on the literary scence, 1984-86, by Abul Khair Kashifi, Syed Abu Ahmad Akif, Asasa Books, 1991. Chapter 25- Rajender Sing Bedi: The Lost Piller of Modern Urdu Short Story, Page 111
- Progressive Film maker: Films of Rajinder Singh Bedi- Annual of Urdu Studies
- India Partitioned: The other Face of Freedom, edited Mushirul Hasan, New Delhi, Roli Books, 1995
- Shadow Lives: writing one wido whood: Edt. Uma Chakarvarti and Preeti Gill kali for women, New Delhi 2002

قدر شناسی

بیدی پر مضامین

شخص اور شخصیت

اداریہ (الف) ادب کا پت جھڑ (راجندر سنگھ بیدی)، قمر سلطانہ، نیا دور کراچی شمارہ 80-79

راجندر سنگھ بیدی: میرزا ادیب، نقوش سالنامہ جون 1985

بیدی کے نام آخری خط: فکر تونسوی، نقوش، سالنامہ جون 1985

بیدی صاحب: پرکاش پنڈت، عصری آگہی دہلی، اگست 1982

پورا آدمی: ادھورا خاکہ: یوسف ناظم، عصری آگہی دہلی، اگست 1982

راجندر سنگھ بیدی- کچھ یادیں: ہرنس سنگھ بیدی، عصری آگہی دہلی، اگست 1982

راجندر سنگھ بیدی اپنے بچوں کی نظر میں: رتن سنگھ، عصری آگہی دہلی، اگست 1982

بیدی-تب اور اب: شکیلہ اختر، عصری آگہی دہلی، اگست 1982

بیدی میرے گرو دیو: دیوندر ستیارتھی، عصری آگہی دہلی، اگست 1982

بیدی صاحب کی فلمی زندگی: خواجہ احمد عباس، عصری آگہی دہلی، اگست 1982

مکاتیب بیدی: اپندر ناتھ اشک کے نام، عصری آگہی دہلی، اگست 1982

راجندر سنگھ بیدی ایک افسانہ نگار ایک انسان: اوپندر ناتھ اشک، الفاظ، علی گڑھ، نومبر دسمبر 1980

راجندر سنگھ بیدی: نثار مصطفیٰ، آج کل ستمبر 1974

راجندر سنگھ بیدی (خطوط کے آئینے میں): ہنس راج رہبر، آج کل فروری 1985

بیدی میرا دوست میرا محبوب: اوپندر ناتھ اشک، آج کل فروری 1980

جادوگر بیدی: یوسف ناظم، آج کل فروری 1985

عجب آزاد مرد تھا (کیفی اعظمی سے گفتگو): شمس الحق عثمانی، آج کل اکتوبر 1985

بیدی میرے گورو دیو: دیوندر ستیارتھی، آج کل مئی 1996

راجندر سنگھ بیدی ایک حساس فن کار: طلعت فاطمہ، جہان اردو، دربھنگا، جنوری تا جون 14

میرا آخری دوست بیدی: باقر مہدی، جامعہ اپریل جون 2004

راجندر سنگھ بیدی: وقار عظیم: نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

بیدی کا فن: اسلوب احمد انصاری، ادب اور تنقید، سنگم پبلشرز

راجندر سنگھ بیدی- ایک تاثر: آل احمد سرور، بازیافت، شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی

بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں: گوپی چند نارنگ، اردو فکشن، شائع کردہ: شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی

ایک سڑک کچی سی: رام پال، الفاظ علی گڑھ، نومبر دسمبر 1980

ایک ملاقات کا لمس: منصور قیصر، جریدہ بیدی نمبر پاکستان 1984

میں اور بیدی: ڈاکٹر نذیر احمد، جریدہ بیدی نمبر پاکستان 1984

بیدی کے ڈھکے چھپے پہلو: میرزا ادیب، جریدہ بیدی نمبر پاکستان 1984

بیدی پاکستان میں: زیتون بانو، جریدہ بیدی نمبر پاکستان 1984

فکر و فن

بیدی کے افسانے اور ان کا فن: اپندر ناتھ اشک، عصری آگہی، اگست 1982

بیدی کا فن: محمد حسن عصری آگہی، اگست 1982

بیدی-فکر و فن کا تنقیدی جائزہ: اصغر علی انجینئر، عصری آگہی، اگست 1982

بیدی کی کہانیاں- ایک جائزہ: سید محمد عقیل، عصری آگہی، اگست 1982

گیان دھیان کا کتھا کار: جوگندر پال، عصری آگہی، اگست 1982

نامانوس علاحدگیوں اور رفاقتوں کا تناؤ: عتیق اللہ، عصری آگہی، اگست 1982

بیدی اور جدید افسانہ: نثار مصطفیٰ، عصری آگہی، اگست 1982

بیدی کا نظریۂ فن: قمر رئیس، عصری آگہی، اگست 1982

اردو افسانہ کے دو دیہات نگار: انور سدید، قومی آواز، ضمیمہ دہلی، 28 فروری 1982

بیانیہ عرصہ اور راجندر سنگھ بیدی: شافع قدوائی، آج کل اگست 1995، بادباں کراچی، شمارہ 5، جولائی 1997 تا ستمبر 1998

بیدی کے فن کی اساطیری جڑیں: گوپی چند نارنگ، آج کل، ستمبر 1972

بیدی کا ادبی ورثہ: قمر رئیس، آج کل مئی 1987

بیدی کا ڈراما روح انسانی: چرنجیت کور، آج کل مئی 1994

بیدی کی فکری اساس: چرنجیت کور، آج کل جنوری 1993

راجندر سنگھ بیدی ساڑھے چودہ گھنٹے بھوپال میں: عبدالقوی دسنوی، جامعہ مئی 1967

بیدی کی افسانہ نگاری: رضیہ محسنی، جامعہ، جنوری 1966

راجندر سنگھ بیدی کے فن سے آخری ملاقات: باقر مہدی، جامعہ اکتوبر دسمبر 1995

بیدی کی زبان اور تکنیک: اوپندر ناتھ اشک، جریدہ بیدی نمبر 1984

ابتدائی زمانے کا بیدیا ور اس کا فن: آغا سہیل، جریدہ بیدی نمبر 1984

ڈراما اور فلم

فلمی دنیا کا بیدی: خواجہ احمد عباس، جریدہ بیدی نمبر 1984

بیدی کی دو فلمیں: طفیل اختر، جریدہ بیدی نمبر 1984

جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا: طفیل اختر، جریدہ بیدی نمبر 1984

بیدی کی ناٹک رچنا: مظفر علی سید

افسانوں کے تجزیے

گرہن کا تجزیاتی مطالعہ: مظفر علی سید، عصری آگہی، اگست 1982

یوکلپٹس کی تکنیک: نثار مصطفیٰ، عصری آگہی، اگست 1982

بولو- ایک تجزیہ: عبدالقیوم ابدالی، عصری آگہی، اگست 1982

کوارنٹین کی علامتی معنویت: قمر رئیس، عصری آگہی، اگست 1982

بیدی کے افسانے- ایک تاثر: آل احمد سرور، دو ماہی الفاظ علی گڑھ نومبر دسمبر 1980

راجندر سنگھ بیدی دانہ و دام کے آئینے میں: امیر اللہ شاہین، کتاب لکھنؤ، نومبر 1970
متھن کا تجزیاتی مطالعہ: سلیم اختر، فنون لاہور، اگست 1974
'چشمۂ بدور' کے محدب شیشے: ابن فرید، الفاظ علی گڑھ، نومبر دسمبر 1980
'ایک سڑک کچی سی': رام پال، الفاظ علی گڑھ، نومبر دسمبر 1980
بیدی کا نیا مجموعہ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے: سری نواس لاہوتی، شاعر شمارہ 2-1، جلد 46، 1975
بیدی کی افسانہ نگاری: وقار عظیم، آج کل 15 نومبر 1945
کلیانی ایک تجزیہ: سلام بن رزاق، آج کل جنوری 1989
بیدی کے افسانوں میں عصری آگہی: ولی احمد ولی، جامعہ اکتوبر 1988
افسانہ-متھن کا تجزیہ: سلام بن رزاق، سہ ماہی ذہن جدید، جون اگست 1997
راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ لاجونتی ایک تنقیدی جائزہ: ناہید بیگم، ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد فروری 2004
افسانہ لاجونتی ایک تجزیہ: سید محمود کاظمی، قومی زبان حیدر آباد، اگست 2014
راجندر سنگھ بیدی کے اسلوب: پرویز شہریار، روح ادب جولائی تا ستمبر 2013
بیدی کی افسانہ نگاری-صرف ایک سگریٹ کی روشنی میں: آل احمد سرور، اردو افسانہ روایت و مسائل تک، مرتبہ گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1981
راجندر سنگھ بیدی بھولا سے بیل تک: باقر مہدی، اردو افسانہ، روایت و مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1981
ترقی پسند افسانہ اور ناول: عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد، 1945
راجندر سنگھ بیدی: خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1979
اردو افسانہ: محمد حسن، ادبی تنقید، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، 54
نمائندہ ترقی پسند افسانہ نگار: ڈاکٹر صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، اردو مجلس، چتلی قبر 1981
آزادی کے بعد اردو ناول: سید حیدر علی، اردو ناول سمت و رفتار، شبستاں، الہ آباد 1997
متھن (ایک مباحثہ): شرکا: مسیح الحسن رضوی، عثمان غنی، عابد سہیل، کتاب لکھنؤ دسمبر
راجندر سنگھ بیدی دانہ و دام کے آئینے میں: امیر اللہ شاہین، کتاب لکھنؤ نومبر 1970
متھن کا تجزیاتی مطالعہ: سلیم اختر، فنون لاہور اگست 1974
اردو افسانے کے دو دیہات نگار: انور سدید، قومی آواز دہلی 28 فروری 1982

بیدی کے افسانے-ایک تاثر: آل احمد سرور، دو ماہی الفاظ علی گڑھ، نومبر دسمبر 1980
راجندر سنگھ بیدی ایک افسانہ نگار ایک انسان: اوپندر ناتھ اشک، الفاظ علی گڑھ، نومبر دسمبر 1980
راجندر سنگھ بیدی ایک افسانہ نگار ایک انسان: اوپندر ناتھ اشک، الفاظ علی گڑھ، نومبر دسمبر 1980
چشمہ بدور کے محدب شیشے: ابن فرید، الفاظ علی گڑھ، نومبر دسمبر 1980
راجندر سنگھ بیدی بے درد کردار نگار: ظ انصاری، الفاظ علی گڑھ، نومبر دسمبر 1980
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے: سری نواس لاہوتی، شاعر جنوری فروری 1975
بیدی کے افسانے: انوار احمد، جریدہ بیدی نمبر، 1984

کردار نگاری

بیدی کے حجام: کے کے کھلر، عصری آگہی، اگست 1982
رانو-بیدی کا ایک امر کردار: ڈاکٹر شمیم نکہت، عصری آگہی اگست 1982
لاجونتی-چند فنی جہتیں: قمر اعظم ہاشمی، عصری آگہی اگست 1982
راجندر سنگھ بیدی بے درد کردار نگار: ظ انصاری، الفاظ علی گڑھ نومبر دسمبر 1980

افسانوں کا تجزیہ

کوارنٹین (تجزیہ): ڈاکٹر قمر رئیس، جریدہ بیدی نمبر 1984
تلادان: عتیق اللہ، جریدہ بیدی نمبر 1984
گرہن: مظفر علی سید، جریدہ بیدی نمبر 1984
جوگیا: سہیل احمد خاں، جریدہ بیدی نمبر 1984
یوکلپٹس: نثار مصطفےٰ، جریدہ بیدی نمبر 1984
صرف ایک سگریٹ: آل احمد سرور، جریدہ بیدی نمبر 1984
متھن: سلیم اختر، جریدہ بیدی نمبر 1984
تعطل: فتح محمد ملک، جریدہ بیدی نمبر 1984
ایک باپ بکاؤ ہے: گوپی چند نارنگ، جریدہ بیدی نمبر 1984
چشم بدور: ابن فرید، جریدہ بیدی نمبر 1984

مضامین کتابوں میں

راجندر سنگھ بیدی: وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1997
بیدی کا فن: اسلوب احمد انصاری، ادب اور تنقید، سنگم پبلشرز، الہ آباد، 1968
راجندر سنگھ بیدی-ایک تاثر: آل احمد سرور، بازیافت، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی
بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں: گوپی چند نارنگ، اردو فکشن، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
بیدی کی افسانہ نگاری صرف ایک سگریٹ کی روشنی میں: آل احمد سرور، اردو افسانہ: روایت و مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1981
راجندر سنگھ بیدی بھولا سے بیل تک: باقر مہدی، اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
ترقی پسند افسانہ اور ناول: عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد 1945
راجندر سنگھ بیدی: خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
اردو افسانہ: محمد حسن، ادبی تنقید، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
نمائندہ ترقی پسند افسانہ نگار: ڈاکٹر صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، اردو مجلس بازار، چتلی قبر، دہلی
آزادی کے بعد اردو ناول: سید علی حیدر ملک، اردو ناول سمت و رفتار، شبستاں، الہ آباد، 1977
متھن (ایک مباحثہ) (شرکاء): مسیح الحسن رضوی، عثمان غنی، عابد سہیل، ماہنامہ کتاب لکھنؤ
راجندر سنگھ بیدی دانہ و دام کے آئینے میں: امیر اللہ شاہین، کتاب لکھنؤ، نومبر 1970
متھن کا تجزیاتی مطالعہ: سلیم اختر، فنون لاہور، اگست 1974
اردو افسانے کے دو دیہات نگار: انور سدید، قومی آواز ضمیمہ دہلی، 28 فروری، 1982

تراجم

بیدی کے، دوسری زبانوں میں

انگریزی:

- I take this woman - (ایک چادر میلی سی) Khushwant Singh. Delhi, Hindi Pocket, Books, 1967 Penguin Books India 1994
- Selected Stories - Gopi Chand Narang Jai Ratan, Sahitya Akademi, 1989
- Ordained by fate - (ایک چادر میلی سی) Avtar Singh Judge, Sahitya Acadmi 2007
- Give Me your Sorrows Trans Leonard, Karen, Indian Literature Delhi 68
- Land of Five rivers. Orient paperbacks Delhi

ہندی:

بیدی سماگرا: وارث علوی، ترجمہ: ستیہ دیو چودھری، ساہتیہ اکادمی، دہلی

نیپالی:

میلو چادر: ترجمہ: گیان بہادر چھیڑی، ساہتیہ اکادمی، دلی، 2010

پنجابی:

ایک چادر اداسی: راجندر سنگھ بے دی، ترجمہ: ہرنام سنگھ ناز
ہڈیاں دے پھول، ترجمہ: پریتم سنگھ، ساہتیہ اکادمی دلی
راجندر سنگھ بیدی کی چنویاں کہانیاں، پریتم سنگھ، ساہتیہ اکادمی دلی

راجستھانی:
ایک چادر میلی سی: کمل رانگا، ساہتیہ اکادمی، دلی 2008
کشمیری: پران دار: سید رسول پومپور، ساہتیہ اکادمی دلی، 1985

بنگالی:
ایک چادر میلی سی

تحقیقی مقالے

1. راجندر سنگھ بیدی اور ترقی پسند اردو افسانہ: حامد علی خاں نجمی، ایم جے پی، روہیل کھنڈ
2. راجندر سنگھ بیدی کے ناول ایک چادر میلی سی کا تنقیدی جائزہ: شمع افروز، نگراں: صغیر بیگ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 2009
3. راجندر سنگھ بیدی: شمس الحق عثمانی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زندگی کی اہم تاریخیں

1932 ادبی زندگی کا آغاز
19 پہلی ملازمت، پوسٹ آفس لاہور، بحیثیت کلرک
1934 شادی
1943 ڈاک خانے کی ملازمت سے استعفیٰ
1946 اشاعتی کام کا آغاز، سنگم پبلشر لمیٹڈ
1947 لاہور سے ہجرت
1948 دہلی میں منتقلی، ادیبوں کے وفد کے ساتھ کشمیر کا دورہ
1948 جموں ریڈیو اسٹیشن کے لیے ڈائرکٹر کا عہدہ
1949 دہلی واپسی، دہلی سے بمبئی منتقلی
1949 بمبئی میں فلمی زندگی کا آغاز
1972 پدم شری ایوارڈ
1979 فالج کا حملہ (دائیں آنکھ، دایاں ہاتھ اور دایاں پیر متاثر)
1982 جواں عمری میں نریندر بیدی کی موت
1984 بیماری کا شدید حملہ اور داعی اجل کو لبیک

بیدی کے ہم عصر

- کرشن چندر
- سعادت حسن منٹو
- فیض احمد فیض
- ن م راشد
- اوپندر ناتھ اشک
- عصمت چغتائی
- دیویندر ستیارتھی
- بلونت سنگھ
- پطرس بخاری
- اختر اورینوی
- میرزا ادیب
- موہن سنگھ
- سنت سنگھ سیکھوں
- چودھری نذیر احمد
- کنہیا لال کپور
- شاہد احمد دہلوی
- ملک حبیب احمد
- بلراج مین را
- خواجہ احمد عباس
- کیفی اعظمی
- علی سردار جعفری
- مجروح سلطان پوری
- ساحر لدھیانوی
- فراق گورکھپوری
- حفیظ جالندھری
- احمد ندیم قاسمی
- سہیل عظیم آبادی
- رام لعل
- یوسف ناظم
- صابر دت
- پرکاش پنڈت
- کنور مہندر سنگھ بیدی
- راجہ مہدی علی خاں
- نریش کمار شاد
- رتن سنگھ
- امر کمار سود
- سریندر سہگل
- مجتبیٰ حسین
- مولانا صلاح الدین
- واجدہ تبسم
- جیلانی بانو
- شکیلہ اختر
- بلونت سنگھ گارگی
- سریندر پرکاش
- جوگندر پال

بیدی کے نقاد

- رشید احمد صدیقی
- آل احمد سرور
- گوپی چند نارنگ
- وارث علوی
- باقر مہدی
- کے کے کھلر
- اوپندر ناتھ اشک
- ظ انصاری
- قمر رئیس
- مظفر علی سید
- سلیم اختر
- فتح محمد ملک
- سہیل احمد خاں
- عتیق احمد
- نثار مصطفیٰ
- ابن فرید
- محمد حسن
- اصغر علی انجینئر
- جوگندر پال
- سید محمد عقیل
- آغا سہیل
- شمیم نکہت
- قمر اعظم ہاشمی
- نذیر احمد
- وقار عظیم
- اسلوب احمد انصاری
- عزیز احمد
- خلیل الرحمٰن اعظمی
- صادق
- عتیق اللہ
- علی حیدر ملک
- انور سدید
- امیر اللہ شاہین
- سری نواس لاہوٹی
- سلام بن رزاق
- طفیل اختر
- خواجہ احمد عباس
- شافع قدوائی
- چرنجیت کور
- عبدالقوی دسنوی
- میرزا ادیب
- دیویندر ستیارتھی
- ہنس راج رہبر
- زیتون بانو
- وہاب اشرفی

بیدی کے محقق

- جگدیش چندر ودھاون
- شمس الحق عثمانی
- حامد علی خاں نجمی
- شمع افروز
- پرویز شہریار
- سید نثار مصطفیٰ
- زیتون بانو تاج
- محمود کاظمی

موضوعات افسانہ

جنس پر مبنی

- جوگیا
- بیل
- کلیانی
- باری کا بخار
- میتھن

مرد عورت کی کشمکش

- تمہید
- گرہن
- دیوالہ
- گھر میں بازار میں
- چیچک کے داغ
- ہڈیاں اور پھول
- گرم کوٹ

محرومی کا طربیہ

- منگل اشٹکا
- پچھمن

عورت کے اسطور

- اپنے دکھ مجھے دے دو
- ایک چادر میلی سی

محبت اور نفرت

- زین العابدین
- معاون اور میں

فریب اور شکست فریب

- دوسرا کنارہ
- ٹرمینس
- ناگفتہ

سیاست گری

- آلو
- چشمۂ بددور

مزاج کا طربیہ

- حجام الٰہ آباد کے
- بولو
- جنازہ کہاں ہے

تین بچے

- بھولا
- چھوکری کی لوٹ
- تلادان

تین بوڑھے

- غلامی
- وہ بڈھا
- مکدھی بودھ

تین مائیں

- کوکھ جلی
- ایک عورت
- یوکلپٹس

دو باپ

- باپ بکاؤ ہے
- صرف ایک سگریٹ

معاشی مجبوریاں

- پان شاپ
- حیاتین ب
- لاروے
- ایوالانش
- سارگام کے بھوکے

سفر حیات کیں ٹرمینس موت

- تمہید
- ہم دوش
- لمبی لڑکی
- کشمکش
- نامراد
- رحمان کے جوتے

شکست و فریب کا تجربہ

- بکی
- لمس
- گالی
- خط مستقیم اور قوسین
- بے کار خدا
- بلی کا بچہ

عیاری و مکاری اور فریب خوردگی

- من کی من میں
- گوارنٹین
- ٹرمینس سے پرے
- لاجونتی
- مہاجرین

Dr. Jameel Akhtar 18 G. CPWD Colony
Vasant Vihar, New Delhi 57, Mob.: 9818318512

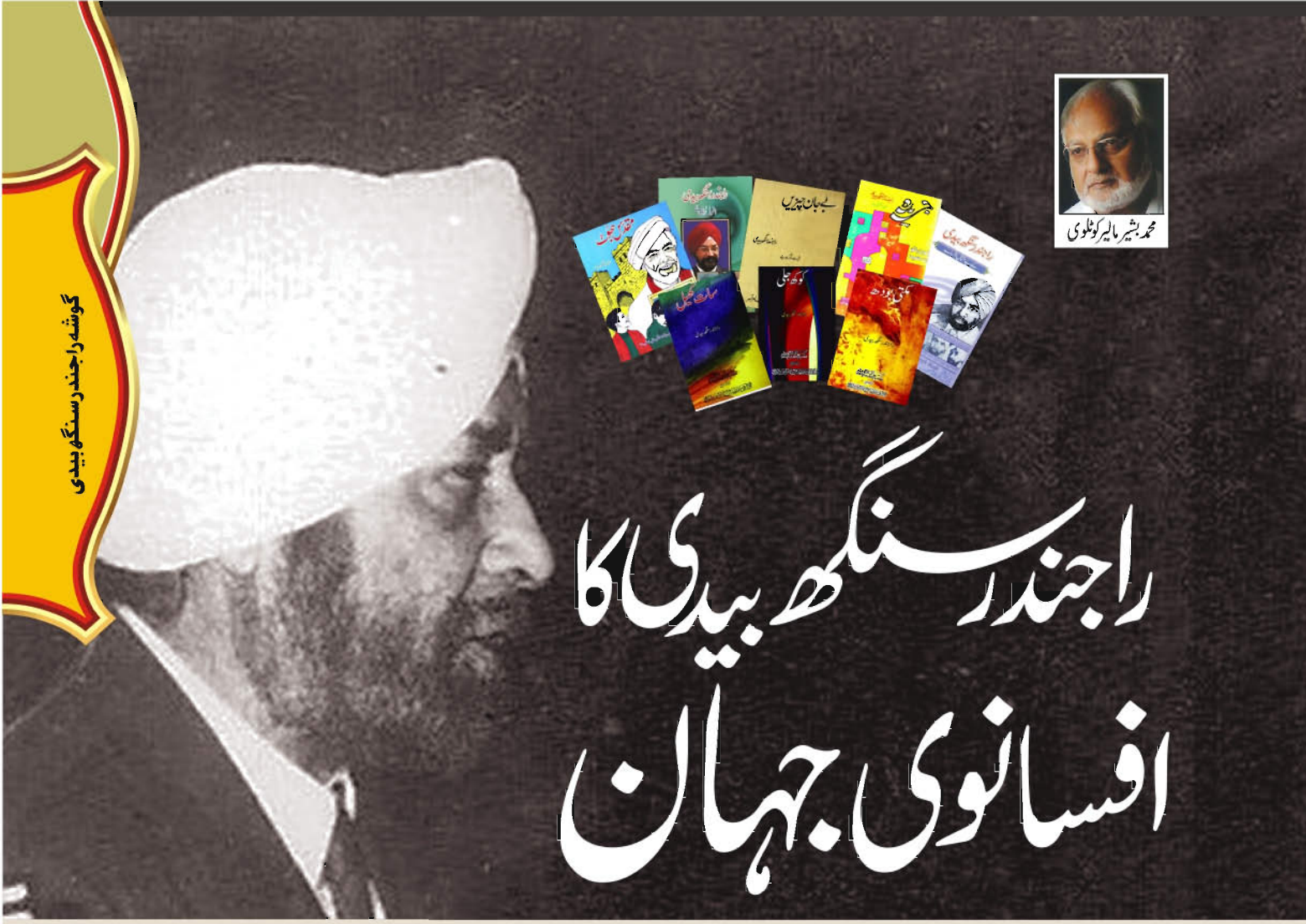

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

راجندر سنگھ بیدی کا افسانوی جہان

کچھ افسانے محقق تصوراتی کرداروں کو لے کر کسی خاص متن کی بنیاد پر تخلیق کیے جاتے ہیں۔ ایسے افسانوں کو آپ کتنا ہی بہتر اسلوب بخش دیں، افسانے کے تمام رموز بروئے کار لائیں، ایسے افسانے حقیقت سے ہٹ کر ہی نظر آتے ہیں۔ ایسے افسانے جنھیں پڑھ کر لگے کہ یہ تو میری ہی آپ بیتی ہے یہ تو اس کی کہانی ہے۔ ارے —! یہ تو اُس کا قصہ ہے، ایسے افسانے دل کو چھو جاتے ہیں۔ آپ کے اعصاب پر اثر انداز ہوتے ہیں اور آپ کے ذہن پر اُن کا سحر پہروں چھایا رہتا ہے۔ ایسے ہی افسانے مقبول ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا افسانہ راجندر سنگھ بیدی کا 'بھولا' ہے۔ بیدی کے اس فن پارے میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے افسانے میں ہونی چاہیے۔ بیدی کے آرٹ کا یہ بہترین نمونہ ہے، جس میں کوئی گلیمر نہیں۔ کوئی جنسی نفسیات نہیں، رومان کی رنگینی نہیں۔ بلاوجہ کی منظر نگاری، لفاظی اور مزاح نہیں اس کے باوجود بھولا بہت ہی پرکشش افسانہ ہے جس کے مطالعے کے بعد آپ کے اندر ایک مسرت بھری گونج سنائی دیتی رہتی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ بیدی کی زندگی میں کوئی ننھا بھولا ضرور رہا ہوگا جس کے بھولے پن، پیاری پیاری باتوں اور معصوم حرکات سے متاثر ہو کر بیدی نے اُس کے کردار کو فن کی چاشنی دی جو ایک شاہ کار افسانہ بن کر ہمارے سامنے پھیل گیا۔

بیدی کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ بیدی ایک سنجیدہ اور تجربہ کار افسانہ نگار تھے۔ بڑی چوکسی سے افسانہ تخلیق کرتے تھے وہ افسانے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتے تھے۔ افسانے کی جزئیات پر اُن کا خاص دھیان رہتا تھا ان کے افسانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مشاہدات کی کمزوری برداشت نہیں کرتے تھے کیونکہ اُن کے مشاہدات ذاتی تھے محض تصوراتی نہیں تھے شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ انھوں نے پنجاب کے دیہات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ میں اگر غلط نہیں ہوں تو شاید انھوں نے اپنے کرداروں کو اپنے دیش میں ہی بسائے رکھا۔ بیدی بڑے آرام سے اور غور و فکر کے ساتھ افسانے کو انجام دیتے تھے۔ شاید وہ کمرشیل بھی نہیں تھے۔ وہ اپنی تخلیق میں زیادہ سے زیادہ جینا پسند کرتے تھے۔ بہر حال بات افسانہ 'بھولا' کی ہو رہی تھی۔ بھولا کا کردار بہت ہی معصوم اور بھولا بھالا ہے۔ اس بچے کو رشتوں کے بارے میں بھی علم نہیں وہ سمجھتا ہے جو اس کا ماموں ہے وہ سب کا ماموں، اس کی اپنی ماں کا، دادا کا اور محلے کے بچوں کا بھی۔ اپنے ماموں سے اُس کا والہانہ پیار۔ ماموں کا انتظار، سلیقے سے بیان کیا گیا ہے بھولا کی چھوٹی چھوٹی باتیں اپنے دادا سے روٹھ کر کہنا ''بھولا بابا جی کا نہیں — بھولا ماتا جی کا ہے۔!'' اتنی اوپجنل ہیں جیسے لگتا ہے افسانہ نگار نے افسانے کو خود جیا ہے۔ آپسی رشتوں کا پیار اور کشش دیکھنے کو ملتی ہے — افسانے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ بھولا دادا سے دن میں کہانی سنتا ہے اور خود کو گنہ گار تصور کر کے رات کو اپنے ماموں کو راستہ دکھانے اکیلا ہی نکل پڑتا ہے۔ بھولا کی گمشدگی کے دوران ماں کا اور دادا کا برا حال ہے کہ بھولا کو گود میں اٹھائے بھولا کا ماموں گھر میں داخل ہوتا ہے، سب کے چہرے کھل اٹھے۔ بچے کا ایک معصوم کردار ہمیں 'چھوکری کی لوٹ' میں پرساد ی رام کے نام سے روشناس کروایا جو بھولا ہی کی طرح دنیا کے رسم و رواج اور رشتوں کی اہمیت کو فی الحال نہیں سمجھتا تھا۔

افسانہ انسانوں کی سرگذشت ہوتا ہے، بیدی نے چن چن کر انسانوں کی حکایتیں پیش کی ہیں بوڑھوں کی نفسیات کے متعلق، غلامی، وہ بڈھا اور مکتی بودھ افسانے ہمیں دیے ہیں۔ بیدی ہالی ووڈ کے آدمی تھے انھوں نے وہاں کے مشاہدات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مکتی بودھ اس کی ایک مثال ہے۔ فلموں میں اتار چڑھاؤ، محرومی، فن کی ناقدری وغیرہ ہمارے سامنے آتی ہیں۔ رشتوں کے جذباتی معاملات کی بات ہو تو ہمارے سامنے کوکھ جلی، ایک عورت، باپ بکاؤ ہے اور صرف ایک

سگریٹ وغیرہ ہیں۔ بیدی نے زندگی کے سفر کے مختلف مراحل سے کہانیاں چنی ہیں۔ 'باپ بکاؤ ہے' عنوان سے محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ مزاحیہ ہوگا اور اس عنوان سے اشتہار عجیب وغریب لگتا ہے لیکن افسانے میں بوڑھوں کی زندگی کے بہت سے سنجیدہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیا خوب لکھا ہے:

''زندہ رہنے کے لیے جہاں انسان کو پھل پھول پیڑ پودے اور جنگل کے جانور ضروری ہیں۔ وہاں بچے ضروری ہیں بوڑھے بھی ضروری ہیں۔''

'صرف ایک سگریٹ' میں سنت رام کی صبح چار بجے آنکھ کھل جاتی ہے۔ اُسے سگریٹ کی طلب ستاتی ہے وہ بیٹے کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکال کر پی لیتا ہے اور وسوسوں میں گھر جاتا ہے جبکہ بیٹے کو ایک سگریٹ کھو جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کسی افسانہ نگار کے افسانوں پر مجموعی طور پر نظر ڈالیں تو سبھی افسانے شاہکار نہیں ہوتے۔ کہیں نہ کہیں ہلکا پن محسوس ہوتا ہے۔ 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کو ایک نفسیاتی افسانہ کہا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں بیدی کو ایک مکمل عورت کی تصویر پیش کرنا تھا اور وہ اندو کی شکل میں پیش کرنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ تیس صفحات پر مشتمل اس افسانے کو پڑھنے میں کافی مشقت کرنا پڑی۔ افسانہ ایک ہی نشست میں نہ پڑھا جائے تو مزہ نہیں دیتا۔ 'اپنے دکھ مجھے دے دو' جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکھ سکھ بانٹنے کی بات کہی گئی ہوگی۔ اچھی بیوی میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں اندو میں وہ سب شادی کے بعد اندو مدن کے بہن بھائی اور پتاجی کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اُس کو خوشیاں دیتی ہے اس کی خدمت کرتی ہے۔ اُس کو لذتوں سے ہمکنار کرتی ہے اس کی نسل چلاتی ہے۔ عورت کی زندگی کا نصب العین بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ عام بات ہے۔ اندو سہاگ رات کو مدن سے کہتی ہے کہ اپنے دکھ مجھے دے دو افسانے کے اختتام پر وہ شوہر مدن سے گلہ کرتی ہے کہ تم نے کیوں نہیں کہا کہ اپنے سکھ مجھے دے، اندو کا یہ کہنا کہ اب عمر کے اس آخری حصے میں دینے کے لیے اُس کے پاس کچھ نہیں بچا جبکہ مدن اُسے پہلے ہی کہہ دیتا ہے کہ مجھے تم نے سب کچھ دیا۔ سارے سکھ دیے۔ افسانے میں ایک متن ایسا ہمارے سامنے آتا ہے جس کا شاید بیدی کو احساس ہی نہ تھا کہ اسے بھی ڈیولپ کیا جاسکتا تھا۔ اندو گھر گرہستی میں اس قدر الجھ جاتی ہے کہ اپنی خوبصورتی رکھ رکھاؤ، بناؤ سنگھار بھول جاتی ہے۔ مدن بھٹک جاتا ہے، کوٹھوں پر جانے لگتا ہے، وہ جب محسوس کرتی ہے تو پھر سے بننے سنورنے لگتی ہے پھر سے اُس کی خوبصورتی کھل اٹھتی ہے بھٹکا ہوا شوہر سنبھل جاتا ہے۔ نقاد اس کہانی کو بھی شاہکار گردانتے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد کسی تخلیق سے جمالیاتی پہلو نکالنا ہی ہے تو ہم نکال ہی لیں گے۔ میں یہ سمجھ نہیں پایا کہ شاہکار افسانے کا پیمانہ کیا ہے۔

'گرم کوٹ' بیدی کا لازوال افسانہ ہے۔ اس میں زندگی کی ایک کڑوی سچائی پیش کی گئی ہے۔ افسانہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ایک پوسٹ آفس کلرک کی تنگدستی کا یہ المیہ یا تو بیدی نے خود بھگتا یا اُن کے بہت ہی قریب کوئی ایسا کردار ضرور ہوگا جس کو انھوں نے اپنے تخلیقی عمل میں شامل کیا کلرک جو راوی ہے نچلی سطح کے کمزور طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو بڑی مشکل سے اپنے کنبے کی ضروریات زندگی جٹا پاتا ہے۔ اُس کا بوسیدہ کوٹ اُس کی بدحال زندگی کی داستان ہے وہ جب ماسٹر معراج الدین کی دوکان پر عمدہ عمدہ سوٹ آویزاں دیکھتا ہے تو اسے اپنی محرومی بہت کھٹکتی ہے۔ اس کے کلیگ سنتا سنگھ اور یزدانی کلب میں نشہ بھی کرتے ہیں اور پریل بھی کھیلتے ہیں مگر وہ اپنے گھر کے بجٹ کی وجہ سے اپنی خواہشات دبائے رکھتا ہے اس کی بیوی شمی اس سے بار بار کہتی ہے کہ اب تو یہ کوٹ بالکل کام کا نہیں رہا۔ تم کوٹ کا کپڑا کیوں نہیں خرید لیتے۔ وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتا۔ کلرک پہ مصیبتیں تو تب ٹوٹیں جب وہ دس کا نوٹ

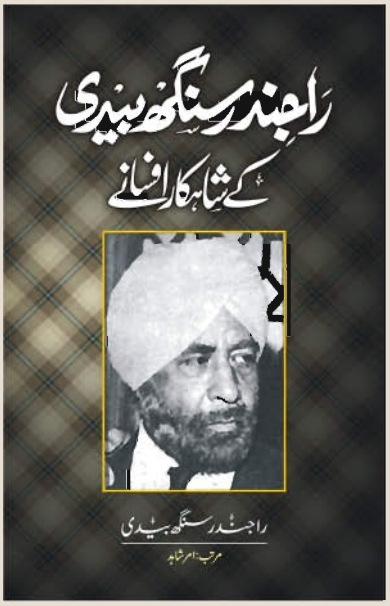

جیب میں ڈال کر بازار آتا ہے۔ پوریاں کھانے کے بعد وہ سوچتا ہے کہ بیٹی کے لیے امرتیاں اور گلاب جامن بھی خرید لوں۔ ہاتھ دھونے کے بعد وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے تو دس کا نوٹ غائب ہوتا ہے۔ مرانجا مرانجا اینڈ کمپنی کا بوسیدہ کوٹ اُسے دھوکا دے دیتا ہے جسے وہ سوچتا ہے کہ اندرونی جیب میں ایک بڑا سوراخ ہو رہا تھا نوٹ وہیں سے باہر گر گیا ہوگا۔ کچھ دنوں بعد نوٹ اُسی جیب سے برآمد ہو جاتا ہے جو پھٹی جیب سے نکل کر اندر استر میں گم ہو گیا تھا۔ دس کا نوٹ سامنے آتے ہی کنبے میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اس بار وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا اور نوٹ شمی کو دے کر کہتا ہے کہ وہ اپنی سہیلی کھیمو کے ساتھ جائے۔ کافوری مینا کے آویزے، ڈی ایم سی کے گولے، مغزی، اور بچوں کے لیے گلاب جامن لے آئے۔ بیوی شاپنگ کر کے بازار سے لوٹتی ہے تو محض ایک بنڈل اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی اور بچوں کی خواہشات کو مار کر شوہر کے لیے کوٹ کا کپڑا لے آتی ہے۔ بیٹی پشپا منی کہتی ہے ''بی بی میرے گلاب جامن''، شمی اس کے منہ پر زور سے ایک چپت مارتی ہے۔ مفلسی، تنگدستی اور محرومی کے ساتھ ساتھ، بیوی بچوں کے پیار اور ایک دوسرے کے لیے ایثار کی بہترین کہانی ہے۔ بلاشبہ بیدی کا یہ شاہکار حقیقت سے بے حد قریب ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے بہترین افسانوں میں سے ایک افسانہ لاجونتی بھی ہے۔ ملک تقسیم ہوا۔ بٹوارہ سیاست دانوں کے ہاتھوں ہوا مگر اس کی بھاری قیمت عام آدمی کو چکانا پڑی۔ اپنی جان دے کر۔ اپنی جائے پیدائش چھوڑ کر۔ عورتوں اور بچوں پر ظلم ڈھائے گئے ادیب عوام میں ہی شامل ہوتے ہیں۔ ادیب خود بھی لامکانی کا شکار ہوئے۔ بے سروسامان اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ بلاشبہ ادیب اپنے دکھ سکھ جن کا وہ سامنا کرتا ہے وہی اپنی تخلیقات میں ڈھالتا ہے۔ اسی لیے ادیب کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دور کی تاریخ مرتب کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ آپ کسی افسانہ نگار کی کلیات ملاحظہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ اپنی زندگی میں ادیب نے جن جن حالات کا سامنا کیا۔ جن تغیرات کو بھگتا اُس کے افسانے بیان کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا زاویہ نظر اپنا اپنا ہوتا ہے۔ بہرحال تقسیم کے سانحہ کو جن ادیبوں نے بھگتا اس کا اظہار انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے کیا۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، بیدی، احمد ندیم قاسمی سب نے تقسیم کے تناظر میں لکھا۔ بیدی کا افسانہ لاجونتی بھی تقسیم کے سانحے کی دین ہے۔

سلسلہ خوبصورت جوانی کا ہو۔ دلیری، محنت، شہ زوری یا روحانیت کا پنجاب سب سے آگے ہی نظر آتا ہے۔ بات دانشوری کی ہو، قصہ غزل یا افسانے کا ہو تو پنجاب پیچھے کیسے رہ سکتا ہے۔ اردو افسانے کے بڑے ستاروں کا نام لیں تو وہ بھی پنجاب کی دین ہیں مثلاً سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر گو کشمیر میں پلے بڑھے انھوں نے وہاں کے خوبصورت پہاڑوں، ہری بھری وادیوں، حسین لوگوں اور چناروں کی اذکار سے اپنے افسانوں کو سجایا ہے۔ وہ صد فی صد پنجابی تھے۔ ان کا تعلق چوپڑہ خاندان سے تھا۔ راجندر سنگھ بیدی پنجاب کے دیہات سے زیادہ وابستہ رہے ان کے افسانوں میں یقیناً پنجاب بولتا ہے۔ بلاشبہ بیدی ایک بلند پایہ افسانہ نگار تھے۔

Mohd Bashir, Malerkotlvi, Retd. Estate Officer, Near Urdu Academy, 8/8 Manto Street, OS Delhi Gate, Malerkotla - 148023 (Pb)

شائستہ فاخری

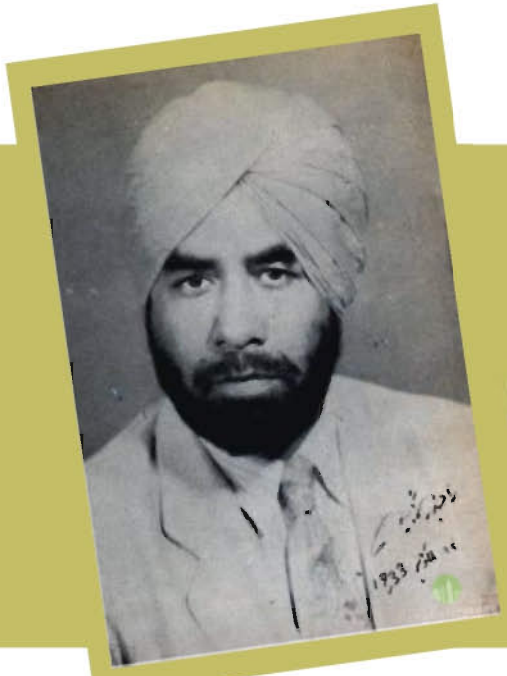

بیدی کے افسانوں میں عورت کا احتجاج

نسائی ادب ہو یا دلت لٹریچر، احتجاج کی آواز جبر اور ظلم کے خلاف خود کے زندہ رہنے کا احساس کراتی ہے۔ حرکت اور حرارت کا دم بھرتی ہے۔ یہ آواز ہمیں ہماری شناخت دیتی ہے کہ دیکھو ہم بھی زیست کے سفر میں تمھارے ساتھ ہیں، تمھارے برابر ہیں۔ نہ تم سے کم نہ تم سے زیادہ بلکہ آج تمھارے شانے سے شانہ ملا کر اپنے پورے حقوق کے ساتھ قدم تال ملا رہے ہیں۔ نسائی ادب کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو احتجاج کی یہ آواز مرد اساس معاشرے کے خلاف ہے جب کہ دلت لٹریچر کا ذکر آتے ہی قدیم ہندوستانی معاشرے کے نظام پر چوٹ پہنچتی ہے۔ بات دونوں جگہ ظلم اور جبر کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کی ہے۔ قوم ہو، برادری ہو یا فرد، جب جب زیادتیاں بڑھی ہیں، مخالفت کی آواز بلند ہوئی ہے اور کُھل کر احتجاج سامنے آیا ہے۔

اکیسویں صدی کی زمین پر کھڑے ہو کر جب ہم بیسویں صدی کے ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بہت کچھ ایسا ہو رہا تھا جو ناز یبا تھا۔ عورت کے تئیں اس کے حالات اس کے مخالف تھے۔ دبے کچلے ایسے حالات جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ پیچھے چھوٹ جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم سب کچھ فراموش کر چکے ہیں۔ ادب فراموشی کا ملال اپنے اندر کبھی اُترنے نہیں دیتا، کیونکہ قلم کار تو گزر جاتا ہے مگر اس کی تحریریں وقت کے کشکول میں پڑی اپنی موجودگی کا احساس کراتی رہتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نسائی ادب کے حوالے سے احتجاج کا ذکر آتے ہی ہم منٹو، بیدی، عصمت اور کرشن چندر کے افسانوں کا حوالہ نہ دیتے۔ یہ سبھی ہم عصر تھے۔ وقت کے تقاضے کو سمجھ رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ 1930 کے بعد فکشن کی دنیا میں بالخصوص افسانوی دنیا کی زمین میں ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ کچھ تھا جو حساس ذہن کو چوٹ پہنچا رہا تھا۔ افسانے کے موضوعات ایک خاص رُخ پر جا رہے تھے۔ نسائی کرداروں پر توجہ دی جا رہی تھی۔ افسانوں کی دنیا کا یہ وہ سنہرا دور تھا جب یہ سبھی افسانہ نگار اپنی الگ الگ قلمی شناخت لے کر اُبھر رہے تھے۔ کوئی اپنی چٹپٹی زبان و بیان اور موضوعات سے پہچانا جا رہا تھا، کوئی جنسی مسائل پر لکھ رہا تھا اور افسانے کے اختتام پر قاری کو چونکا دینے والے انداز سے اپنی پہچان بنا رہا تھا، کسی کے یہاں رومانیت کا رنگ شوخ تر ہو رہا تھا تو کوئی ایسا بھی تھا جس کے افسانوں کی خصوصیت تھی اس کی تہذیبی آبیاری۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے کچھ اسی انداز کے تھے۔ بیدی کا اسلوب شاعرانہ نہیں تھا، ایسی نغمگی نہیں تھی جو کرشن چندر کے اسلوب کو دلکش بناتی تھی۔ ان کے یہاں پنجاب کے دیہات اور دیہات کی زندگی کی تلخ سچائیاں تھیں۔ ایسی ٹھوکریں تھیں جو قاری کو کچھ لمحہ رک کر سوچنے کے لیے مجبور کرتی تھیں۔ ان کا ہر افسانہ زندگی کی چلتی پھرتی تصویر کا عکس تھا۔ عام انسانوں کی زندگی کی حقیقت تھی۔ بیدی کے افسانوں میں ایک روایتی ہندستانی عورت کی تصویر اُبھرتی ہے، ایسی تصویر جس میں ممتا محبت، ایثار، شوہر پرستی اور قربانی کا جذبہ ہوتا تھا۔ جو اپنے آدرشوں کے لیے پل پل مرتی اور پل پل جی اُٹھتی تھی۔ اِن سب کے باوجود بیدی کے نسائی کرداروں میں ایک دبی کچلی عورت کا بے دم سا احتجاج بھی قاری کے ذہن کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ یہ احتجاج نہ آتش فشاں ہے جو زمین کا دامن چاک کر دے اور نہ ایسی برق ہے جو سیاہ بادلوں میں روشنی بھر دے بلکہ بیدی کے افسانوں میں عورت کا احتجاج اس گرم لاوے کی طرح ہے جو ابھی پکا ہے اور نہ وہ پورے طور سے اپنی موجودگی کا احساس کرا پا رہا ہے۔ بلکہ گرم لاوے میں اُٹھتے چھوٹے چھوٹے اس بلبلے کی مانند ہے جو دیکھنے اور پڑھنے والے کو یہ سمجھا رہا ہے کہ دیکھو ہم بھی دم رکھتے ہیں، ہم بھی احتجاج کر سکتے ہیں، ہمیں بھی آواز اُٹھانا آتا ہے۔ مگر پھر بھی.....

'دس منٹ کی بارش' افسانے میں راٹا کا احتجاج سست رفتار ہوتے ہوئے بھی، اپنے اندر اپنی موجودگی کا بھرپور احساس کراتا ہے۔ راٹا کا کردار یعنی مشکی گھوڑی جو بے زبان مگر مضبوط ہے۔ ہر طوفان جھیل کر بھی دمدار کھڑی ہے۔ راٹا کی گالیاں تو محض غصے کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ ملاحظہ کیجیے..... بارش اور بھی تیز ہو رہی ہے اور..... اور راٹا کی گالیوں کی بارش!.....

راٹا دیکھ رہی ہے، پر اشر کہتا ہے۔

''ابھی وہ کہے گی۔ مجھے اپنے دامن میں چھپالو، بابو جی۔''

''کبھی نہیں میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا

''تو اس کے سوا اسے چارہ ہی کیا ہے؟''

''یہ بارش کا دامن کیا اس کے لیے کم ہے؟ راٹا کی سی عورت کو میں جانتا ہوں..... جب کسی ایسے انسان پر عزّت کے دامن تنگ ہو جاتے ہیں..... تو خود بخود ایک بہت بڑا دامن اس کے لیے کھل جاتا ہے.....''

.....اور راٹا کی مٹھیاں بند ہیں۔ کبھی کبھی وہ دانت پیستے ہوئے چیختی ہے۔

''جوان مرے.... کلموئے۔۔ میں نے تو رولیا تجھے بے چین!''

بیدی کی کہانیوں میں عورت کا احتجاج اتنا ہلکا ہے کہ اکثر قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بیدی کے افسانوں میں عورت کا احتجاج ہے ہی نہیں۔ عورت احتجاج سے خالی ہو، یہ بات میں تسلیم کر ہی نہیں سکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کے احتجاج کو اظہار کی قوت ملتی ہی نہ ہو یا کہ اس کی قوت کو اتنا دبا دیا گیا ہو کہ وہ خود گونگی ہو گئی ہو۔ بیدی کے یہاں عورت لاجونتی ہے یا، گرم کوٹ کی محبت کرنے والی شمی یا گرہن کی ستائی دبی کچلی حالت کی ماری ہندستانی عورت ہو لی۔

کہانی 'گرہن' میں ہولی کا کردار بے دم ناری کا ہے جسے اس کا شوہر رسیا بھی کتیا کہہ کر بلاتا ہے، جو ساس کے سامنے اپنی زبان کھولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ پھر بھی اس کے اندر ظلم کے

خلاف احتجاج ہے۔اپنی مرضی کے خلاف کچھ ہونے پر وہ چھٹپٹاتی ہے۔کہانی کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے ......''رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا.... تم بھی تو کتیا ہو، کتیا۔؟

ہولی سہم کر بولی''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بدچلن، ہوس ران سبھی کچھ کہہ دیا۔چوٹ سیدھی پڑی۔ رسیلا کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔'

'گرہن' کہانی میں ہولی کا احتجاج گالیوں تک آکر نہیں تھما۔وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھتی ہے۔عین گرہن کی رات جب چند گھنٹوں کے لیے مرد اور عورت جو پانی کی گواہی میں کبھی ایک بندھن میں بندھے تھے، گھاٹ پر الگ ہوتے ہیں تو ہولی وہاں سے بھاگ جاتی ہے۔یہ عمل ایک دبی کچلی عورت کا کھلا احتجاج تھا۔حالانکہ آگے بھاگنے پر وہ پھر سے اپنے ہی گاؤں کے ایک سپاہی کے ہاتھوں برباد ہوتی ہے۔یہ اُس دور کا المیہ تھا جس سے بیدی اپنی ہیروئن کو بچا نہیں سکتے تھے۔

احتجاج تبھی ممکن ہے جب عورت میں اظہار کی کیفیت موجود ہو۔اس کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے ہمیشہ الفاظ کا سہارا لیا جائے، آواز بلند کی جائے، مٹھیاں تان کر آسمان کی طرف اُٹھائی جائیں یا پھر لڑائی جھگڑے اور رشتے توڑ کر احتجاج کا سُر بلند کیا جائے، یہ ضروری نہیں ہے۔کیونکہ گھریلو رشتوں میں عورت کا احتجاج مردوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔عورت اپنے مزاج، نفسیات اور خود کے اظہار کے معاملے میں مرد کے مقابلے زیادہ پیچیدہ ہے۔وہ اپنے اندر ایک دہکتے ہوئے آتش فشاں کو رکھتے ہوئے بھی بظاہر مسکراتے ہوئے نرم کلمات ادا کرسکتی ہے۔ قدرت نے اسے انھیں وصف کے ساتھ اُتارا ہے۔ وہ اپنا احتجاج بھی کبھی اپنی خاموشی سے، کبھی اپنے آنسوؤں سے اور کبھی جسمانی حرکتوں اور جنبشوں (Body Language) سے کرتی ہے۔بیدی کے نسائی کرداروں میں اس قسم کے سارے احتجاج پائے جاتے ہیں۔

بیدی کی کہانی 'کوکھ جلی' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کے احتجاج میں نہ گالی ہے نہ غصہ۔نہ تلخ کلامی ہے، نہ مار پیٹ پھر بھی وہ اپنے شرابی شوہر اور نکمے لڑکے کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتی ہے اور کافی حد تک کامیاب بھی ہوتی ہے۔اس کہانی کی یہ سطریں دیکھیے.......

'....... لیکن گھمنڈی باہر نہ گیا۔ماں منھ میں دوپٹہ ڈال کر کھڑی ہوگئی۔ماں منھ میں دوپٹہ اس وقت ڈالا کرتی تھی جب کہ وہ نہایت پریشان یا حیران ہوتی تھی۔اور اپنے کلیجے میں مُکّہ اس وقت مارا کرتی تھی جب کہ بہت غمگین ہوتی......

متھن کہانی میں کیرتی مگن لال کے گال پر تھپڑ مار کے نہ صرف مگن میں حرارت پیدا کرتی ہے بلکہ قاری کو بھی اپنی کیفیت کی گرفت میں لے لیتی ہے اور یہیں پر آکر کہانی کئی زینہ اُوپر چڑھ جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر عورت کے اندر احتجاج نہ ہو تو وہ مٹی کا ایک تودہ بن جاتی ہے۔

بیدی کے شروعاتی دور کے افسانے جہاں موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے اہم رہے ہیں، بعد کے افسانوں میں موضوع اور تکنیک کے ساتھ ساتھ قلم کے بہاؤ میں روانی اور چاشنی دونوں آتی گئی ہے جوان کے افسانوں کے زینے کو بلندی کی جانب موڑتی ہے۔اسی زمرے میں لاجونتی ایک ناقابل فراموش افسانہ ہے۔لاجونتی جو محبت اور ایثار کی دیوی ہے۔بٹوارے کی کہانیاں جب جب تلاشی جائیں گی، لاجونتی پہلی صف میں کھڑی ملے گی۔

'جوگیا' کہانی ایک ایسی لڑکی پر مبنی ہے جسے صرف اس لیے ٹھکرا دیا جاتا ہے کہ اس کے باپ کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں ہے۔ٹھکرائے جانے پر نہ وہ روتی ہے، نہ اپنے پریمی سے لڑائی جھگڑے کرتی ہے اور نہ سب کے سامنے آنے میں خفت محسوس کرتی ہے بلکہ بھرے بازار میں وہ اپنے پریمی کو بوسہ دے کر اپنی ماں کے ساتھ ننہیال چلی جاتی ہے، جہاں کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ اس کی شادی طے ہوچکی ہے۔

عورت کے احتجاج کی ایک قسم یہ بھی ہے، جب وہ اپنے غم کو دل سے نہ لگا کر ٹھوکر سے مارتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے۔میرا خیال ہے کہ یہ احتجاج عورت کے تمام قسم کے احتجاج سے مختلف اور مضبوط ہے۔افسانے کا یہ ٹکڑا ملاحظ کیجیے ....جوگیا اپنے پریمی سے کہتی ہے'۔'میں کل بڑودے جارہی ہوں''

''کیوں جوگیا۔بڑودے میں کیا ہے؟''

''میرا ننہیال.......وہاں میرا بیاہ ہو رہا ہے۔پرسوں''

''او.......''

''میں تم سے ملنے آئی تھی۔''

'تو ملو.......'میں جانے کیا کہہ رہا تھا؟

اس وقت آرٹس اسکول کے کچھ لڑکے لڑکیاں، پرنسپل صابری اور کچھ دوسرے لوگ آجا رہے تھے جب کہ جوگیا نے اُچک کر اتنے زور سے میرا منھ چوم لیا کہ میں بوکھلا گیا اور لڑکھڑا کر رہ گیا۔ وہ اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کے بجائے، پینتیس چالیس برس کی ایک بھرپور عورت بن گئی تھی۔ اس کا بوسہ کتنا مرتعش تھا، کتنی مقدس وحشت، شہوت تھی اس میں۔

''میرے جانے کے بعد تم روئے تو میں تمھیں ماروں گی، ہاں''اور ساتھ ہی اس نے مجھے مُکّا دکھایا۔'

جوگیا کے اس ردِّعمل کے بعد بھی کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیدی کی کہانیوں میں عورت کا احتجاج نہیں ملتا! جوگیا اکیسویں نہیں بیسویں صدی کی عورت تھی، اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

'لمبی لڑکی' کی ہیروئن مُنّی سوہی اور 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کی اندو، کہانی کے مرکزی کردار ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر احتجاج کی گھٹن لیے رہتے ہیں۔ اندو کے کردار کو بُھلا دینا آسان نہیں، جو شادی کی پہلی رات اپنے شوہر سے یہی مانگتی ہے کہ 'تم اپنے دکھ مجھے دے دو' اور ساتھی کی بے وفائی کے بعد اختتام پر افسانہ کچھ یوں موڑ لیتا ہے۔۔۔'اندو بولی۔۔'' یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟''

''ہاں'' مدن بولا۔۔۔''اپنے دکھ مجھے دے دو'

''تم نے تو کچھ نہیں مانگا مجھ سے۔''

''میں نے؟'' مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا.......''میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا، وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار۔ان کی تعلیم، بیاہ شادی۔یہ پیارے پیارے بچے۔۔یہ سب کچھ تو تم نے دیا ہے۔''

''میں بھی یہی سمجھتی تھی' اندو بولی....''لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں'' پھر اندو نے رُک کر کہا....''میں نے بھی ایک چیز رکھ لی''

''کیا چیز رکھ لی؟''

اندو کچھ دیر چپ رہی پھر اپنا منھ پرے کرتی ہوئی بولی ....''اپنی لاج.....اپنی خوشی.......اس وقت تم بھی کہہ دیتے.......اپنے سکھ مجھے دے دو....... تو میں......''اور اندو کا گلا رندھ گیا۔'

یہ سچ ہے کہ بیدی کے افسانوں میں عورت کا کھلا احتجاج نہیں ملتا مگر عورت کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے افسانوی کرداروں کے بیچ اس کا جو ردِّعمل دکھائی دیتا ہے وہ عین فطری ہے۔یہ ردِّعمل آنسوؤں کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے، گالیوں کی شکل میں بھی اور جملے بازی میں بھی۔جسمانی حرکتیں اور جنبشیں بھی عورت کے احتجاج کا ایک ذریعہ رہی ہیں۔اظہار کی یہ کیفیت مرد کے مقابلے عورت میں بے حد مختلف ہوتی ہے۔

مضمون کو اختتام کی طرف موڑتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ تخلیقی عمل میں جب تخلیق کار اپنی تحریر قلم بند کرتا ہے تو چاہے انچاہے، جانے انجانے اس کی اپنی شخصیت، اپنی سوچ، اپنے نظریے کا عکس اس کی تحریر میں اُتر آتا ہے۔یہ فطری عمل بھی ہے۔شعوری طور پر تو اس سے بچا جاسکتا ہے مگر ایک فطری قلم کار اس سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ بیدی کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کی شخصیت میں بغاوت، مخالفت اور احتجاج اتنی شدت سے موجود نہیں تھا۔موجود نہ ہونے کے پیچھے عین ممکن ہے کہ ان کی اپنی ذاتی زندگی کی مجبوریاں رہی ہوں گی۔مزاج کی سُبک رفتاری افسانوں کے کرداروں کو بھی اکثر سُبک رفتار بنا دیتی ہے۔بیدی کے نسائی کرداروں میں احتجاج کی کیفیت دبی کچلی عورت کی ایک آہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

■

Dr. Shaista Fakhri, C 9, Radio Colony
Akland Road, Allahabad - 211001 (UP)

شکیل احمد

راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقی انفرادیت

سعادت حسن منٹو نے ایک خط میں بیدی کو لکھا تھا ''تمھاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے وقت سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد سوچتے ہو'' منٹو نے بڑی اچھی رائے دی ہے کوئی بھی ادیب فن کار یا شاعر سوچے بغیر نہیں لکھ سکتا لیکن بیدی زیادہ ہی سوچتے ہیں ان کے سوچنے کا انداز بھی دوسروں سے مختلف ہوتا ہے ان کی سوچ میں سنجیدگی، متانت اور ادراک کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ فکری انتشار، جذباتیت اور تخریب سے ان کی تحریر آلودہ نہیں ہونے پاتی وہ جو بھی لکھتے ہیں طویل تجربے، مشاہدے اور راست مطالعے کی روشنی میں لکھتے ہیں۔

بیدی تنہا نہیں سوچتے۔ ان کی سوچ میں قاری کبھی ان کے ساتھ اور اکثر ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ بیدی اپنی بات اس سرعت سے کہہ جاتے ہیں کہ اکثر قاری کا ذہن اس تہہ تک نہیں پہنچ پاتا لیکن چند ساعت کے بعد اس کی سوچ میں تیزی آتی ہے اور وہ فن کار کی سوچ میں شامل ہو جاتا ہے اسے ناکامی نہیں ہوتی کیونکہ بیدی لایعنی باتیں لکھنے سے پرہیز کرتے ہیں اچھے افسانے کی شناخت بھی یہی ہے کہ فنکار کا رشتہ قاری سے استوار رہے۔ راجندر سنگھ بیدی عام طور پر اپنے افسانوں کی تعمیر میں کسی نہ کسی دیومالائی، تاریخی یا مذہبی واقعہ کے پس منظر کا سہارا لے کر اس میں نئی جان ڈال دیتے ہیں۔ گرہن، من ہی من میں، اور 'اندو' وغیرہ میں اساطیری داستانوں کے متوازی پلاٹ تیار کیا ہے۔ 'لاروئے' میں استعارے کنائے کے سہارے افسانے کو خوبصورت اور بامعنی بنایا ہے اس منفرد انداز پیش کش میں بیدی کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔ انتظار حسین کے افسانے 'کشتی' اور 'کھوئے ہوئے لوگ' پڑھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ بیدی کے فن کو نہ صرف آگے بڑھا رہے ہیں۔ بلکہ اسے اور بلندیوں سے ہمکنار کر رہے ہیں۔

بیدی کے افسانوں کو پڑھ کر قاری کو نئے ماحول اور جداگانہ پیش کش کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں افسانے کے پر کشش کردار متحرک ہو جاتے ہیں انھوں نے بھولا، چھوکری کی لوٹ اور بیل وغیرہ میں بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ 'بھولا' میں بچہ اپنے دادا سے کہانی سنتا ہے کہ دن میں کہانی سننے سے رات کو مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ اسی روز بھولا کے ماموں اس کے گھر آنے والے ہیں رات گئے تک جب اس کے ماموں اس کے گھر نہیں آئے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ شاید دن میں کہانی سننے کی وجہ سے ہی میرے ماموں راستہ بھول گئے ہیں اور اب تک میرے گھر نہیں پہنچ پائے ہیں۔ چنانچہ بچہ تاریک رات میں چراغ لے کر ان کی تلاش میں بہت دور تک چلا جاتا ہے اور واقعی اس کی ملاقات اپنے ماموں سے ہو جاتی ہے جو راستہ بھول گئے تھے۔ اپنے بھانجے کو روشنی کے ساتھ تاریک رات میں سرگرداں دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ بچے کی فکر مندی سے افسانے کی پوری فضا میں تحیر کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ بچے کی پاکیزہ نفسیات افسانے 'بھولا' کو فنی بلندی عطا کرتی ہے۔ بھولا ایک علامت بن کر ابھرتا ہے جو عمر میں کم ضرور ہے لیکن فطرت نے اسے دل دردمند عطا کیا ہے اور وہ خود احتسابی سے بھی آشنا ہے۔

'من ہی من میں' مادھو کا کردار عمر رسیدہ لوگوں کی سادہ لوحی کا بہترین نمونہ ہے۔ مادھو عمر میں 40 سے اوپر کا ہو چکا ہے لیکن اس کی عقل بالیدگی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ چنانچہ اسے اکثر یوں مخاطب کیا جاتا ہے ''کہو مادھو من کی من میں رہی؟ اور سادہ لوح مادھو بھی جواب میں یہی جملہ دہرا دیتا ہے ہاں من کی من میں رہی، گرم کوٹ میں محروم بچوں کی ضرورتوں اور خواہشوں کا باپ کو خیال ہے۔ غربت اس کی ضرورتوں کی تکمیل میں حائل ہے۔ باپ اپنے بچوں کی دل داری کرنا چاہتا ہے۔ لیکن بیوی سوچتی ہے کہ اس کا شوہر کتنا بے نیاز ہے جو اپنے کپڑوں تک کا خیال نہیں رکھتا صرف بچوں اور بیوی کی فکر میں پریشان رہتا ہے اس کے لیے موسم سرما میں ایک گرم کوٹ کی سخت ضرورت ہے۔ بیوی بازار جا کر اپنے شوہر کے لیے کوٹ کا کپڑا لاتی ہے۔ بچوں کی خواہش پر شوہر کو ترجیح دیتی ہے کیونکہ اس کا شوہر تیاگی ہے۔ اخلاص و مروت اور محبت کا پیکر اسے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اسے اپنی اولاد کی خواہش کو تھوڑی دیر کے لیے ثانوی حیثیت دینی چاہیے شوہر کی ضرورت کی تکمیل پہلے ہونی چاہیے۔ یہاں تک کہ وہ بچوں کی ضد اور خواہشات کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں ہلکی سی سزا بھی دے ڈالتی ہے:

''پھر بچو پوپی، منا اور میں، تینوں شمی (بیوی) کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔ مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے میز پر بنڈل کھولا۔ وہ میرے کوٹ کے لیے بہت نفیس ورسٹڈ تھا۔ پشپا منی نے کہا، بی بی میرے گلاب جامن...؟ شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی۔''

(دانہ و دام، ص 69-67)

بیدی کے یہاں یک رنگی نہیں۔ ان کے ہر افسانے میں کچھ انفرادیت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ بچوں کی نفسیات کے علاوہ انھوں نے 'عورت' کو بھی اپنے اکثر افسانوں میں پیش کیا ہے۔ اس پیش کش میں بھی عورت کے مختلف روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گھر گرہستی کی الجھنوں میں اور جنس و رومان کی فضا میں ہر جگہ اس کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ عورت

'گرہن' میں اپنی تمام تر سادگی، شرافت کے باوجود ہوس کاروں میں گھری ہوئی تنہا ہے۔ افسانے کی فضا آفرینی میں راہو کیتو، اور چاند گرہن کی دیومالائی کہانی کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس میں تین بچوں کی ماں 'ہولی' کی مجبوریاں ہیں جو اب چوتھے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ سسرال میں اسے ایک پل بھی سکون نہیں۔ ساس سسر تو الگ رہے شوہر بھی اکثر مارتا پیٹتا ہے مجبور ہے میکے میں بھی گزر بسر کی صورت نہیں۔ سسرال میں بھی زندگی اجیرن بن گئی ہے:

''کائستھوں کو تو بچے چاہئیں۔ ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کائستھ ہی 'کل ودھو' کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔ بڑے کائستھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے رسیلا کی بات تو دوسری ہے۔ شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا۔'' (گرہن، ص 7)

ہولی تو ہم پرستوں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ گھر گرہستی سے لے کر زیبائش تک ہر ہر قدم پر سنسرشپ سے گزرنا پڑتا ہے چڑچڑے مزاج کی ساس اسے ٹوکتی ہے ڈانٹتی ہے بھلا ہولی کے دل پر کیا گزرتی ہوگی:

''ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پھاڑ سکے۔ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے وہ سی نہ سکتی تھی، منہ سلا بچہ پیدا ہوگا اب وہ سسرال سے اتنا سیر ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ چار بچوں تین مردوں، دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی۔ دوپہر تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہتی۔'' (گرہن، ص 6)

گرہن سے متعلق جو بھی عقائد ہوں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب چاند یا سورج میں گرہن لگتا ہے تو یہ ان پر برے وقت کی علامت ہوتے ہیں۔ اس وقت عبادت اور ریاضت کے ذریعے ان کی مصیبت کے خاتمے کی دعا کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی تطہیر کے لیے اشنان کیے جاتے ہیں۔ مقدس پاٹھ پڑھے جاتے ہیں نذریں گزاری جاتی ہیں۔ اس سوچ پر بیدی کس طنزیہ انداز میں نظر ڈالتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گذشتہ سال کرتے رہے ہیں، اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہوجاتے ہیں۔ ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہوجاتے ہیں پھر دریا کی ایک لہر آتی ہے پھر پاک وصاف۔'' (گرہن، ص 11)

پریشانیوں میں گھری ہولی چندر گرہن کے بہانے گھر سے نکلتی ہے اور سسرال سے میکے چلے جانے کی ٹھان لیتی ہے اس کے گاؤں کا ایک سپاہی نوجوان اسے سرائے میں لاتا ہے تاکہ اس کے گھر بحفاظت پہنچا دے مگر سرائے میں وہ ہولی کے ساتھ منہ کالا کرتا ہے دوسرا منظر چاند گرہن کا ہے:

''پھر سنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی سرپٹ بگٹٹ وہ گرتی تھی بھاگتی تھی۔ پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ہانپتی اور دوڑنے لگتی تھی۔ اس وقت آسمان پر پورا چاند گہن آچکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا۔'' (گرہن، ص 16)

افسانہ 'چھوکری کی لوٹ' ایک قدیم رسم پر مبنی ہے۔ افسانے کا پلاٹ بڑا نفسیاتی ہے۔ ہر لڑکی شادی کے بعد سسرال یعنی پرائے گھر پہنچا دی جاتی ہے۔ بھائی بہن دونوں آپس میں ازحد پیار کرتے ہیں، چھوٹا بھائی اپنی بہن کی شفقت سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ بہن سسرال جاتی ہے پھر واپس میکے آتی ہے بھائی سمجھتا ہے اب وہ ہمیشہ رہے گی لیکن کچھ دنوں بعد پھر بہن لمبے عرصے تک سسرال میں رہ جاتی ہے چھوٹا بھائی سوچنے لگتا ہے

افسانہ 'چھوکری کی لوٹ' ایک قدیم رسم پر مبنی ہے۔ افسانے کا پلاٹ بڑا نفسیاتی ہے۔ ہر لڑکی شادی کے بعد سسرال یعنی پرائے گھر پہنچا دی جاتی ہے۔ بھائی بہن دونوں آپس میں ازحد پیار کرتے ہیں، چھوٹا بھائی اپنی بہن کی شفقت سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ بہن سسرال جاتی ہے پھر واپس میکے آتی ہے بھائی سمجھتا ہے اب وہ ہمیشہ رہے گی لیکن کچھ دنوں بعد پھر بہن لمبے عرصے تک سسرال میں رہ جاتی ہے چھوٹا بھائی سوچنے لگتا ہے کہ آخر اس کی بہن 'رتنی' بار بار سسرال کیوں چلی جاتی ہے، کیا اس میں اس کی مرضی کا بھی دخل ہے؟

کہ آخر اس کی بہن 'رتنی' بار بار سسرال کیوں چلی جاتی ہے، کیا اس میں اس کی مرضی کا بھی دخل ہے؟ کیا وہ اپنے چھوٹے بھائی کے علاوہ اور اس سے زیادہ کسی اور سے بھی محبت کرتی ہے؟ حالانکہ جیجا جی تو بے حد بدصورت ہے والدین نے غربت کے سبب اسے نامناسب رشتے سے منسلک کر دیا ہے:

''جب رتنی چلی گئی تو پرساد ی اسی بجھے ہوئے تنور پر اداس خاطر بیٹھا ادھیڑ بن کرتا رہا۔ رتنی بھی تو یہی کہتی تھی کہ تمھارا جیجا ملو کنھیا ہے کبھی کسی کے دو دو جیجے بھی ہوتے ہیں۔ میں تو ملو کنہیا کو ہی جیجا کہوں گا اس مردوے کو کبھی نہیں۔'' (دانہ ودام ص 81)

عورت کا ایک روپ ان کے افسانے 'من کی من میں' میں امبو اور کلکارنی کا ہے مادھو ایک مرنجاں مرنج آدمی ہے اپنی نیک خوئی اور سادہ لوحی کے سبب اپنی بیوہ پڑوسن امبو کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتا ہے اس کی مشکلات میں معاون بنتا ہے مادھو کی بیوی کلکارنی کو اس خدمت خلق میں مادھو کی ہوس کاری نظر آتی ہے بیوی اسے ڈانٹتی ہے سخت سست کہتی ہے رحمدل مادھو چپ رہ جاتا ہے اپنے دوست گریب داس سے کہتا ہے:

''بھائی گریب داس! اگر دنیا عورت کی بجائے آدمی کے پیٹ سے پیدا ہونے لگے تو دیا، دھرم اور پریم کا نام ہی نہ رہے عورت آدمی کو اپنی کوکھ سے جنم دے کر اس کے اکھڑپن کو دور کر دیتی ہے۔'' (دانہ ودام، ص 41)

افسانہ کورانٹین میں نوعیسائی ولیم بھاگو ہے۔ پیشے کے اعتبار سے خاکروب ہے۔ لیکن جذبۂ ہمدردی اور انسانیت دوستی میں وہ ابھی مادھو ہی ہے۔ ولیم بھاگو بھی انسانیت دوستی کے پیچھے نازک مصلحتوں کو نہیں سمجھتا۔ ہسپتال میں ڈاکٹر کے ساتھ کام کرتا ہے۔ پلیگ کا زمانہ ہے ڈاکٹر بہت سوچ سمجھ کر پلیگ زدہ مریضوں کے قریب جاتا ہے۔ لیکن بھاگو اپنی انسان دوستی کے سبب بلا خوف غلاظت اور گندگی کے ماحول میں مریضوں کی مدد کرتا ہے موت و زیست کے اس ماحول میں وہ ڈاکٹر سے زیادہ انسان دوست اور عظیم نظر آتا ہے۔ آخر کار طاعون اس کی بیوی کو بھی لپیٹ میں لے لیتا ہے ڈاکٹر عین موقعے پر بھاگو کے ساتھ نہیں پہنچا تاخیر کے سبب اس کی بیوی مرجاتی ہے شہر میں طاعون کے خاتمے کے بعد ڈاکٹر کے اعزاز میں ایک پروگرام ہوتا ہے۔ بیماری کے زمانے میں اس کی تندہی، مستعدی اور انسان دوستی کی تعریف کی جاتی ہے اس کی مسیحا نفسی کے گیت گائے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ کوارنٹین میں کام کرنے والے غریب ولیم بھاگو کا کوئی نام تک نہیں لیتا۔ حالانکہ عملی زندگی میں بھاگو نے جس تیاگ، ایثار اور جرأت مندی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ڈاکٹر اس کے عشر عشیر بھی نہیں کر سکا۔

افسانہ 'پان شاپ' میں ایک ایسی غربت زدہ لڑکی کی حیرانی و پریشانی ہے جس کا شوہر بیمار ہے اس کے پاس علاج کے لیے جب کچھ نہ بچا تو اس نے اپنے سنہرے بال گروی رکھ دیے جو کسی ایسی شوقین عورت کے کام آئیں گے جسے بالوں کی کمی کا احساس ہوگا اور اس سے اس کی زیبائش میں اضافہ ہوگا۔

''لڑکی پان شاپ سے باہر آئی۔ اس کے بشرے سے صاف عیاں تھا کہ اسے بال کے بدلے اس کے اندازے اور ضرورت سے بہت کم روپیہ ملا تھا۔ ورنہ اطمینان اور خوشی کی تحریر اس کے چہرے پر ضرور دکھائی دیتی وہ اپنے بیمار خاوند پر اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی اب اس کے پاس سنہری بالوں کے سوا گروی رکھنے کے لیے رہا بھی کیا تھا؟'' (دانہ ودام، ص 91)

پان شاپ کی مجبور لڑکی کی طرح ہی 'حیاتین ب' اور 'گھر میں

بازار میں' جیسے افسانوں میں بھی حساس، محتاج اور نیک طینت عورت کے نازک احساسات وجذبات کی ترجمانی ہے۔ بیدی نے ان افسانوں میں خاتون کرداروں کو غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

افسانہ 'گھر میں بازار میں' رتن اور دوشی، میاں بیوی کی ناہموار ازدواجی زندگی پر مشتمل ایک اچھی کہانی ہے۔ ذہنی طور پر دونوں میں توازن نہیں۔ اکثر تکرار کی نوبت آتی ہے۔ رتن اپنی بیوی سے جب بازار کا ایک تازہ واقعہ بیان کرتا ہے تو دوشی اس پر اپنا جو ردعمل ظاہر کرتی ہے وہی اس افسانے کی جان ہے:

''اور وہ بیسوا کسی گرہستن سے کیا بری چیز ہے؟''

''تو تمھارا مطلب ہے اس جگہ اور اس جگہ میں کوئی فرق نہیں؟''

''فرق کیوں نہیں۔ یہاں بازار کی نسبت شور کم ہوتا ہے۔''

(مجموعہ گرہن، ص 129)

جذباتی ماحول کی تصویر کشی میں بھی بیدی سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ حقائق کی تلخ نوائی میں بھی دل خراشی کا لہجہ نہیں پیدا ہوتا اور نفرت کے ماحول کی عکاسی میں بھی جذبات سے نہیں کھیلتے۔

معاشی بدحالی بے روزگاری اور مفلسی پر مبنی افسانے بھی بیدی نے لکھے اور بہت اچھے انداز میں لکھے۔ ان کا سماجی اور معاشی شعور ترقی پسندی کا مظہر ہے۔ غربت میں بھی عزتِ نفس کا باقی رہنا کردار کی عظمت کی دلیل ہے جس طرح بابو اپنی حیثیت کو سمجھتا ہے اور خود کو بلند مقام تک پہنچانے کا خواہش مند ہے اسی طرح افسانہ 'معاون اور میں' میں بھی پیتمبر لال کاسۂ گدائی لے کر دربارداری کے فرائض انجام دینا چاہتا۔ اُسے اپنی حیثیت اور مقام کا پتہ ہے وہ درباری کی سطح تک نیچے اتر کر اپنے ضمیر کو کچوکے لگانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ جب اس کا آفیسر اس کو دفتر کے علاوہ گھریلو کاموں کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے تو وہ انکار کر دیتا ہے صرف انکار ہی نہیں بلکہ اپنی حیثیت سے بھی اپنے آفیسر کو روشناس کرانے کی کوشش کرتا ہے:

''آپ نے دفتر کے کام کے لیے مجھے رکھا ہے نہ کہ نج کے لیے۔ معاف کیجیے مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بھوکا مر رہا ہوں لیکن اپنی جیب میں کسی کی چابی کا بوجھ مجھ سے کبھی برداشت نہ ہوگا۔'' (مجموعہ گرہن، ص 172)

پیتمبر لال اُن لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا نمائندہ کردار ہے جو غربت اور بیکاری سے پریشان ہیں اور افسروں یا اپنے سے اونچے لوگوں کے استحصال کا شکار ہیں۔ وہ نوجوان ہماری ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں کیونکہ بھوک برداشت کر لینے کا حوصلہ تو ان کے اندر ہے لیکن ضمیر فروشی کو قبول کر لینا ان کے لیے مشکل ہے۔

''بیدی کا ایک نمائندہ کردار 'زین العابدین' ہے یہ صرف ایک افسانہ ہی نہیں بلکہ ایک عہد، ماحول اور معاشرے کا المیہ بھی ہے۔ زینو بے فکر، آوارہ، غیر ذمے دار، بیکار، ناخواندہ نوجوان ہے۔ معمولی مشاہرے پر نوکری کرتا ہے۔ پیٹ کی آگ چوری پر مجبور کرتی ہے لیکن وہ بڑا عجیب قسم کا چور ہے۔ فوراً اقرارِ جرم کر لیتا ہے۔ مصلحت پسندی اور معاملہ فہمی کی اُسے ہوا تک نہیں لگی ہے اسی لیے وہ اکثر پٹتا بھی ہے تھوڑی دیر بعد سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اپنی پرانی روش اور شناخت نہیں کھوتا۔ نوکری اور آوارہ گردی نے اس کا ذہن اور جسم تک اس کا نہیں رکھا۔ لیکن صاف گوئی بہر حال اس کے پاس ہے۔

مفلسی کے ساتھ ساتھ توہم پرستی کا شکار ایک قدآور کردار 'رحمن' کا ہے۔ افسانہ 'رحمن کے جوتے' میں ان تصورات کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے جن پر رحمن کے نظریات کا جھونپڑا استوار ہے۔ رحمن کا خیال ہے کہ جب اس کا ایک جوتا دوسرے جوتے پر چڑھ جاتا ہے تو کوئی عظیم حادثہ رونما ہو جاتا ہے اور آخر کار ایسا ہی ہوا۔ رحمن کا جوتا واقعی ایک دوسرے پر چڑھ گیا اور ہسپتال میں اس کی موت ہو گئی۔

'تلادان' میں بابو کا کردار ایک ایسے بچے کا کردار ہے جو سماجی 'اقدار' سے واقف نہیں وہ اعلیٰ و ادنیٰ اور کمتر و برتر کی تعریفوں سے نابلد ہے۔ وہ اپنے دوست سکھ نندن سے ہوشیار اور سنجیدہ مگر اس کے مقابلے میں کافی غریب ہے سکھ نندن کی سالگرہ کے موقعے پر بابو جب مہمانوں کی محفل میں جاتا ہے تو جھڑک دیا جاتا ہے۔ اسے اس ماحول سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ تلادان کے موقعے پر جو گیہوں بطور نذر اس کے گھر بھیجا جاتا ہے وہ اسے کھانے سے انکار کر دیتا ہے یہ اس کی انا کی تسکین اور اس کی خود آشنائی کی دلیل ہے۔

افسانہ 'لاروے' میں نامرادی اور محرومیت کی علامت ایک لڑکی ہے۔ جو کسمپرسی کے ماحول میں پلی بڑھی ہے۔ سماج کے کمتر طبقے کی یہ لڑکی ایک نمائندہ کردار ہے۔ لڑکی کی کہانی گڈھے کے اندر پرورش پانے والے کیڑوں مکوڑوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ پوری کہانی گندے پانی میں پرورش پانے والے کیڑوں کے ساتھ چلتی ہے۔ دوسری طرف انسانی سماج کے گندے اور پست ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی ہے۔ کہانی استعارے سے بھرپور ہے لاروے گندے پانی میں تنومند اور زندہ رہتے ہیں۔ صاف پانی میں وہ مرنے لگتے ہیں۔ لڑکی بھی عسرت اور گندگی کے ماحول میں صحت مند نظر آتی ہے اور پہاڑوں کی صحت مند ہوا اسے راس نہیں آتی اور لاروے کی طرح وہ بھی مر جاتی ہے۔ اب بیدی کی فنکاری اور دونوں ماحول کا پس منظر یکے بعد دیگرے ملاحظہ ہو:

''صاف پانی کی وجہ سے پہلے جھانجے مر چکے تھے۔ آسمان سے تازہ پانی پڑتے ہی یہ کیڑے ہلاک ہو جائیں گے اور جب تک یہ پانی پھر کثافت سے آلودہ اور باسی نہ ہوگا۔ مزید لاروے وجود میں نہیں آئیں گے۔ عزیزہ کو پہاڑ کا تندرست پانی راس نہ آیا اس کو پہاڑی پیچش کی شکایت ہو گئی اور آج اچانک صبح کے سات بجے مر گئی۔''

(مجموعہ گرہن، ص 117-116)

'لاروے' ایک علامت ہے اس کے توسط سے بیدی نے انسانی برادری میں 'لاروے' کی نشاندہی کی ہے۔ یہ نشاندہی اردو افسانے میں ایک پیش رفت اور منفرد زاویہ بن کر ابھری ہے۔ ایسی نازک صورت حال 'ہڈیاں اور پھول' میں بھی ہے۔ اس افسانے میں بالکل معمولی سے عمل کی بنیاد پر ایک خوبصورت دلکش اور اثر انگیز افسانے کی تعمیر کی گئی ہے۔ افسانے میں سخت مزاج موچی کی رومان سے ملی جلی کیفیت کا نفسیاتی مطالعہ ہے عرصے سے بیمار بیوی کے علاج پر اس نے کافی وقت اور روپیہ صرف کیا لیکن اس کی بیوی جو ادنیٰ گھر کی لڑکی ہے اعلیٰ قسم کے علاج سے بھی اس کی صحت واپس نہیں آتی۔ صحت واپس آئی تو بالکل ادنیٰ اور بیکار چیز کی بدولت یعنی چھاچھ کے استعمال سے، موچی کی بیوی کو صحت مل گئی۔ بدمزاج اور شکی موچی جس طرح ایک معمولی واقعہ ہے برگشتہ خاطر ہو کر اپنی بیوی کو جھڑکی سے نوازتا ہے وہ اس کی سطحی اور جذباتی افتادِ طبع کا ثبوت ہے۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نے اپنے عہد و ماحول کا نفسیاتی، معاشی، جنسی، تہذیبی اور اخلاقی پس منظر کا خوب سے خوب تر مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعے میں بیباکی، غیر جانبداری اور سنجیدگی ان کی رہنما رہی ہے۔ کرداروں کی ساخت اور شناخت میں جو انفرادیت ہے وہ اردو افسانے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان سے سماجی رشتوں کی کچھ نئی پرتیں بھی کھلتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کی طرح ان کے کرداروں کی شناخت اور مقبولیت میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ بیدی کے افسانوں کے ذریعے پریم چند کی روایت کو نہ صرف استحکام نصیب ہوا بلکہ اسے نئی توانائی بھی ملی۔ یقیناً بیدی کے قاری ان کے افسانوں کو پڑھ کر، اور ان کے کرداروں سے دوبدو ہو کر مدتوں اپنے ذہن وفکر میں تازگی محسوس کرتے رہیں گے۔

■

Dr. Shakil Ahmad, Qasim Manzil, Domanpura, P.O.: Mau Nath Bhanjan - 275101 (UP)

گوشہ راجندر سنگھ بیدی

بیدی کی 'لاجونتی'

حاذق فرید

اردو افسانے کی تاریخ میں راجندر سنگھ بیدی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کا گہرا شعور ملتا ہے۔ عورت کی نفسیات پر بالخصوص ان کی گہری نظر ہے اور افسانہ 'لاجونتی' اس کی ایک اچھی مثال ہے، جس میں بیدی نے کئی پہلوؤں سے عورت کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔

افسانہ 'لاجونتی' مغویہ عورت کی کہانی ہے۔ بٹوارے کے وقت جو فسادات ہوئے ان میں سب سے اہم موضوع غالباً وہی تھا جس کا انتخاب بیدی نے کیا۔ یعنی مغویہ عورت کا مسئلہ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مغویہ عورت کے اس نازک مسئلے کو صرف بیدی ہی نے اٹھایا۔ افسانہ 'لاجونتی' میں لاجونتی کا کردار اہم ہے جو ایثار و قربانی کا مجسمہ ہے وہ ایک ایسی لاجو ہے جو لاجونتی کی طرح چھوئی موئی ہے۔ ہاتھ لگایا اور کمھلا جائے۔ وہ صبر و قناعت کی ایسی دیوی ہے جو خاوند کی مار کھانے کے بعد بھی اس سے خوش رہتی ہے۔ بلکہ شوہر کے قدموں کے نیچے جنت محسوس کرتی ہے۔ اس افسانے کے متعلق ہنس راج رہبر نے لکھا ہے کہ......''دنگوں پر لکھی گئی جو دو کہانیاں اب تک یاد ہیں اور یاد رہیں گی وہ ہیں: سعادت حسن منٹو کی 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور راجندر سنگھ بیدی کی 'لاجونتی' (چھوئی موئی) بیدی نے فسادات پر شاید یہی ایک کہانی لکھی ہے لیکن کیا کہانی ہے اور کیا بات پیدا کی ہے۔'' (مقالہ: 'راجندر سنگھ بیدی خطوط کے آئینے میں' ماہنامہ آجکل دہلی فروری 1985 ص 11)

واقعہ یہ ہے کہ لاجونتی اغوا ہو جاتی ہے بلکہ لاجونتی کی طرح بہت ساری عورتیں اغوا ہو جاتی ہیں پھر ان بدنصیب عورتوں کو واپس لانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ان عورتوں کو بسانے کے لیے تحریک شروع ہوتی ہے۔ تحریک میں لاجونتی کا شوہر سندر لال بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اس لیے اسے کمیٹی کا سکریٹری بنا دیا جاتا ہے۔ کمیٹی کی کوشش سے مغویہ عورتیں بھی واپس آتی ہیں لیکن ان عورتوں سے ان کے اپنے ہی نفرت کرنے لگتے ہیں اور اپنے رشتے دار ہی انھیں ٹھکرا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُن کے شوہر بھی انھیں اپنانے سے انکار کر دیتے ہیں، ان تمام باتوں کے باوجود لاجونتی کا شوہر سندر لال اپنی بیوی کو اپنا لیتا ہے۔ یہاں لاجونتی کا مسئلہ ان لوگوں سے الگ ہے۔ بہر حال ان مغویہ عورتوں کے ساتھ غیروں نے جو کیا ان سے بڑھ کر اپنوں نے کیا۔ افسانے کے اس اقتباس کو پڑھیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ عورتیں جو وہاں سے واپس آئیں، ان سے وہ بہتر ہیں جو واپس نہیں آئیں۔ افسانے کا یہ حصہ پڑھ کر دل کانپ جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''لیکن مغویہ عورتوں میں کچھ ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں باپ، بہن اور بھائیوں نے انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انھوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں، سیکڑوں، ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی۔ لیکن انھیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انھیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی...... سہاگ ونتی...... سہاگ والی...... اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی...... تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا، رے........... اور بہاری چلا دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کر نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔''
(مجموعہ 'اپنے دکھ مجھے دے دو' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی نومبر 1988 افسانہ لاجونتی ص 11)

یہ سچ ہے کہ بٹوارے کے سبب فسادات کی غارت گری، قتل عام اور جنسی استحصال کو افسانہ نگاروں نے افسانے کا موضوع بنایا۔ لیکن بیدی نے اسی موضوع کو کچھ الگ ڈھنگ سے پیش کیا ہے جو ان ہی کا حصہ ہے۔ بقول ولی احمد ولی:

''بیدی کا افسانہ 'لاجونتی' اسی ہنگامی نوعیت کی آئینہ داری کرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت اور واقعیت کی کشمکش و آمیزش سے یہ افسانہ زیادہ اثر آفریں، معنی خیز اور کشش انگیز بن گیا ہے۔ اس میں بیدی جہاں ایک جانب بشری نفسیات اور ہندوستانی عورتوں کے جذبات کی بڑی کامیاب اور حسین تصویر کشی کی ہے وہیں دوسری جانب معاشرے کی اس سفاکی اور بے رحمی کو بھی بے نقاب کر دیا، جس نے عورتوں کو ضعیف الاعتقادی اور توہمات کا شکار اور مردوں کا اسیر بنا رکھا ہے۔''

(مقالہ: 'بیدی کے افسانوں میں عصری آگہی' از ولی احمد ولی ماہنامہ نیا دور

یادِ رفتگاں نمبر حصہ اول مارچ تا ستمبر 1988 ص 96)

'لاجونتی' مغویہ عورت کی کہانی کے ساتھ ایک خالص نفسیاتی افسانہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سندر لال کو جب یہ خبر ملتی ہے کہ لاجو واپس آگئی ہے تو وہ ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اب وہ کیا کرے کبھی دروازے کی طرف قدم بڑھاتا ہے، کبھی پیچھے لوٹ جاتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ روئے لیکن پھر وہ اپنے جذبات کو قابو میں کرتا ہے اور چوکی کلاں کی طرف بڑھتا ہے جہاں مغویہ عورت کو واپس لوٹایا جاتا ہے۔ اب سندر لال امرتسر سرحد پر لاجو کے سامنے کھڑا ہے۔ دونوں کے اندر نفسیاتی کش مکش کی جنگ جاری ہے۔ دونوں اپنی اپنی نفسیات کے ساتھ ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔ لاجونتی سوچتی ہے کہ وہ تو پہلے بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تھا اب تو غیر مرد کے ساتھ رہ کر آئی ہے نہ جانے کیا کرے گا اور کس طرح پیش آئے گا۔ ادھر سندر لال کی نفسیات کچھ دوسری ہے وہ سوچ رہا تھا کہ لاجونتی اس کے غم میں بہت کمزور ہو گئی ہوگی، بالکل مریل ہو چکی ہوگی لیکن سندر لال جب پاکستانی انداز کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے لاجونتی کو تندرست حالت میں دیکھتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ لاجو کو میرا غم نہیں تھا، وہ دوسرے مرد کے ساتھ بھی خوش تھی پھر سوچتا ہے کہ اگر خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی، خیال آتا ہے کہ سرکاری دباؤ کی وجہ سے آگئی ہے۔ گویا مختلف طرح کی نفسیاتی کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے، تاہم وہ اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں بولتا جب کہ اس کے کانوں میں ایسی آوازیں بھی آرہی تھیں کہ مر کیوں نہیں گئی؟ زہر کیوں نہیں کھالیا؟ ہم نہیں رکھیں گے مسلمان کی چھوئی ہوئی عورت کو واپس لے جاؤ۔ بہر حال سندر لال سب کچھ سنتا جا رہا ہے اور لاجونتی کو لے کر اپنے گھر کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ ''جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔''

سندر لال کو اب کسی کی پرواہ نہیں، وہ لاجونتی کے خلاف کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہے، اب تو اس کی رانی آچکی ہے۔ جسے اس نے اپنے دل کے مندر میں استھاپت کر لیا ہے وہ اب لاجو نہیں تھی بلکہ دیوی بن چکی تھی۔ لاجونتی چاہتی ہے کہ وہ لاجو بن کر رہے، تاہم وہ دیوی بن کر بھی سندر لال کے سلوک سے خوش رہنے لگی، لاجونتی چاہتی ہے کہ ساری واردات کہہ سنائے تا کہ اس کا گناہ دھل جائے لیکن سندر لال کچھ بھی سننا نہیں چاہتا ہے۔ تاہم وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کا سلوک لاجو کے ساتھ کیسا تھا۔

افسانے میں لاجونتی کا مسئلہ صرف لاجو کا نہیں ہے بلکہ یہ اس جیسی ہزاروں مغویہ عورتوں کا دکھ ہے۔ بیدی کے یہاں ایسے کئی کردار ہیں جن کا دکھ لاجو سے ملتا جلتا ہے اس ضمن میں 'گرہن' کی ہولی، 'کوکھ جلی' کی بے نام ماں، 'ایک عورت' کی دمو، 'چھوکری کی لوٹ' کی رتی، 'گھر بازار میں' کی درشی، 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کی اندو، اور 'ایک چادر میلی سی' کی رانو، کے نام لے سکتے ہیں۔ یہ سب ہمارے سماج کی عورت کے ایک ہی روپ کی الگ الگ صورتیں ہیں بیدی نے عورت کے تمام روپ کو دکھایا ہے گویا بیدی کے یہاں عورت ہر جگہ مرکزِ نگاہ بنی ہوئی ہے جو بیدی کی انفرادیت ہے۔

افسانہ 'لاجونتی' میں تین چیزیں انتہائی اہم ہیں جن کا ذکر امتیازی طور پر بالکل ناگزیر ہے۔ پہلی چیز ہے افسانے کا آغاز اور اختتام دونوں ایک پنجابی گیت پر ہے۔ افسانہ جس گیت سے شروع ہوتا ہے اسی گیت پر ختم ہو جاتا ہے۔

''ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے.....

'لاجونتی' مغویہ عورت کی کہانی کے ساتھ ایک خالص نفسیاتی افسانہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سندر لال کو جب یہ خبر ملتی ہے کہ لاجو واپس آگئی ہے تو وہ ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اب وہ کیا کرے کبھی دروازے کی طرف قدم بڑھاتا ہے، کبھی پیچھے لوٹ جاتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ روئے لیکن پھر وہ اپنے جذبات کو قابو میں کرتا ہے اور چوکی کلاں کی طرف بڑھتا ہے جہاں مغویہ عورت کو واپس لوٹایا جاتا ہے۔ اب سندر لال امرتسر سرحد پر لاجو کے سامنے کھڑا ہے۔ دونوں کے اندر نفسیاتی کش مکش کی جنگ جاری ہے۔ دونوں اپنی اپنی نفسیات کے ساتھ ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔

'یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری ہاتھ بھی لگاؤ تو کمہلا جاتے ہیں'

اس گیت کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ 'عورت' لاجونتی پودے کی طرح ہوتی ہے جس طرح لاجونتی چھونے ہی سے کمھلا جاتی ہے اسی طرح عورت ہوتی ہے جسے کسی نے چھوا تو وہ کمھلا جاتی ہے یعنی بدنام ہو جاتی ہے اور پھر وہ عورت اپنی پہلی صورت پہلی حالت اختیار نہیں کر پاتی ہے۔ کیونکہ یہ مرد کی دنیا ہے اور یہاں مرد کے بنائے ہوئے قانون چلتے ہیں۔ مرد اپنی بے راہ رویوں کا ذکر فخر سے کرتے ہیں اور عورت درگذر کیے جاتی ہے۔ مرد کی غلطیوں اور گناہوں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے لیکن عورت کی ایک بھول بھی معاف نہیں کی جاسکتی۔'

افسانے کی دوسری خصوصیت عورت اور مرد کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ شوہر اپنی بیوی کے بارے میں کیا سوچتا ہے، بیوی اپنے شوہر کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ اس کش مکش کو بیدی نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عورت جتنی بھی شریف ہو اس کی عزت کے ساتھ جب کھلواڑ ہوتا ہے تب وہ بدنام ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال میں اس کے ماں باپ، بہن بھائی، سب ٹھکرا دیتے ہیں، لیکن یہاں سندر لال اپنی لاجو کو قبول کر لیتا ہے اور اپنے گھر بھی لے آتا ہے مگر لاکھ کوشش کرنے کے باوجود اس کے دل سے یہ بات نہیں جاتی ہے کہ لاجو دوسروں کی چھوئی ہوئی عورت ہو چکی ہے مگر وہ کیا کرتا ایک طرف سماج ہے جو اس کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہے دوسری طرف لاجو کا بھولا پن جو ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے سندر لال کی نظر میں لاجو ایک دیوی کا روپ دھارن کر لیتی ہے لیکن لاجو خود کو دیوی کہلانے کے بجائے ایک عورت ہی رہنا پسند کرتی ہے، جو شوہر کی مار کھا کر بھی خوش رہتی تھی۔ یہاں تک کہ جب اس کا شوہر اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا جاتا تھا تب بھی وہ مار کھانے کے بعد زیادہ دیر اداس نہ بیٹھتی اور سندر لال کے مسکراتے ہی اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور کہہ اٹھتی..... پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی.....

افسانے کی تیسری اہم بات ہے سندر لال کا لاجو کو لے کر اپنے گھر آجانا، لوگ یہ سمجھے کہ لاجو بس گئی لیکن حقیقت بالکل برعکس ہے، کیونکہ لاجو سندر لال کی نظر میں ایک دیوی ہے جس کی وجہ سے سندر لال بھی اپنے برتاؤ میں تبدیلی محسوس کرتا ہے بلکہ وہ لاجو کو مارتا بھی نہیں ہے اور دل ہی دل میں اس کی پوجا کرتا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو جو گرچہ دوسروں کے ساتھ رہ کر آئی ہے اسے صرف بیوی کی حیثیت سے ہی تسلیم نہیں کرتا بلکہ ایک دیوی کی عظمت بھی بخشتا ہے مگر جب لاجو کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ دیوی بن گئی ہے اور گھر میں بھی بس گئی ہے تو اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ حقیقتاً اجڑ گئی ہے، وہ تو سندر لال کی دیوی نہیں بلکہ بیوی بن کر جینا چاہتی ہے جو کبھی گاجر سے لڑ پڑتی تھی اور مولی سے مان جاتی تھی۔ بہر حال لاجو کا المیہ یہی ہے کہ وہ دوبارہ بس تو گئی مگر اجڑ گئی کیونکہ اس کا جسم اب ایک دیوی کا بدن بن چکا ہے۔ چنانچہ اس صورت حال میں کہنا پڑتا ہے کہ سندر لال ظاہری طور پر دل میں بساؤ کا نعرہ تو دیتا ہے لیکن جذباتی سطح پر وہ لاجو کو شوہر کا حق نہیں دے پاتا۔

Dr. Md. Hazique Fareed, Moh: Bari Dargah (River Side), At & P.o: Nawada -805110, Distt: Nawada (Bihar),
Mob: 9308477292
E-mail:drhaziquefreed@gmail.com

راجندر سنگھ بیدی

مشاہیر کی نظر میں

خواجہ احمد عباس

بیدی صاحب تیس برس تک فلم انڈسٹری سے منسلک ہونے کے باوجود فلمی رنگ میں نہیں رنگے۔ ورنہ یہاں تو ہر شخص کہ درکان نمک رفت نمک شد'' والا معاملہ ہے۔ یہی ان کی (بظاہر) ناکامیابی کا باعث ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہی ان کی کامیابی ہے۔

راجہ مہدی علی خاں

بیدی صاحب پرانے راجاؤں اور مہاراجوں کی طرح رات کو غریب پرجا کا حال معلوم کرنے نکل جاتے، مہمانوں سے بچے کھچے کچھ پیسے دوڈھائی آنے ان کی جیب میں ہوں تو مصیبت زدگان میں تقسیم کرآتے ہیں ورنہ رو رو کر ان سے زبانی ہمدردی کر لینے ہی کو کارِ ثواب سمجھ کر واپس آجاتے ہیں۔

رات بھر اپنی رعایا کی دیکھ بھال کرنے کے بعد صبح چار بجے کے قریب واپس آکر اپنے گھر کے سامنے سر کے نیچے ایک اینٹ رکھ کر فٹ پاتھ پر سوجاتے ہیں، کیونکہ مہمانوں کی وجہ سے اکثر انھیں گھر میں سونے کو جگہ نہیں ملتی۔

معزز مہمان صبح آکر انھیں بیدار کرتے ہیں کہ اٹھیے بیدی صاحب! گھر میں خرچ نہیں ہے۔

بیدی صاحب چونک کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اٹھ کر کپڑوں کی گرد اور مٹی جھاڑتے ہیں۔ اندر جا کر نہاتے ہیں، چائے کی ایک پیالی پی کر یہ مظلوم اور اداس روح پیسے کی تلاش میں بمبئی کے شور و شغب میں بھٹکنے کے لیے چلی جاتی ہے۔

کنہیالال کپور

بیدی کی شروع سے خواہش رہی ہے کہ اس کا نام ایک ہی سانس میں کرشن چندر کے ساتھ لیا جائے۔ شروع شروع میں جب نقادوں نے کرشن چندر کے نام کو بہت اچھالا اور بیدی کی طرف مقابلۃً کم توجہ دی۔ تو اسے نقادوں کی ذہانت پر شک ہونے لگا۔ لیکن کچھ عرصے بعد جب ہر کہ دمہ نے بیدی کا لوہا مان لیا تو اسے اطمینان ہوا۔ کرشن چندر غالباً بیدی کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے مداح ہیں مجھے یاد ہے کہ نئے زاویے کی جلد نمبر 2 میں انھوں نے بیدی کا افسانہ 'گرہن' سرفہرست رکھا تھا۔ اس وقت بعض لوگوں نے جو بیدی سے جلتے تھے۔ اعتراض کیا کہ بیدی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ کرشن چندر نے ان لوگوں سے کہا تھا ''میں سمجھتا ہوں کہ اگر نئے زاویے میں اس افسانے کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ تب بھی یہ ایک نمائندہ اور جاندار مجموعہ ہوتا۔''

بیدی اُس وقت ترقی پسند تھا۔ جب لوگ ترقی پسندی کا مفہوم بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے۔ وہ خود نچلے طبقہ میں پیدا ہوا اور اُسے اس طبقے سے محض ہمدردی نہیں۔ بلکہ عشق ہے۔ اُس نے ہمیشہ اس طبقے کی نمائندگی کی ہے اور اس کامیابی سے کی ہے کہ آنے والے دور میں اگر بیدی کو ہندوستان کا گورکی سمجھ لیا جائے تو بہت کم لوگوں کو تعجب ہوگا۔

آل احمد سرور

بیدی کے یہاں اس نئے ہندوستان کی بھی جھلک ملتی ہے جو ایک طرف جدید کاری Modernisation کا مارا ہوا ہے اور دوسری طرف اپنے ماضی سے بھی آزاد نہیں ہوا۔ ان کے نئے افراد کے سر پر پرانے پن کا آسیب بھی ہے اور وہ اس آسیب سے چھٹکارا پانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بیدی اس مہابھارت کے خاموش تماشائی ہی نہیں ہیں، وہ اپنے کرداروں کے ذریعے سے اور ان کی رنگارنگی اور تہہ داری کے ذریعے سے، ایک بہتر روحانی اور ذہنی زندگی کے علمبردار بھی ہیں۔

باقر مہدی

بیدی کے افسانوں میں عورت کا کردار ایک مرکزیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ خوابوں کا سرچشمہ اور تعبیر نہیں۔ جیسا کہ رومانی افسانہ نگاروں کا خیال ہے بلکہ ایک 'نامیاتی حقیقت' ہے اس کے روپ بے شمار سہی مگر گھوم پھر کر وہ 'ماں' ہی رہتی ہے اور اس کی نگاہوں کے افسوں، تبسم کے پھولوں اور خطوط میں جو دلکشی عیاں اور پنہاں ہے۔ اس میں ایک طرح کا کرب مضمر ہے۔ یہ درد و کرب تخلیق کا راز سربستہ ہے اور اس کی زندگی کی دھوپ چھاؤں کی ساری دلفریبی یہیں ختم نہیں ہوجاتی ہے بلکہ اسے دوسروں کے دکھ اپنانے میں بھی زندگی کا آنند ملتا ہے۔ مردوں کے بنائے ہوئے سماج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی بے زبان شخصیت میں وہ جادو ہے جو عیار اور ظالم کو تھرّا دیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس کا اعتراف نہ کرے۔ بیدی عورت کے اس پہلو کو اجاگر کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔

پروفیسر قمر رئیس

بیدی نے انسان کے انگنت معلوم و نامعلوم رشتوں و جذبوں کی شناخت کے نئے پیمانے وضع کیے۔ انسانی وجود کی پراسرار گہرائیوں و پیچیدگیوں کا سراغ لگایا۔ اس سلسلے میں ایک طرف جدید بشری علوم کے مطالعے کو اہمیت دی تو دوسری طرف ہندوستان کی علاقائی و قومی ثقافت کے تسلسل اور زندہ روایات سے بھی رشتہ استوار رکھا۔

گوپی چند نارنگ

بیدی کے فن میں استعارہ اور اساطیری تصورات کی بنیادی اہمیت ہے۔ اکثر و بیشتر ان کی کہانی کا معنوی ڈھانچا دیومالائی عناصر پر ٹکا ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ وہ شعوری یا ارادی طور پر اس ڈھانچے کو خلق کرتے ہیں اور اس پر کہانی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دیومالائی ڈھانچا پلاٹ کی معنوی فضا کے ساتھ ساتھ ازخود تعمیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ بیدی کا تخلیقی عمل کچھ اس طرح کا ہے کہ وہ اپنے کردار اور اس کی نفسیات کے ذریعے زندگی کے بنیادی رازوں تک پہنچنے کی جستجو کرتے ہیں۔ جبلتوں کے خود غرضانہ عمل، جسم کے تقاضوں اور روح کی تڑپ کو وہ صرف شعور کی سطح پر نہیں بلکہ ان کی لاشعوری وابستگیوں اور صدیوں کی گونج کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ بیدی کے ہاں کوئی واحد واقعہ واقعۂ محض نہیں ہوتا، بلکہ ہزاروں لاکھوں دیکھے اور ان دیکھے واقعات کی نہ ٹوٹنے والی مسلسل کڑی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل میں چونکہ ان کا سفر تجسیم سے تخئیل کی طرف، واقعہ سے لاواقعیت کی طرف، تخصیص سے تعمیم کی طرف اور حقیقت سے عرفانِ حقیقت کی طرف ہوتا ہے، وہ بار بار استعارہ، کنایہ اور دیومالا کی طرف جھکتے ہیں۔

عبادت بریلوی

راجندر سنگھ بیدی کا فن اس لحاظ سے اردو کے لیے مایہ ناز ہے کہ وہ ہماری زندگی کے سارے خدوخال نمایاں کر کے پیش کر دیتا ہے۔ اس کا مشاہدہ تیز، اس کی نگاہ دور رَس، دور بین اور اس کا ہر اشارہ معنی خیز اور خیال انگیز ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ اس کا مجموعی تاثر ایک ہی تاثر کے گرد گھومتا ہے اور وہ ہے سماجی بدحالی۔

وارث علوی

بیدی کا اسلوب شاعرانہ نہیں۔ اس میں وہ غنائیت اور نغمگی نہیں جو کرشن چندر کے اسلوب کو اتنی دلکش بناتی ہے۔ اس اسلوب میں وہ روانی بھی نہیں جو منٹو کے یہاں نظر آتی ہے۔ بیدی کا اسلوب قاری سے توقع رکھتا ہے کہ اسے آہستہ آہستہ پڑھا جائے۔ کیونکہ بیدی آہستہ آہستہ سوچ سوچ کر لکھتے ہیں اور استعاروں کو ایسے لفظی پیکروں میں ڈھالتے ہیں کہ جو تصویر سامنے آتی ہے اس کی معنوی جڑیں دور کے اساطیر میں پیوست ہوتی ہیں اور استعاروں، تشبیہوں اور لفظی پیکروں سے ان کی زبان میں ایک ایسی حاضراتی کیفیت اور احساسات کو جگانے والا تاثر پیدا ہوجاتا ہے جو شاعری کا عمل خاص ہے۔ بیدی کی زبان زمین سے لگ کر چلتی ہے۔ افسانوی فضا اور ماحول کی رعایت سے کہیں کہیں دیہاتی Rustic، کھردری اور اکھڑی ہوئی بھی ہے۔ لیکن مٹی کے انھی ظروف میں شاعری کی مئے دوآتشہ بھی لیے ہوتی ہے۔ بھولا، چھوکری کی لوٹ، گرہن، رحمان کے جوتے، دس منٹ بارش میں، دوسرا کنارہ، گرم کوٹ، اپنے دکھ مجھے

دے دو، ہڈیاں اور پھول، چیچک کے داغ، لاجونتی اور ایک چادر میلی سی کا تاثر کہانی اور افسانہ سے کچھ زیادہ ہی ہے اور جو زیادہ ہے وہی شاعری کی مد میں جاتا ہے کیونکہ زبان و بیان کو شاعرانہ بنائے بغیر علامتوں اور استعاروں کے لمس سے، خلاق تخیل کی آنچ دے کر اس سے وہ کیفیت پیدا کرنا کہ ذہن پر ایک شدید تاثر اور وجدانی سرشاری پیدا ہوجائے، شاعری کے عمل کے قریب ہے۔

جگدیش چندر ودھاون

'لاجونتی' میں دو متضاد نظریات کا ٹکراؤ تھا۔ ایک طرف قدامت پسند، لکیر کے فقیر وہ لوگ تھے جو تغیرات زمانہ سے بیگانہ و بے نیاز، شاستروں کے فرمان سے سرمو انحراف کے قائل نہ تھے۔ شاستروں کا کہنا ان کی نظروں میں حرف آخر تھا جس پر کبھی بحث و تمحیص کی گنجائش نہ تھی۔ ایسے بے لچک لوگوں کو قائل کرنا کارِ محال تھا۔ 'ماردیں گے' کی آواز سے ظاہر ہے کہ وہ مذہبی جنون میں حزبِ مخالف کا منہ بند کرنے کے لیے قتل و غارت پر بھی آمادہ تھے۔ ان کے یہاں سوال دلیل کا نہیں حرارت ایمان کا تھا۔ سرِ تسلیم خم کرنے کا تھا۔ ایمان جھکاتا ہے جھکتا نہیں۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

بیدی روایت، ثقافت اور سماج کے اجتماعی حافظے سے آرکی ٹائپ، اساطیر، استعارے اور ضرب الامثال کا انتخاب کرتے ہیں اور اس ذخیرے کو کردار کے پس منظری استعارے کا متبادل بنا دیتے ہیں۔

شمس الحق عثمانی

راجندر سنگھ بیدی نے عورتوں اور بچوں کے علاوہ، پختہ عمر اور بوڑھے افراد کو بھی آدمی اور انسانی معاشرے کے ایسے پہلوؤں کی تفہیم کا ذریعہ بنایا ہے جو صرف معمر افراد کے ذریعے دیکھے اور سمجھے سمجھائے جاسکتے ہیں۔ بیدی کے بیشتر تخلیقی رویوں اور فنی جہات کی طرح، بوڑھوں کے ذریعے کچھ مخصوص احساسات و تصورات کی تجسیم کا آغاز بھی ان کے اوّلین مجموعے: دانہ و دام، ہی سے ہوتا ہے۔

کہنے کو تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بیدی کے اوّلین معروف افسانے 'بھولا' ہی میں ایک بوڑھا شخص موجود ہے جس کی زبانی یہ افسانہ بیان ہوا ہے لیکن، جیسا کہ واضح ہے، افسانے کا مرکزی خیال اِس بوڑھے کو ایک ضمنی اور معاون کردار کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ اس بنا پر اُسے بیدی کے افسانوں میں آنے والے بوڑھے کرداروں کی اولین مثال قرار دینا درست نہ ہوگا۔ اس کردار کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بیدی کے افسانوں میں معمر کرداروں کا نقشِ آغاز ہے اور اِک ایسے راوی کی حیثیت سے سامنے آیا ہے جو افسانے کے واقعات میں خود بھی ایک حد تک شامل ہے، مگر وہ نہ تو واقعات کا محور ہے اور نہ ہی کسی واقعے کے ردِ عمل کا حقیقی مرکز۔

'دانہ و دام' کے جس افسانے میں ایک بوڑھے شخص کو مکمل مرکزیت حاصل ہے اُس کا عنوان 'بچھمن' ہے۔ یہ عنوان، افسانے کے مرکزی کردار کے نام سے ماخوذ ہے۔ ■

راجندر سنگھ بیدی

گرم کوٹ

میں نے دیکھا ہے، معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دوکان پر بہت سے عمدہ عمدہ سوٹ آویزاں ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا اپنا گرم کوٹ بالکل پھٹ گیا ہے اور اس سال ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود مجھے گرم کوٹ کا خیال بھی نہ آئے کیونکہ کلب میں جب سنتا سنگھ اور یزدانی کے کوٹوں کے نفیس ورسٹڈ (Worsted) میرے سمندِ تخیل پر تازیانہ لگاتے ہیں تو میں اپنے کوٹ کی بوسیدگی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگتا ہوں، یعنی وہ پہلے سے کہیں زیادہ پھٹ گیا ہے۔

بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کے لیے مجھ سے معمولی کلرک کو اپنی بہت سی ضروریات ترک کرنا پڑتی ہیں اور انھیں جگر تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لیے خود موٹا جھوٹا پہننا پڑتا ہے۔ یہ گرم کوٹ میں نے پارسال دہلی دروازے سے باہر پرانے کوٹوں کی ایک دکان سے مول لیا تھا۔ کوٹوں کے سوداگر نے پرانے کوٹوں کی سیکڑوں گانٹھیں کسی مرانجا مرانجا اینڈ کمپنی کراچی سے منگوائی تھیں۔ میرے کوٹ میں نقلی سلک کے استر سے بنی ہوئی اندرونی جیب کے نیچے 'مرانجا مرانجا اینڈ کو' کا لیبل لگا ہوا تھا مگر کوٹ مجھے ملا بہت سستا۔ مہنگا روئے ایک بار، سستا روئے بار بار.. اور میرا کوٹ ہمیشہ ہی پھٹا رہتا تھا۔

اسی دسمبر کی ایک شام کو تفریح کلب سے واپس آتے ہوئے میں ارادتاً انارکلی میں سے گزرا۔ اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آٹا، دال، ایندھن، بجلی، بیمہ کمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس روپے کا نوٹ بچ رہا تھا... جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گزرنا معیوب نہیں۔ اس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا بلکہ اپنی ذات کچھ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت انارکلی میں چاروں طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آرہے تھے اور ساڑیاں۔ چند سال سے ہر نتھو خیرا سوٹ پہننے لگا ہے۔ میں نے سنا ہے گذشتہ چند سال میں کئی ٹن سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ شاید اسی لیے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی بہت زیادہ رکھتے ہیں۔ ورنہ جو لوگ سچ مچ امیر ہیں، ایسی شان و شوکت اور ظاہری تکلفات کی چنداں پروا نہیں کرتے۔

کپڑے کی دوکان میں ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے۔ انھیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا ''کیا میں اس مہینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا خرید کر بیوی بچوں کو بھوکا ماروں؟'' لیکن کچھ عرصے کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے ناپاک خیال کا ردِعمل شروع ہوا۔ میں اپنے پرانے کوٹ کا بٹن پکڑ کر اسے بل دینے لگا۔ چونکہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آگئی تھی، اس لیے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ مجھے تو اس وقت اپنا وہ کوٹ بھی سراسر تکلف نظر آنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کہا ہے جو شخص حقیقتاً امیر ہو، وہ ظاہری شان کی چنداں فکر نہیں کرتا۔ جو لوگ سچ مچ امیر ہوں، انھیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قمیض بھی تکلف میں داخل سمجھنی چاہیے۔ تو کیا میں سچ مچ امیر تھا... کہ؟ میں نے گھبرا کر ذاتی تجزیہ چھوڑ دیا اور بہ مشکل دس کا نوٹ صحیح سلامت لیے گھر پہنچا۔

شمی، میری بیوی، میری منتظر تھی۔

آٹا گوندھتے ہوئے اس نے آگ پھونکنی شروع کر دی۔ کم بخت منگل سنگھ نے اس دفعہ لکڑیاں گیلی بھیجی تھیں۔ آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ زیادہ پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیوں میں سے اور بھی زیادہ دھواں اٹھا۔ شمی کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ ان سے پانی بہنے لگا۔

''کم بخت کہیں کا... منگل سنگھ'' میں نے کہا ''میں ان آنکھوں کے لیے منگل سنگھ تو کیا تمام دنیا سے جنگ کرنے پر

آمادہ ہوجاؤں۔''

بہت تگ ودو کے بعد لکڑیاں آہستہ آہستہ چٹخنے لگیں۔ آخر ان پر نم آنکھوں کے پانی نے میرے غصے کی آگ بجھادی۔ شمی نے میرے شانے پر سر رکھا اور میرے پھٹے ہوئے کوٹ میں پتلی پتلی انگلیاں داخل کرتی ہوئی بولی:

''اب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا۔''

''میں نے دھیمی سی آواز سے کہا۔'' ہاں!''

''سی دوں؟'' یہاں سے۔''

''سی دو۔ اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رفو کردو تو کیا کہنے ہیں۔''

کوٹ کو الٹاتے ہوئے شمی بولی ''استر کو تو موئی ٹڈیاں چاٹ رہی ہیں۔ نقلی ریشم کا ہے نا— یہ دیکھیے۔'' میں نے شمی سے اپنا کوٹ چھین لیا اور کہا۔ ''مشین کے پاس بیٹھنے کی بجائے تم میرے پاس بیٹھو شمی دیکھتی نہیں ہو دفتر سے آرہا ہوں۔ یہ کام تم اس وقت کر لینا جب میں سو جاؤں۔''

شمی مسکرانے لگی — وہ شمی کی مسکراہٹ اور میرا پھٹا ہوا کوٹ!

شمی نے کوٹ کو خود ہی ایک طرف رکھ دیا۔ بولی: ''میں خود بھی اس کوٹ کی مرمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں— اسے مرمت کرنے میں اس گیلے ایندھن کو جلانے کی طرح جان مارنی پڑتی ہے۔ آنکھیں دکھنے لگتی ہیں— آخر آپ اپنے کوٹ کے لیے کپڑا کیوں نہیں خریدتے؟''

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔

یوں تو میں اپنے کوٹ کے لیے کپڑا خریدنا گناہ خیال کرتا تھا۔ مگر شمی کی آنکھیں— ان آنکھوں کو تکلیف سے بچانے کے لیے میں منگل سنگھ تو کیا تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوجاؤں، ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان خرید لوں۔ نئے گرم کوٹ کے لیے کپڑا خریدنے کا خیال دل میں پیدا ہوا ہی تھا کہ پشپا منی بھاگتی ہوئی کہیں سے آگئی۔ آتے ہی برآمدے میں ناچنے اور گانے لگی۔ اس کی حرکات کتھا کلی مدرا سے زیادہ کیف انگیز تھیں۔

مجھے دیکھتے ہوئے پشپا منی نے اپنا ناچ اور گانا ختم کردیا۔ بولی:

''بابو جی، آپ آگئے؟ آج بڑی بہن (استانی) نے کہا تھا کہ میز پوش کے لیے دوسوتی لانا اور گرم کپڑے پر کاٹ سکھائی جائے گی۔ گنیا ماپ کے لیے اور گرم کپڑا—''

چونکہ اس وقت میرے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہورہی تھی! شمی نے ایک زوردار چپت اس کے منہ پر لگائی اور بولی:

''اس جنم جلی کو ہر وقت کچھ خریدنا ہی ہوتا ہے۔ مشکل سے انھیں کوٹ سلوانے پر راضی کررہی ہوں۔''

— وہ پشپا منی کا رونا اور میرا نیا کوٹ!

میں نے خلافِ عادت اونچی آواز سے کہا۔ ''شمی!''

شمی کانپ گئی۔ میں نے غصے سے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا ''میرے اس کوٹ کی مرمت کردو... ابھی... کسی طرح کرو... ایسے جیسے رو پیٹ کر منگل سنگھ کی گیلی لکڑیاں جلا لیتی ہو... تمھاری آنکھیں! یاد آیا... دیکھو تو پشپا منی کیسے رو رہی ہے۔ پوپی بیٹا! ادھر آؤ نا... ادھر آؤ میری بچی! کیا کہا تھا تم نے؟ بولو تو... دوسوتی؟ گنیا ماپ کے لیے اور کاٹ سیکھنے کو گرم کپڑا؟... بچو نتھا بھی تو ٹرائی سائیکل کا راگ الاپتا اور غبارے کے لیے مچلتا سو گیا ہوگا۔ اسے غبارہ نہ لے دو گی تو میرا کوٹ سل جائے گا۔ ہے نا؟... کتنا رویا ہوگا

دوسرے دن شمی نے میرا کوٹ کہنیوں پر سے رفو کردیا۔ ایک جگہ، جہاں پر سے کپڑا بالکل اڑ گیا تھا، صفائی اور احتیاط سے کام لینے کے باوجود سلائی پر بدنما سلوٹیں پڑنے لگیں۔ اس وقت معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دکان میرے ذہن میں گھومنے لگی اور یہ میرے تخیل کی پختہ کاری تھی۔ میرے تحیل کی پختہ کاری اکثر مجھے مصیبت میں ڈالے رکھتی ہے۔ میں نے دل میں کہا ''معراج الدین کی دوکان پر ایسے سوٹ بھی تو ہوتے ہیں جن پر سلائی سمیت سو روپے سے بھی زیادہ لاگت آتی ہے... میں ایک معمولی کلرک ہوں۔ اس کی دکان میں لٹکے ہوئے سوٹوں کا تصور کرنا عبث ہے— عبث—

بیچارہ... شمی! کہاں ہے بچو؟''

''جی سو رہا ہے...'' شمی نے سہمے ہوئے جواب دیا۔

''اگر میرے گرم کوٹ کے لیے تم ان معصوموں سے ایسا سلوک کروگی تو مجھے تمھاری آنکھوں کی پروا ہی کیا ہے؟'' پھر میں نے دل میں کہا: کیا یہ سب کچھ میرے گرم کوٹ کے لیے ہورہا ہے؟ شمی سچی ہے یا میں سچا ہوں؟''

پہلے میں نے کہا، ''دونوں!'' مگر جو سچا ہوتا ہے اس کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہتا ہے میں نے خود ہی دبتے ہوئے کہا:

''تم خود بھی تو اس دن کافوری رنگ کے مینا کار کانٹوں کے لیے کہہ رہی تھیں؟''

''ہاں... جی... کہہ تو رہی تھی مگر...''

مگر... مگر اس وقت تو مجھے اپنے گرم کوٹ کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ایک بڑا معلوم ہورہا تھا!

دوسرے دن شمی نے میرا کوٹ کہنیوں پر سے رفو کردیا۔ ایک جگہ، جہاں پر سے کپڑا بالکل اڑ گیا تھا، صفائی اور احتیاط سے کام لینے کے باوجود سلائی پر بدنما سلوٹیں پڑنے لگیں۔ اس وقت معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دکان میرے ذہن میں گھومنے لگی اور یہ میرے تخیل کی پختہ کاری تھی۔ میرے تحیل کی پختہ کاری اکثر مجھے مصیبت میں ڈالے رکھتی ہے۔ میں نے دل میں کہا ''معراج الدین کی دوکان پر ایسے سوٹ بھی تو ہوتے ہیں جن پر سلائی سمیت سو روپے سے بھی زیادہ لاگت آتی ہے... میں ایک معمولی کلرک ہوں۔ اس کی دکان میں لٹکے ہوئے سوٹوں کا تصور کرنا عبث ہے— عبث—

مجھے فارغ پا کر شمی میرے پاس آبیٹھی اور ہم دونوں خریدی جانے والی ساری چیزوں کی فہرست بنانے لگے— جب ماں باپ اکٹھے ہوتے ہیں تو بچے بھی آجاتے ہیں— پشپا منی اور بچو آگئے۔ آندھی اور بارش کی طرح شور مچاتے ہوئے۔

رسوئی کی طرف میری نظر اٹھی۔ چولھے میں لکڑیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں— اور ادھر شمی کی آنکھیں بھی دو چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ معلوم ہوا کہ منگل سنگھ گیلی لکڑیاں واپس لے گیا ہے۔

''وہ شہتوت کے ڈنڈے جل رہے ہیں اور کھوکھا''— شمی نے کہا۔

''اور اوپلے؟''

''جی ہاں، اوپلے بھی—''

''منگل سنگھ دیوتا ہے... شاید میں بھی عنقریب گرم کوٹ کے لیے اچھا سا ورسٹڈ خریدلوں تاکہ تمھاری آنکھیں یوں ہی چمکتی رہیں۔ انھیں تکلیف نہ ہو... اس ماہ کی تنخواہ میں تو گنجائش نہیں... اگلے ماہ ضرور... ضرور...''

''جی ہاں، جب سردی گزر جائے گی۔''

پشپا منی نے کئی چیزیں لکھائیں۔ وہ سوتی گنیا ماپ کے لیے، گرم بلیزر سبز رنگ کا، ایک گز مربع، ڈی۔ ایم۔ سی۔ کے گولے، گوٹے کی مغزی... اور امرتیاں اور بہت سے گلاب جامن— موئی نے سب کچھ ہی تو لکھوا دیا۔ مجھے دائمی قبض تھی، میں چاہتا تھا کہ یونانی دواخانے سے اطریفل زمانی کا ایک ڈبہ بھی لا رکھوں۔ دودھ کے ساتھ تھوڑا سا کھا کر سو جایا کروں گا مگر موئی پشپا نے اس کے لیے گنجائش ہی کہاں رکھی تھی، اور جب پشپا منی نے کہا، ''گلاب جامن'' تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا سب سے ضروری چیز تو یہی ہے— شہر سے واپس آنے پر میں گلاب جامن وہاں چھپا دوں گا، جہاں سیڑھیوں میں باہر جمعدار اپنا دودھ کا کلسار کھ دیا

کرتا ہے، اور پشپا سے کہوں گا کہ میں تو لانا ہی بھول گیا تمھارے لیے گلاب جامن!... اوہو!... اس وقت اس کے منہ میں پانی بھر آئے گا اور گلاب جامن نہ پا کر اس کی عجیب کیفیت ہوگی۔

پھر میں نے سوچا بچو بھی تو صبح سے غبارے اور ٹرائی سائیکل کے لیے ضد کر رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا ''اطریفل زمانی؟''

شمی بچو کو پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''بچو بیٹی کو ٹرائی سائیکل لے دوں گی۔ اگلے مہینے سے۔ بچو بیٹی سارا دن چلایا کرے گی ٹرائی سائیکل... پوپی منا کچھ نہیں لے گا...''

بچو چلایا کرے گی اور پوپی منا نہیں لے ''گا''!

...اور میں نے شمی کی آنکھوں کی قسم کھائی کہ جب تک ٹرائی سائیکل کے لیے چھ سات روپے جیب میں نہ ہوں، میں نیلے گنبد کے بازار سے نہیں گزروں گا۔ اس لیے کہ دام نہ ہونے کی صورت میں نیلے گنبد کے بازار سے گزرنا بہت معیوب ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پر غصہ آئے گا، اپنی ذات سے نفرت پیدا ہوگی۔

اس وقت شمی بلجمی آئینے کی بیضوی ٹکڑی کے سامنے اپنے کافوری سپید سوٹ میں کھڑی تھی۔ میں چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا ''میں بتاؤں تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟''

'بتاؤ تو جانوں...''

''تم کہہ رہی ہو، کافوری سپید سوٹ کے ساتھ وہ کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے پہن کر ضلع دار کی بیوی کے ہاں جاؤں تو دنگ رہ جائے....''

''نہیں تو۔'' شمی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ میری آنکھوں کے مداح ہوتے تو کبھی کا گرم...''

میں نے شمی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری تمام خوشی بے بسی میں بدل گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا ''بس... ادھر دیکھو... اگلے مہینے... ضرور خرید لوں گا...''

''جی ہاں، جب سردی...''

...پھر میں اپنی اس حسین دنیا کو، جس کی تخلیق پر محض دس روپے صرف ہوتے تھے، تصور میں بسائے بازار چلا گیا۔

میرے سوا انارکلی سے گزرنے والے ہر ذی عزت آدمی نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ لاہور کے ایک لحیم شحیم جنٹلمین کی گردن نکٹائی اور مکلّف کالر کے سبب میرے چھوٹے بھائی کے پالتو کتے ٹائیگر کی گردن کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان سوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''لوگ سچ مچ مفلس ہو گئے ہیں... اس مہینے نہ معلوم کتنا سونا چاندی ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔'' کانٹوں کی دکان پر میں نے کئی جوڑیاں کانٹے دیکھے۔ اپنے تخیل کی پختہ کاری سے میں شمی کی کافوری سپید سوٹ میں ملبوس ذہنی تصویر کو کانٹے پہنا کر پسند یا ناپسند کر لیتا... کافوری سپید سوٹ... کافوری مینا کار کانٹے... کثرتِ اقسام کے باعث میں ایک بھی منتخب نہ کر سکا۔

اس وقت بازار میں مجھے یزدانی مل گیا۔ وہ تفریح کلب سے، جو دراصل پریل کلب تھی، پندرہ روپے جیت کر آیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر اگر سرخی اور بشاشت کی لہریں دکھائی دیتی تھیں تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ میں ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی سلوٹوں کو چھپانے لگا۔ نچلی بائیں جیب پر ایک روپے کے برابر، کوٹ سے ملتے ہوئے رنگ کا پیوند بہت ہی

صرف اظہارِ تشکر کے لیے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی کے پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن میں پھولتی ہوئی کچوریوں کے دھوئیں میں سرخ امرتیاں جگر پر داغ لگا رہی تھیں... اور ذہن میں پشپامنی کی دھندلی سی تصویر پھر گئی۔ میں وہاں سے بادامی باغ کی طرف چل دیا اور آدھ پون گھنٹے کے قریب بادامی باغ کی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس عرصے میں جنکشن کی طرف سے ایک مال گاڑی آئی اس کے پانچ منٹ بعد ایک شنٹ کرتا ہوا انجن، جس میں سے دہکتے ہوئے سرخ کوئلے لائن پر گر رہے تھے مگر اس وقت قریب ہی کی سالٹ ریفائنری میں سے بہت سے مزدور اوور ٹائم لگا کر لوٹ رہے تھے۔

نامووں دکھائی دے رہا تھا... میں اسے بھی ایک ہاتھ سے چھپاتا رہا۔ پھر میں نے دل میں کہا، ''کیا عجب یزدانی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھنے سے پہلے میری جیب کی سلوٹیں اور وہ روپے کے برابر کوٹ کے رنگ کا پیوند دیکھ لیا ہو''... اس کا بھی ردِعمل شروع ہوا اور میں نے دلیری سے کہا:

''مجھے کیا پرواہ ہے... یزدانی مجھے کون سی تھیلی بخش دے گا... اور اس میں بات ہی کیا ہے۔ یزدانی اور سنتا سنگھ نے بارہا مجھ سے کہا کہ وہ رفعت ذہنی کی زیادہ پروا کرتے ہیں اور ورسٹڈ کی کم!

مجھ سے کوئی پوچھے، میں ورسٹڈ کی زیادہ پروا کرتا ہوں اور رفعتِ ذہنی کی کم۔''

یزدانی رخصت ہوا اور جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گیا میں غور سے اس کے کوٹ کے نفیس ورسٹڈ کو پشت کی جانب سے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے پشپامنی کے گلاب جامن اور امرتیاں خریدنی چاہئیں۔ کہیں واپسی پر سچ مچ بھول ہی نہ جاؤں۔ گھر پہنچ کر انھیں چھپانے سے خوب تماشا رہے گا۔ مٹھائی کی دوکان پر کھولتے ہوئے روغن میں کچوریاں خوب پھول رہی تھیں۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ اسی طرح جیسے گلاب جامن کے تخیل سے پشپامنی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ قبض اور اطریفل زمانی کے خیال کے باوجود میں سفید پتھر کی میز پر کہنیاں ٹکا کر بہت رغبت سے کچوریاں کھانے لگا۔

ہاتھ دھونے کے بعد جب پیسوں کے لیے جیب ٹٹولی تو اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ دس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا!

کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بڑا سوراخ ہو رہا تھا۔ نقلی ریشم کوٹڑیاں چاٹ گئی تھیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اس جگہ جہاں ''مرانجا مرانجا اینڈ کمپنی' کا لیبل لگا ہوا تھا میرا ہاتھ باہر نکل آیا۔ نوٹ وہیں سے باہر گر گیا ہوگا۔

ایک لمحے میں یوں دکھائی دینے لگا جیسے کوئی بھولی سی بھیڑ اپنی خوبصورت پشم اتر جانے پر دکھائی دینے لگتی ہے۔

حلوائی بھانپ گیا۔ خود ہی بولا:

''کوئی بات نہیں بابو جی.. پیسے کل آ جائیں گے۔''

میں کچھ نہ بولا... کچھ بول ہی نہ سکا۔

صرف اظہارِ تشکر کے لیے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی کے پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن میں پھولتی ہوئی کچوریوں کے دھوئیں میں سے آتشیں سرخ امرتیاں جگر پر داغ لگا رہی تھیں... اور ذہن میں پشپامنی کی دھندلی سی تصویر پھر گئی۔

میں وہاں سے بادامی باغ کی طرف چل دیا اور آدھ پون گھنٹے کے قریب بادامی باغ کی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس عرصے میں جنکشن کی طرف سے ایک مال گاڑی آئی اس کے پانچ منٹ بعد ایک شنٹ کرتا ہوا انجن، جس میں سے دہکتے ہوئے سرخ کوئلے لائن پر گر رہے تھے مگر اس وقت قریب ہی کی سالٹ ریفائنری میں سے بہت سے مزدور اوور ٹائم لگا کر لوٹ رہے تھے۔ میں لائن کے ساتھ ساتھ دریا کے پل کی طرف چل دیا۔ چاندنی رات میں سردی کے باوجود کالج کے چند منچلے نوجوان کشتی چلا رہے تھے۔

''قدرت نے عجیب سزا دی ہے مجھے۔'' میں نے کہا: پشپامنی کے لیے گوٹے کی مغزی، دوسوتی، گلاب جامن اور شمی

کے لیے کافوری مینا کار کانٹے نہ خریدنے سے بڑھ کر کوئی گناہ سرزد ہوسکتا ہے؟ کس بے رحمی اور بے دردی سے میری ایک حسین مگر بہت سستی دنیا برباد کردی گئی ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی قدرت کا ایک 'شاہکار' توڑ پھوڑ کے رکھ دوں۔

... مگر پانی میں کشتی راں لڑکا کہہ رہا تھا:

''اس موسم میں تو راوی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا۔''

''سارا پانی تو اوپر سے اپر باری دوآب لے لیتی ہے.. اور یوں بھی آج کل پہاڑوں پر برف نہیں پگھلتی''... دوسرے نے کہا۔

میں ناچار گھر کی طرف لوٹا اور نہایت بے دلی سے زنجیر ہلائی۔

میری خواہش اور اندازے کے مطابق پشپامنی اور بچو ننھا بہت دیر ہوئی، دہلیز سے اٹھ کر بستروں میں جاسوئے تھے۔ شمی چولہے کے پاس شہتوت کے نیم جان کوئلوں کو تاپتی ہوئی کئی مرتبہ اونگھی اور کئی مرتبہ چونکی تھی۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کے سامنے میں نے چور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا اور لیبل کے نیچے سے نکال لیا۔ شمی سب کچھ سمجھ گئی وہ کچھ نہ بولی..... کچھ بول ہی نہ سکی۔

میں نے کوٹ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ میرے پاس ہی دیوار کا سہارا لے کر شمی بیٹھ گئی اور ہم دونوں سوئے ہوئے بچوں اور کھونٹی پر لٹکتے ہوئے گرم کوٹ کو دیکھنے لگے۔

اگر شمی نے میرا انتظار کیے بغیر وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو شاید میری حالت اتنی متغیر نہ ہوتی!

یزدانی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں پریل کھیل رہے تھے۔ انھوں نے دو دو گھونٹ پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ مگر میں نے انکار کردیا اس لیے کہ میری جیب میں دام نہیں تھے۔ سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھے بھی پلا دیا۔ شاید اس لیے کہ وہ جان گئے تھے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یا شاید اس لیے کہ وہ رفعت ذہنی کی ورسٹڈ سے زیادہ پروا کرتے تھے۔

اگر شمی نے میرا انتظار کیے بغیر وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو شاید میری حالت اتنی متغیر نہ ہوتی!

یزدانی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں پریل کھیل رہے تھے۔ انھوں نے دو دو گھونٹ پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ مگر میں نے انکار کردیا اس لیے کہ میری جیب میں دام نہیں تھے۔ سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھے بھی پلا دیا۔ شاید اس لیے کہ وہ جان گئے تھے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یا شاید اس لیے کہ وہ رفعت ذہنی کی ورسٹڈ سے زیادہ پروا کرتے تھے۔

اگر میں گھر میں اس دن شمی کو وہی کافوری سوٹ پہنے ہوئے دیکھ نہ آتا تو شاید پریل میں قسمت آزمائی کو میرا جی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہا، کاش! میری جیب میں بھی ایک دو روپے ہوتے، کیا عجب تھا کہ میں بھی بہت سے روپے بنالیتا!... مگر میری جیب میں تو کل پونے چار آنے تھے۔

یزدانی اور سنتا سنگھ نہایت عمدہ ورسٹڈ کے سوٹ پہنے نیک عالم کلب کے سیکرٹری سے جھگڑ رہے تھے نیک عالم کہہ رہا تھا کہ وہ تفریح کلب کو پریل کلب بار بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت میں نے ایک مایوس آدمی کے مخصوص انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا۔ ''بیوی بچوں کے لیے کچھ خریدنا قدرت کے نزدیک گناہ ہے اس حساب سے تو پریل کھیلنے کے لیے تو اسے اپنی گرہ سے دام دینے چاہئیں۔ ہی ہی... غی غی...''

... وہ دس روپے کا نوٹ تھا جو اس دن اندرونی جیب کہ تہہ کے سوراخ میں سے گزر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہوگیا تھا۔ اس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اس کی خواہش کے مطابق پریل وریل نہ کھیلا۔ نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر اس دن میرا انتظار کیے بغیر شمی نے وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔

ہاں، پھر چلنے لگا وہی تخیل کا دور۔ گویا ایک حسین سے حسین

یزدانی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں پریل کھیل رہے تھے۔ انھوں نے دو دو گھونٹ پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ مگر میں نے انکار کردیا اس لیے کہ میری جیب میں دام نہیں تھے۔ سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھے بھی پلا دیا۔ شاید اس لیے کہ وہ جان گئے تھے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یا شاید اس لیے کہ وہ رفعت ذہنی کی ورسٹڈ سے زیادہ پروا کرتے تھے۔ اگر میں گھر میں اس دن شمی کو وہی کافوری سوٹ پہنے ہوئے دیکھ نہ آتا تو شاید پریل میں قسمت آزمائی کو میرا جی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہا، کاش! میری جیب میں بھی ایک دو روپے ہوتے، کیا عجب تھا کہ میں بھی بہت سے روپے بنالیتا!... مگر میری جیب میں تو کل پونے چار آنے تھے۔

دنیا کی تخلیق میں دس روپے سے اوپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی۔ جب میں بہت سی چیزوں کی فہرست بنا رہا تھا۔ شمی نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پرزے پرزے کردیا اور بولی:

''اتنے قلعے مت بنایئے... پھر نوٹ کو نظر لگ جائے گی۔''

''شمی ٹھیک کہتی ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے۔''

پھر میں نے کہا۔ ''ایک بات ہے شمی! مجھے ڈر ہے کہ نوٹ پھر کہیں مجھ سے گم نہ ہوجائے۔ تمھاری کھیمو پڑوسن بازار جارہی ہے اس کے ساتھ جاکر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ۔ کافوری مینا کار کانٹے۔ ڈی ایم سی کے گولے، مغزی... اور دیکھو پوپی منا کے لیے گلاب جامن ضرور لانا... ضرور۔''

شمی نے کھیمو کے ساتھ جانا منظور کرلیا اور اس شام شمی نے کشمیرے کا ایک نہایت عمدہ سوٹ پہنا۔

بچوں کے شور و غوغا سے میری طبیعت گھبراتی ہے مگر اس دن میں دیر تک بچو ننھے کو اس کی ماں کی غیر حاضری میں بہلاتا رہا۔ وہ رسوئی سے ایندھن کی کوئلی، غسل خانے، نیم چھت پر... سب جگہ اسے ڈھونڈھتا پھرا۔ میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا:

''وہ ٹرائی سائیکل لینے گئی ہے... نہیں جانے دو، ٹرائی سائیکل گندی چیز ہوتی ہے، اخ تھو... غبارہ لائے گی، بی بی تمھارے لیے، بہت خوبصورت غبارہ..''

بچو بیٹی نے میرے سامنے تھوک دیا۔ بولی ''اے... ای... گندی..''

میں نے کہا۔ ''کوئی دیکھے گا تو... کیسا بیٹیوں جیسا بیٹا ہے۔''

پشپامنی کو بھی میں نے گود میں لے لیا اور کہا۔ ''پوپی منا... آج گلاب جامن جی بھر کر کھائے گا نا!...''

اس کے منہ میں پانی بھر آیا وہ گودی سے اتر پڑی اور بولی۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بڑا سا گلاب جامن کھا رہی ہوں۔''

بچو روتا رہا۔ پشپامنی کتھا کلی مدرا سے زیادہ حسین ناچ برآمدے میں ناچتی رہی۔

مجھے میرے تخیل کی پرواز سے کون روک سکتا تھا۔ کہیں میرے تخیل کے قلعے زمین پر نہ آرہیں۔ اس ڈر سے تو میں نے شمی کو بازار بھیجا تھا۔ میں سوچ رہا تھا شمی اب گھوڑے ہسپتال کے قریب پہنچ چکی ہوگی.. اب کالج روڈ کی نکڑ پر ہوگی... اب گندے انجمن کے پاس...

اور ایک نہایت دھیمے انداز سے زنجیر ہلی۔

شمی سچ مچ آگئی تھی دروازے پر۔

شمی اندر آتے ہوئے بولی۔ ''میں نے دو روپے کھیمو سے ادھار لے کر بھی خرچ کر ڈالے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔

پھر بچو، پوپی منا اور میں، تینوں شمی کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔

مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے میز پر بنڈل کھولا...

وہ میرے کوٹ کے لیے بہت نفیس ورسٹڈ تھا۔

پشپامنی نے کہا۔ ''بی بی! میرے گلاب جامن...؟''

شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگادی!

زیب النسا سعید

عبداللہ حسین
شخصیت و فن

مشہور ناول نگار اور افسانہ نویس عبداللہ حسین کی پیدائش 14 اگست 1931 کو راولپنڈی میں ہوئی تھی۔ ان کا اصل نام محمد خان تھا۔ والد محمد اکبر خان حکومت انگلشیہ میں اسی شہر میں ایکسائز انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت کرتے تھے، جن کا آبائی وطن پاکستان کے صوبہ سرحد کا ضلع بنوں تھا۔ عبداللہ حسین کے والدین وطن کو خیر باد کہہ کر پنجاب میں آ بسے تھے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ عبداللہ حسین اپنے والد کی پانچویں مگر آخری بیوی کی پہلی اور آخری اولاد تھے اور پانچ برس کی عمر سے ہی اپنے آبائی شہر گجرات میں رہنے لگے تھے۔ چونکہ عبداللہ حسین کے والد سرکاری ملازمت میں تھے اس وجہ سے انھیں ملک کے مختلف علاقوں میں منتقل ہونا پڑا۔ وہ راولپنڈی کے علاوہ فیروز پور اور جھنگ جیسے شہروں میں بھی رہے۔ عبداللہ حسین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی۔ محمد اکبر خان اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت اور رہن سہن پر پوری توجہ دیتے تھے اور ان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے۔ نو برس کی عمر میں عبداللہ حسین کی مذہبی درس و تدریس کے سلسلے میں صدرالدین نام کے ایک مولوی صاحب کو رکھا گیا۔ انھوں نے پرائمری کی تعلیم سناتن دھرم اسکول میں حاصل کی جو 1960 کے بعد مدرسۃ البنات کہلایا اور 1946 میں گجرات کے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1952 میں انھوں نے زمیندار کالج، گجرات سے بی ایس سی کیا۔ ان کے گھریلو حالات بہت اچھے نہیں تھے اس وجہ سے وہ اس ملک میں آگے کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اسی سال جہلم ضلع کے ڈنڈوت میں واقع ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری اور نیشنل فیکٹری میں بطور اپرینٹس کیمسٹ ملازمت اختیار کر لی۔ بعد ازاں میانوالی کے داؤد خیل میں میپل لیف سیمنٹ فیکٹری میں کیمسٹ کے عہدے پر تقرری ہوئی۔

1959 میں ان کو کولمبو پلان کا فیلوشپ ملا۔ میک ماسٹر یونیورسٹی سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کرنے کی غرض سے کناڈا جانا پڑا لیکن صرف ایک سال دو مہینے بعد ہی پاکستان لوٹ آئے جہاں ان کو پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن میں سینئر کیمسٹ کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ ان کی شادی ڈاکٹر فرحت آرا سے 1963 میں ہوئی جن سے دو اولادیں ہیں۔ ایک بیٹا علی خان اور ایک بیٹی نور فاطمہ۔ عبداللہ حسین کی طبیعت میں ٹھہراؤ یا یکسانیت کم تھی۔ وہ اپنے والد کی طرح ہمیشہ باغیانہ ذہن کی طرح کام کرتے رہے۔ ممکن ہے یہ ذہنیت بچپن کے دور کی حکومتی پالیسیوں یا برطانوی سامراج میں رونما ہونے والے واقعات یا حالات سے تجربوں کی شکل میں ان کی زندگی کا حصہ بن گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے 1965 میں پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور فاروقیہ سیمنٹ فیکٹری میں چیف کیمسٹ کی حیثیت سے ملازمت کر لی لیکن یہاں بھی وہ اپنی بے چین طبیعت کی وجہ سے زیادہ دن نہ ٹک سکے اور دسمبر 1966 میں اس فیکٹری کو بھی خیر باد کہا۔ پھر وہ پاکستان سے لندن چلے گئے وہاں برمنگھم شہر کے ایک ادارے Coal Board میں اپرینٹس کیمسٹ کی حیثیت سے 1967 میں ملازمت اختیار کی لیکن محض دو سال ہی یہ ملازمت رہی اور اسے چھوڑ دیا اور لندن کے ایک ادارے نارتھ تھامس گیس بورڈ سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن کچھ عرصے بعد قدرتی گیس کی دریافت ہوئی تو معاشی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ ہونے کے سبب ادارے نے اپنی مرضی سے ملازمت سے سبکدوش ہونے والوں کو خصوصی پیکج دینے کا اعلان کیا اور عبداللہ حسین نے 1975 میں استعفیٰ دے دیا۔ ان کے اہل خانہ کو یہاں آئے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ ایک سال بعد انھوں نے پھر پاکستان کا رخ کیا

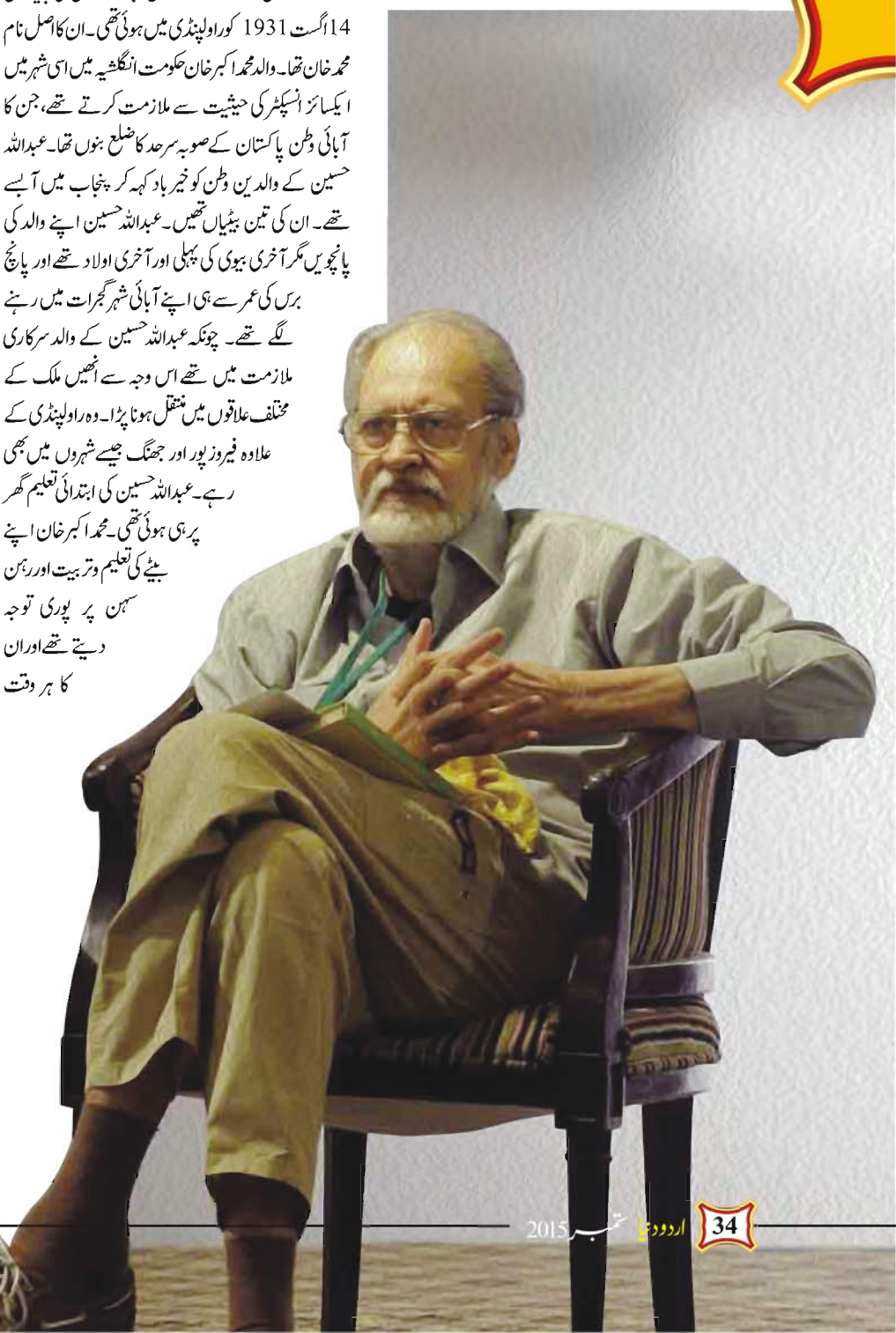

اور وہاں مستقل سکونت کا ارادہ کیا لیکن اس زمانے میں پاکستان میں سیاسی ہنگامہ آرائی اپنے عروج پر تھی۔ انھوں نے انتخاب کے دوران اپنے دوست حنیف رامے کا خوب بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا لیکن وہ الیکشن میں ہار گئے تو ان کو کافی صدمہ پہنچا۔ انتخابی سرگرمیوں کے باعث وہ نئی حکومت کی نگاہ میں بھی آ چکے تھے اس لیے مجبوراً 1977 کے درمیانی عرصے میں انگلینڈ چلے گئے۔ چند مہینوں بعد ان کی بیوی کو لیبیا کی ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی اور عبداللہ حسین پھر لیبیا کو روانہ ہو گئے۔ اب ان کو قدرے سکون حاصل تھا اور فرصت کے لمحات میسر تھے۔

یہاں یہ بتا دوں کہ عبداللہ حسین جب تعلیمی مراحل میں تھے اور گریجویشن کے لیے کالج میں گئے تھے تو وہاں انگریزی زبان سے ہی زیادہ واسطہ پڑا کیونکہ وہاں ہر مضمون انگریزی میں ہی لکھنا اور پڑھنا پڑتا تھا چاہے وہ تاریخ ہو، جغرافیہ ہو، یا اکنامکس۔ انگریزی ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے ان کو اس زبان پر دسترس حاصل ہو گئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے کئی انگریزی ناول پڑھے۔ پھر دیگر یورپی ادب کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ روسی اور فرانسیسی ناول پڑھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ترجمے خود کیے اور براہِ راست انگریزی میں بھی ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔

عبداللہ حسین کے والد کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ اپنی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کی دلچسپی شکار سے خوب بڑھی۔ معاشی حالات بہتر نہ ہونے کے سبب انھیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ گجرات میں زراعت کے لیے ان کے پاس اراضی تھی۔ کھیتی باڑی اور دیہی زندگی سے قریب تر رہنے کے باعث عبداللہ حسین کی ذہنی نشو و نما میں یہ سارے ماحول، مناظر اور حالات کارفرما رہے۔ عبداللہ حسین کو اپنے والد سے شدید محبت تھی۔ عبداللہ حسین کا کہنا تھا کہ ان کے والد کو مطالعے کا شوق تھا اور بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری بھی تھی ان کے پاس سترہ جلدوں پر مشتمل کتاب The Secrets of the court of King James موجود تھی۔ اس کتاب کا اس زمانے میں رکھنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ وہ برطانوی حکومت کے ملازم ہونے کے باوجود اپنے باغیانہ مزاج کی وجہ سے اس پابندی سے ذرا بھی خائف نہ تھے۔ جب ذہنی تربیت اور اس کی پرداخت ایسے ماحول میں ہو تو پھر عبداللہ حسین میں اس طرح کی خصوصیتوں کا در آنا لازمی تھا۔ اپنے والد سے بے پناہ محبت اور شیفتگی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

''میں اپنے والد کا اکلوتا بیٹا تھا۔ لڑکپن کے زمانے میں ان کے ہمراہ پندرہ پندرہ بیس بیس میل شکار کے پیچھے گھومتے ہوئے انھوں نے مجھے زمین اور آسمان کی ساری جاندار اور بے جان چیزوں کے بارے میں، جو کچھ وہ جانتے تھے بتایا... کھیت، فصلیں، کسان، دھوپ، بادل، بارش، چرند پرند، رنگ موسم، سب! پھر جاڑوں کی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے کی روشنی میں کمر کمر تک یخ پانی میں کھڑے بندوقیں کندھوں پر رکھے مرغابیوں کا انتظار کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے مردوں اور عورتوں... انسانوں اور آدمیوں کے بارے میں باتیں کیں۔ لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا، محبت اور نفرت اور جنس، دوستی اور دشمنی اور قربانی اور غیرت... زندگی کی دوسری بڑی بڑی باتوں کا ذکر کیا۔ جب تک وہ رہے ان کی دھیمی، متوازن، دانا آواز میرے ساتھ ساتھ رہی اور کسی شخص، کسی شے کے خوف کا سایہ بھی پاس نہ پھٹکا۔'' (نصرت، لاہور، مارچ 1964)

عبداللہ حسین کے والد کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ اپنی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کی دلچسپی شکار سے خوب بڑھی۔ معاشی حالات بہتر نہ ہونے کے سبب انھیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ گجرات میں زراعت کے لیے ان کے پاس اراضی تھی۔ کھیتی باڑی اور دیہی زندگی سے قریب تر رہنے کے باعث عبداللہ حسین کی ذہنی نشو و نما میں یہ سارے ماحول، مناظر اور حالات کارفرما رہے۔ عبداللہ حسین کو اپنے والد سے شدید محبت تھی۔ عبداللہ حسین کا کہنا تھا کہ ان کے والد کو مطالعے کا شوق تھا اور بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری بھی تھی ان کے پاس سترہ جلدوں پر مشتمل کتاب The Secrets of the court of King James موجود تھی۔

ماں کا وجود ان کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا والد کا۔ وہ اس بات پر ملول تھے کہ انھوں نے تمام زندگی صدمے جذب کیے اور کبھی کبھار تو ایسا بھی محسوس کرتے تھے جیسے وہ کوئی عظیم Shock Observer قسم کی کوئی چیز ہوں۔ انھوں نے زندگی کے تلخ حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، پرکھا اور سمجھا۔ ان سے جو بھی تجربات ملے یا تو دکھ کی شکل میں، یا کبھی صدمات کے روپ میں۔ دراصل ان سے حاصل شدہ مواخذہ سے ہی انھوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں کی بنت کاری کی۔ ان کے یہ جملے ملاحظہ فرمائیں:

''میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ماں کی کمی میری شخصیت کی تکمیل میں اتنا ہی اہم رول ادا کرتی ہے جتنا کہ والد سے میری وابستگی۔ میرے اندر ماں کی ضرورت ہمیشہ ایک دبی دبی سطح پر موجود رہی ہے جسے آپ لاشعوری سطح کہہ سکتے ہیں۔ میں نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔ وہ مجھے یاد تک نہیں لیکن یہ کمی کبھی دور نہیں ہوئی ہمیشہ موجود رہی ہے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کمی، یہ تلخی کا احساس جو لاشعوری ہے بعض وقت اس وابستگی سے زیادہ شدید ہو گیا جو مجھے والد سے تھی۔ تلخی کا یہ پرانا احساس زیادہ گہرا اور اثر دار تھا اور اس نے مجھے زیادہ متاثر کیا ہے۔ میں نے اپنے والد کا زیادہ ذکر کیا ہے کیونکہ وہ زیادہ حقیقی تھے ایک جسمانی اور حقیقی سطح پر، لیکن ماں کسی اور سطح پر، گہری سطح پر زیادہ اصلی معلوم ہوئی ہے اور پوشیدہ طاقت ثابت ہوئی ہے اور شاید زیادہ اثر دار۔ میں اس سکون اور طمانیت سے محروم رہا ہوں جو میں نے لوگوں کو اپنی ماؤں سے حاصل کرتے دیکھا ہے۔ مجھے یہ سکون اور سکھ حاصل کرنے کا موقع ہی نہ ملا، یہ سکون مجھے کسی اور سے نہ مل سکا، نہ والد سے، نہ بہنوں سے۔ اس وجہ سے میرا بچپن بہت دکھ میں گزرا۔ اگر میں نے اس طرح دکھ نہ اٹھایا ہوتا تو اس طرح لکھا بھی نہ ہوتا۔ کسی اور طرح لکھا ہوتا یا شاید بالکل ہی نہ لکھتا۔ میرا یقین ہے کہ جسمانی تکلیف سے کسی قسم کی تکلیف سے کسی نہ کسی طرح کی تخلیقی چیز جنم لیتی ہے۔'' (27 فروری 1965 کی ایک گفتگو، مطبوعہ: سویرا، لاہور شمارہ 35)

عبداللہ حسین کا اصل نام تو محمد خان تھا لیکن قلمی نام اختیار کرنے کے پیچھے انھوں نے داؤد خیل کی میپل لیف سیمنٹ فیکٹری میں اپنے ساتھ دفتر میں کام کرنے والے ایک قریبی دوست طاہر عبداللہ حسین کا نام بتایا۔ یہ نام ان کو پسند آیا اور پھر وہ ادبی دنیا کے لیے عبداللہ حسین بن گئے۔

عبداللہ حسین نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کہانی لکھنے سے کی تھی اور باقاعدہ اشاعتی سلسلہ 1962 میں رسالہ 'سویرا' لاہور میں شائع ہونے والی کہانی 'ندی' سے ہوتا ہے۔ ندی کی اشاعت کے ایک برس بعد اسی رسالے میں ان کی تین کہانیاں سمندر، جلاوطن، پھول کا بدن شائع ہوئیں۔ 1963 میں عبداللہ حسین کی ایک اور کہانی 'دھوپ' چھپی۔ پھر انھوں نے ایک طویل خاموشی اختیار کر لی۔

27 فروری 1965 کی ایک گفتگو (مطبوعہ سویرا، لاہور، شمارہ 35) میں عبداللہ حسین نے کہانی لکھنے کے اپنے شروعاتی دور کی دلچسپی کے تعلق سے کہا تھا:

''یہ جو لکھنے کا معاملہ ہے، یہ میں نے بہت پہلے سے شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنی پہلی کہانی وقت لکھی تھی جب میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔ وہ کچھ ایسی تھی کہ، ایک ہمارے بھائی ہیں، ایک ہماری بھابی ہیں اور ایک بھابی کی بہن ہیں۔ وہ ہمارے گھر آئیں اور میں ان سے ملا۔ Boy Meets Girl قسم کی رومانی چیز تھی۔ اس کا نام بھی مجھے یاد ہے۔

'سورج کی کرنیں' یہ کہانی بہت عرصے تک میرے پاس رہی، پھر پتہ نہیں کہاں گئی۔ اس کے بعد میں نے ایک اور کہانی لکھی اس میں بھی بھائی کا ذکر تھا۔ حالانکہ میرا کوئی بھائی نہیں لیکن پتہ نہیں کیا چکر تھا، میرے ذہن میں۔ خیر، کہانی میں یہ تھا کہ بھائی کی جہاں شادی ہوئی ہے، میں اس گھر میں جاتا ہوں۔ کہانی صیغہ واحد متکلم میں تھی اور وہاں دو بہنیں ہیں۔ ایک بڑی ہے مجھ سے اور ایک چھوٹی ہے اور دونوں مجھے ایک طرح سے seduce کرتی ہیں یا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بس ایسی ہی کچھ کہانی تھی۔ مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں۔ یہ کہانی چھپی بھی تھی۔ میں لاہور میں فرسٹ ائیر میں پڑھتا تھا۔ لاہور سے ایک زمانے میں بڑا ادبیات سا رسالہ نکلا کرتا تھا جس کا نام 'حسن پرست' تھا۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی خراب چیز میں نے اس زمانے میں لکھی ہے تو اب میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ میں نے نہیں لکھی۔''

''وہ میری پہلی کہانی تھی جو چھپی۔ اس کے چند سال بعد میں نے تین کہانیاں اور لکھیں۔ اس وقت میں بی ایس سی میں پڑھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ ان کہانیوں میں کیا تھا، بہرحال وہ تین تھیں۔ ان دنوں 'نقوش' نیا نیا نکلا تھا۔ ہم نے پڑھا، بڑا پسند آیا۔ وہ تینوں کہانیاں ان کو بھیج دیں۔ نقوش کے مدیر نے کہانیاں واپس کر دیں اور کوئی اس قسم کی بات لکھی کہ ''آپ کو لکھنے کی سمجھ تو ہے لیکن سلیقہ نہیں۔'' یا ''لکھنے کا سلیقہ تو ہے لیکن سمجھ نہیں'' اور ''ذرا مشق کریں۔'' بہرحال ہم بڑے بددل ہوئے کہ اپنی طرف سے ہم نے بڑی شاہکار کہانیاں لکھیں اور کچھ بھی نہیں ہوا۔

پھر تین چار سال اسی طرح گزر گئے۔''

1956 میں والد کے انتقال سے عبداللہ حسین کو شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوئے۔ انھوں نے کہا تھا:

''1956 میں والد فوت ہوئے، پھر میں بیمار ہو گیا، اسپتال میں رہا۔ جب میں ٹھیک ہو گیا تو میں نے مئی میں یہ ناول (اداس نسلیں) لکھنا شروع کیا۔''

'اداس نسلیں' لکھنے کے لیے عبداللہ حسین نے مواد کی فراہمی کا کام جون 1956 سے ہی شروع کر دیا تھا۔ وہ پانچ سال تک اس پر محنت کرتے رہے اور مئی 1961 میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچا لیکن اس کی اشاعت 1963 میں عمل میں آئی۔ اس ناول میں تین نسلوں کے کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ اس ناول کے پلاٹ اور مرکزی خیال کے بارے میں ان کا کہنا تھا:

''اس کا جو پلاٹ ہے، مرکزی پلاٹ، وہ شروع سے آخر تک ایک ہی دفعہ میرے ذہن میں آیا تھا۔ جب لکھنا شروع کیا تھا اس وقت یہ میرے لیے اتنی اہم نہ تھی، پھر میں نے باقاعدہ اس بارے میں پڑھنا شروع کیا۔ کتابیں پڑھیں، لوگوں سے ملا، شروع کے کئی باب لکھنے کے بعد کی بات ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ پہلی جنگ عظیم جہاں سے شروع ہوتی ہے وہاں تک لکھنے کے بعد کی بات ہے۔ میں نے باقاعدہ تاریخ پڑھی، اپنے عہد کی تاریخ، جنگ کے سلسلے میں بڑے دور دور کے گاؤں میں جا کر پرانے پرانے سپاہیوں سے ملا۔''

عبداللہ حسین کے اس ناول کو لکھنے کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ ایک صوبے دار خداداد خان سے ملنے کے لیے جنھیں پہلی جنگ عظیم میں وکٹوریہ کراس ملا تھا، پندرہ میل پیدل چلنا پڑا۔ عبداللہ حسین چاہتے تھے کہ ناول میں حقیقی واقعات بھی شامل ہوں۔ وہ اس زمانے کے حقائق کو اس انداز سے فکشنائز کرنا چاہتے تھے کہ تاریخی وقوعے سامنے آ جائیں۔ تاریخ کے

1956 میں والد کے انتقال سے عبداللہ حسین کو شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوئے۔ انھوں نے کہا تھا: ''1956 میں والد فوت ہوئے، پھر میں بیمار ہو گیا، اسپتال میں رہا۔ جب میں ٹھیک ہو گیا تو میں نے مئی میں یہ ناول (اداس نسلیں) لکھنا شروع کیا۔'' 'اداس نسلیں' لکھنے کے لیے عبداللہ حسین نے مواد کی فراہمی کا کام جون 1956 سے ہی شروع کر دیا تھا۔ وہ پانچ سال تک اس پر محنت کرتے رہے اور مئی 1961 میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچا لیکن اس کی اشاعت 1963 میں عمل میں آئی۔ اس ناول میں تین نسلوں کے کوائف بیان کیے گئے ہیں۔

اوراق کا مطالعہ ان کا ذوق وشوق بن گیا اور انھوں نے کافی کتابیں پڑھیں۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کو بھی پڑھا۔ بعض انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ اداس نسلیں کو بہت شعوری طور پر تاریخی ناول سمجھ کر نہیں لکھا اور ان کا خیال ہے کہ نہ ہی یہ تاریخی ناول ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بنیادی طور پر اس ناول کو ایک محبت کی کہانی Love Story سمجھ کر لکھا تھا اور آخر وقت تک ان کے ذہن میں یہی تصور تھا۔

یونیسکو نے 'اداس نسلیں' کو انگریزی ترجمے کے لیے منتخب کیا۔ انگلینڈ میں اپنے دوران قیام عبداللہ حسین نے 'اداس نسلیں' کا انگریزی ترجمہ The Weary Generations کے نام سے کیا تھا۔ اس کی اشاعت سے انگریزی حلقوں میں بھی اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔

ہندوستان میں ہارپر کولنز نے اسے چھاپا انگریزی میں انھوں نے Emigre Journeys کے نام سے ایک ناول لکھا جو شائع ہو چکا ہے اس ناول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ان کے افسانے 'واپسی کا سفر' کی توسیعی اور تفصیلی شکل ہے۔ افغانستان کو موضوع بنا کر انھوں نے ایک ناول The Afghan Girl کے نام سے بھی انگریزی میں لکھا۔

عبداللہ حسین کی اصل پہچان ان کے ناول 'اداس نسلیں' سے ہے جس کے متعدد ایڈیشن چھپے۔ بلاشبہ یہ ناول عالمی ادب کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس ناول کے حوالے سے سلیم اختر نے بڑے پتے کی بات کی ہے:

''آج عبداللہ حسین بطور ناول نگار جس بلند مقام پر نظر آتا ہے وہ پبلک ریلشننگ کی بدولت نہیں، نہ اس نے اپنے گروپ کی تشکیل کی اور نہ ہی وہ کسی گروپ کے سربراہ کا ادبی مزارع بنا بلکہ عبداللہ حسین جیسے سچ بولنے والی کی تو پبلک ریلیشننگ ہو ہی نہیں سکتی۔''

عبداللہ حسین نے 'اداس نسلیں' کے بعد چار ناول اور بھی لکھے۔ 1982 میں 'باگھ'، 1989 میں 'قید' 1994 میں 'رات'، 1996 میں 'نادار لوگ'۔

ناول 'نادار لوگ' کا دوسرا حصہ بھی وہ لکھ رہے تھے اور اس کا نام بھی 'آزاد لوگ' تجویز کر چکے تھے لیکن اسے مکمل نہ کر سکے۔ اب بس لکھا ہوا حصہ ہی منتظر اشاعت ہے۔ ان کے ناولٹ 'واپسی کا سفر' پر Brothers in Trouble کے نام سے فیچر فلم بھی بنی جس کو بی بی سی نے تیار کیا تھا جس میں بالی ووڈ کے اداکاروں کے ساتھ ہندوستان کے مشہور فیچر فلم اداکار اوم پوری نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کو یونان فلم فیسٹول میں اول انعام ملا تھا۔

1981 میں عبداللہ حسین کی کتاب 'نشیب' منظر عام پر آئی جس میں پانچ افسانے اور دو ناولٹ شامل ہیں۔ (افسانے: (1) جلاوطن (2) ندی (3) سمندر (4) دھوپ (5) مہاجرین، ناولٹ: (1) نشیب (2) واپسی کا سفر۔ 2012 میں چھ افسانوں پر مشتمل ایک مجموعہ 'فریب' کے نام سے چھپا۔

افسوس اس کا ہے کہ ان کے افسانوں کے تناظر میں ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین نہیں کیا جاتا جبکہ ان کے افسانے اور ناولٹ بھی اہم ادبی معیار کے حامل ہیں۔ اپنے مختصر لیکن جامع، تاریخی ادبی سفر کے لیے عبداللہ حسین ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اردو فکشن کا اتنا بڑا نابغۂ روزگار 4 جولائی 2015 کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔

Dr. Zaibun Nisa Saeed, Dept of Urdu, C.M.P Degree College (Allahabad University) Allahabad-211002 (UP)

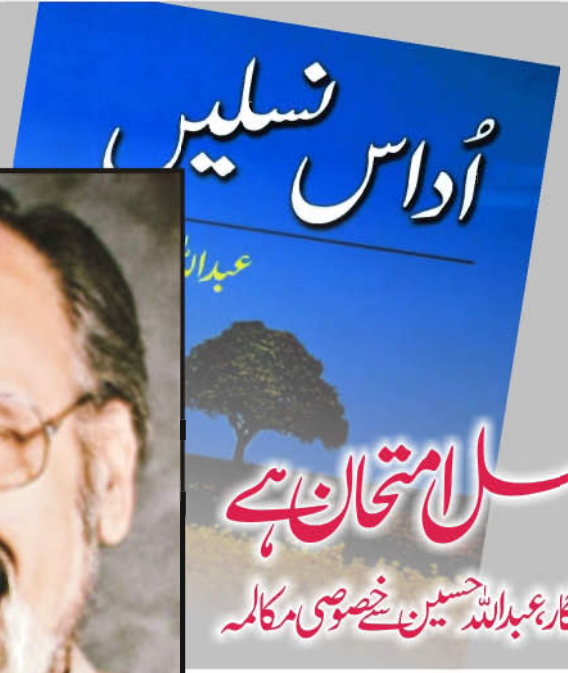

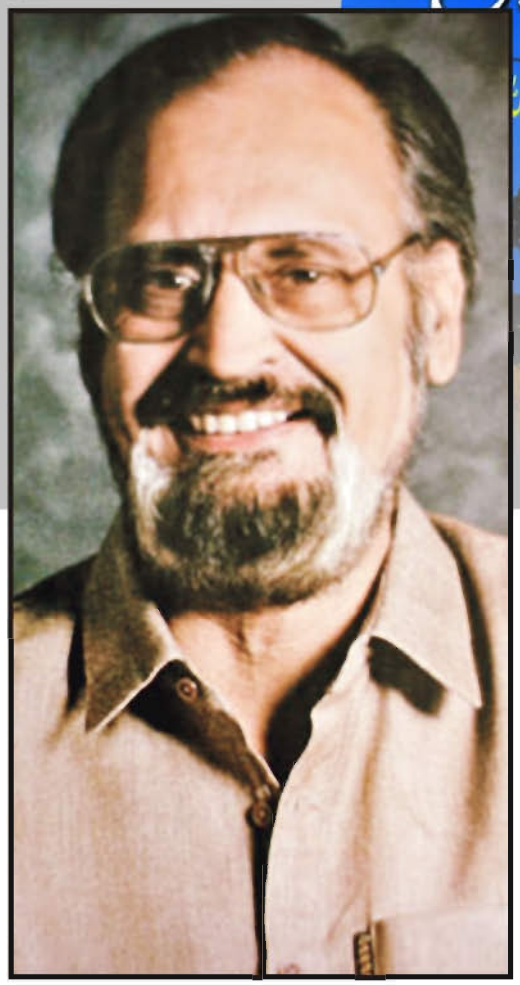

اقبال خورشید

وقت ناول کا اصل امتحان ہے

اُداس نسلوں کے قصہ گو ممتاز فکشن نگار، عبداللہ حسین سے خصوصی مکالمہ

یہ محبت سے جنم لینے والی سردیوں کی بے انت تنہائی تھی، جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں نے خود کو ایک طویل حزنیہ کے حوالے کر دیا اور بعد میں اس فیصلے پر جشن منایا۔

'اداس نسلیں' سے گزرنے کے بعد تین انکشافات ہوئے۔ پہلا: یہ پرقوت ماجرا محبت، جنگ اور ہجرت کے نئے گوشے آشکار کرتا ہے۔ دوسرا: قارئین کو اسے دوبارہ پڑھنے سے باز رکھنا ناقدین کے بس کی بات نہیں اور تیسرا: یہ آپ کو گرویدہ بنا سکتا ہے۔

البتہ اس کے مصنف سے یوں روبرو ہونے کی خواہش کہ غیر مربوط سوالات سے اُسے تھکا سکوں تب پیدا ہوئی، جب 'باگھ' کی دوسری قرات کے دوران میں نے جانا کہ بیرونی جبر سے گندھا یہ قصہ ہر اس ناول کے مقابلے میں، جو کبھی میں نے پڑھا، خود کو پڑھوانے کی زیادہ قوت رکھتا ہے۔ اس کی بہ ظاہر سادہ، مگر جاوداں نثر میں بہاؤ ہے۔ زندگی کے ناگزیر حقائق بیان کرنے کے لیے ناول نگار نے ایک ایسا جال بچھایا ہے، جو پہلی سطر پڑھتے ہی آپ پر آن گرتا ہے:

''رات کو اسدی۔'' یاسمین نے کہا تھا۔ صبح کی روشنی میں اُس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

یہ محبت کے نام ونشاں پیدا کرنے والے عبداللہ حسین کا تذکرہ ہے، جو ان کے راستے میں دکھائی دیتے ہیں، اور کبھی ماند نہیں پڑتے۔

دبدبہ وہ پہلا احساس ہے، جو عبداللہ حسین سے متعلق مجھ میں پیدا ہوا، جسے اخبارات اور ویب سائٹس پر شائع ہونے والی اُن کی تصاویر نے مہمیز کیا، اور ایک مودبانہ فاصلہ میں نے ضروری جانا۔ یہ کچھ برس قبل لاہور میں ہونے والی ایکسپریس اردو کانفرنس تھی، جس کی بھاگ دوڑ نے مجھے ٹیلی فون لائن کے ذریعے اُن سے جوڑ دیا۔ اُدھر لاہور میں بھی سامنا ہوا، پر مودبانہ فاصلہ قائم رہا۔ پہلی دراز اُس پل پڑی، جب سیشن کے تمام اسپیکرز کے بعد، جو پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھے، عبداللہ حسین نے، جو صدارت کے منصب پر فائز کیے گئے، مائیک سنبھالا اور کہا: ''آج متعلقہ موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔'' اور ایک لمحے کا مسکراتا توقف کیا: ''اب اس لفظ سیر حاصل کا مطلب مجھے نہیں آتا!''

ہاں، یہ تب تھا، جب میں نے اداس اور نادار لوگوں کی کہانی بیان کرنے والے اس قد آور فکشن نگار میں شگوفے کھلتے دیکھے۔ اس فاصلے کو کم کرنے میں کراچی کی ایک کانفرنس میں مستنصر حسین تارڑ کے گرد گھومتے اُس سیشن کا بھی کچھ ہاتھ ہے، جس میں اسٹیج پر موجود عبداللہ حسین کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے، صاحب مجلس سمیت، پورا ہال اٹھ کھڑا ہوا۔ محمد حنیف کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جس نے دوران انٹرویو انھیں اس عہد کا سب سے 'غیر اداس' مصنف قرار دیا۔

تو عبداللہ حسین کے تخلیق کردہ پرتاثیر ادب کے بعد، یہی وہ عوامل تھے، جن کے باعث کراچی کی ایک معتدل صبح جب میں نے اُنھیں، چھڑی ٹیکتے، آرٹس کونسل میں داخل ہوتے دیکھا، تو ان کا تعاقب خود پر لازم کیا اور جانا کہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس یہ ادیب حقیقی معنوں میں انتہائی غیر اداس ہے۔ ایک زندہ دل انسان۔

یہ اُس مکالمے کی کہانی ہے، جو ٹکڑوں میں بٹا، جس کی تکمیل کے دوران جگہیں بھی تبدیل ہوئیں، پر یہ دھیرے دھیرے، فطری لاابالی پن کے ساتھ، آگے بڑھتا رہا۔ اس میں آف دی ریکارڈ باتیں ہوئیں، قہقہے لگے، اور ایک لمحے کو اُن کے فہمائشی انداز سے روبرو ہونے کا بھی موقع ہاتھ آیا۔

عبداللہ حسین تخلیقی ادب کو ایک حد تک ذاتی شے تصور کرتے ہیں، مگر ابلاغ کی اہمیت کے قائل ہیں۔ یہی وہ کلیہ ہے، جس پر وہ حتی الامکان کاربند رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

Afghan Girl کے نام سے ایک ناول زیر طبع ہے۔ سینئر مترجم، محمد عمر میمن کے قلم سے ان کی نگارشات کے تراجم Stories of Exile and Alienation اور Night & other stories کے عنوان سے انگریزی میں چھپ چکے ہیں۔

اب گفتگو پیش خدمت ہے:

اقبال: آپ انتہائی خوش باش، زندہ دل آدمی، اور تذکرہ اداس نسلوں کا کرتے رہے؟

عبداللہ حسین: مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی۔ جو لوگ تبصرہ وغیرہ کرتے ہیں، سب ہی نے یہ لکھا کہ میری تحریر، میرے کرداروں میں یاسیت ہے، غم زدگی ہے، ٹریجڈی ہے۔ البتہ یہ میرا Temperament نہیں۔ میں تو ایک خوش دل آدمی ہوں۔ ہر وقت ہنستا رہتا ہوں۔ لوگوں کو تجزیہ کرنا چاہیے کہ میرے مزاج اور میرے کرداروں میں یہ فرق کیوں ہے۔

اقبال: کیا آپ نے خود بھی یہ فرق محسوس کیا یا یہ فقط ناقدین

کی رائے ہے؟

عبداللہ حسین: میں اس بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا، مگر ہر ایک نے یہی کہا ہے۔ (ہنستے ہوئے) اب لوگ کہتے ہیں، تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

اقبال: آپ مختلف سیمینارز میں یہ کہتے نظر آئے کہ آپ اردو نہیں جانتے، جس زبان میں کئی شہ پارے تخلیق کیے، اس زبان سے لاعلمی کے اظہار کا سبب؟

عبداللہ حسین: ہم نے آٹھویں تک اردو پڑھی۔ پھر انگریزی پڑھنا شروع کی۔ سب یہی کہتے تھے کہ انگریزی پڑھو گے، تو نوکری ملے گی۔

اقبال: آپ کے والد بھی یہی کہا کرتے تھے کہ انگریزی پڑھو ورنہ نیکر پہن کر چائے بیچنی پڑے گی۔

عبداللہ حسین: (ہنستے ہوئے) یہ بھی ایک اسٹوری ہے۔ انھوں نے 1899 میں میٹرک کیا تھا۔ ان کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ گورنمنٹ سروس میں تھے۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ انگریزی پڑھو۔ ورنہ دیکھا ہے نا کہ اسٹیشنوں پر لوگ میلی سی نیکر پہن کر چائے بیچتے ہیں، تم بھی نیکر پہن کر چائے بیچو گے۔ اب چائے بیچنے میں تو مجھے کوئی عار نہیں تھا، مگر نیکر پہننے والوں کا جو نقشہ میرے ذہن میں آتا تھا، وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ تو میں نے انگریزی پڑھنے کی شروعات کی۔ اگلے بیس پچیس سال تک انگریزی پڑھی۔ کالج میں ہمارے ایک پروفیسر تھے، سعید خان۔ انھوں نے کہا: میں پورے سال آپ کو کچھ نہیں پڑھاؤں گا۔ یہ دس ناولوں کی لسٹ ہے۔ ان میں سے کوئی تین پڑھ لیں۔ آخر میں ان ہی سے متعلق پوچھوں گا۔ اگر پڑھے ہوں گے تو اپنے مضمون میں پاس کرادوں گا۔ تو اس طرح یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

اقبال: تو جب ناول لکھنے بیٹھے، اور جہاں اردو لفظ نہیں سوجھا، وہاں انگریزی یا پنجابی کا لفظ لکھ دیا؟

عبداللہ حسین: ہاں، جب مجھے کوئی لفظ نہیں آتا، تو میں اپنا لفظ بنا لیا کرتا تھا۔ بعد میں کچھ لوگوں نے کہا کہ عبداللہ حسین نے پنجابی میں ناول لکھا ہے مگر جو کچھ مناسب قسم کے لوگ تھے، انھوں نے کہا کہ ان کی اردو پر انگریزی اور پنجابی کا گہرا اثر ہے۔ شاید یہ بات بھی درست ہے۔

اقبال: 'اداس نسلیں' کے نعیم کا شمار اردو ناول کے یادگار کرداروں میں ہوتا ہے۔ اوائل میں فکشن نگار کے سامنے اپنی ہی شخصیت ہوتی ہے تو نعیم میں کہیں عبداللہ حسین بھی تھا؟

عبداللہ حسین: مجھ میں اور دیگر ناول نگاروں میں ایک فرق ہے۔ جتنے بھی ناول نگار ہیں، بشمول انگریزی کے، اکثریت کے پہلے ناول میں سوانحی عنصر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا تجربہ وہی ہوتا ہے جسے وہ بیان کرتے ہیں۔ پھر اگر وہ مزید لکھیں، تو ان میں دوسروں کو موضوع بناتے ہیں۔ میں نے انگریزی کے ناول بھی بہت پڑھے ہیں، ان پر تنقید بھی پڑھی ہے۔ تو بیشتر پہلے ناولوں میں واضح آٹوبائیوگرافیکل عنصر ملتا ہے مگر میرے کسی ناول میں یہ عنصر نہیں۔ ہاں، ایک دو کہانیوں میں ہے، جیسے 'نشیب' کی کہانیاں۔ لیکن ناولوں میں ایسا کچھ نہیں۔ میں نے دوسروں کو اپنا کردار بنایا، اور یہ شعوری طور پر نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ اچھے فکشن میں لکھنے والے کو غیر حاضر رہنا چاہیے۔

اقبال: گذشتہ پانچ عشروں نے 'اداس نسلیں' کی شہرت کو مہمیز کیا۔ آپ کو لگتا ہے کہ اس کی شہرت کے باعث 'باگھ' اور دیگر ناول نمایاں نہیں ہوسکے؟

عبداللہ حسین: ہاں، یہ درست ہے۔ مجھے اپنے ناولوں

مجھ میں اور دیگر ناول نگاروں میں ایک فرق ہے۔ جتنے بھی ناول نگار ہیں، بشمول انگریزی کے، اکثریت کے پہلے ناول میں سوانحی عنصر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا تجربہ وہی ہوتا ہے جسے وہ بیان کرتے ہیں۔ پھر اگر وہ مزید لکھیں، تو ان میں دوسروں کو موضوع بناتے ہیں۔ میں نے انگریزی کے ناول بھی بہت پڑھے ہیں، ان پر تنقید بھی پڑھی ہے۔ تو بیشتر پہلے ناولوں میں واضح آٹوبائیوگرافیکل عنصر ملتا ہے مگر میرے کسی ناول میں یہ عنصر نہیں۔ ہاں، ایک دو کہانیوں میں ہے، جیسے 'نشیب' کی کہانیاں۔

میں 'باگھ' زیادہ پسند ہے۔ اب لوگ اس کا تذکرہ کرنے لگے ہیں۔ مگر شروع میں جب 'باگھ' لکھا، 'نادار لوگ' لکھا، تو وہ 'اداس نسلیں' کے سائے میں آگئے۔ پیچھے چلے گئے۔

اقبال: 'باگھ' اور 'اداس نسلیں' کے درمیانی وقفے کے بارے میں کچھ فرمائیں؟

عبداللہ حسین: یہ بھی ایک کہانی ہے۔ ناول شائع ہونے کے بعد میں راتوں رات مشہور ہوگیا۔ اشاعت کے اگلے دن سے میرا شمار مشہور رائٹرز میں ہونے لگا۔ پھر میں سب چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا۔ لوگوں نے، میرے اپنے خاندان والوں نے کہا کہ آپ کیوں جارہے ہیں؟ آپ اتنے مشہور ہیں، کوئی رسالہ نکالیں۔ اس کے ایڈیٹر بن جائیں۔ بہت سے ادیب آپ کے اردگرد آجائیں گے، پھر ایک اخبار نکالیں۔ آپ سیاست میں جاسکتے ہیں۔ ملک میں بہت بڑی پوزیشن بن جائے گی۔ لیکن مجھے ان باتوں میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ میں انگلینڈ چلا گیا۔ میں نے ایک بڑے ناول نگار کا مقولہ پڑھ رکھا تھا: You are only as good as your second novel۔ یعنی آپ کا دوسرا ناول اچھا ہے، تو پھر آپ اچھے ناول نگار ہیں۔ ورنہ ایک ناول تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔ تو میں نے ارادہ کرلیا کہ میں اس وقت تک دوسرا ناول نہیں لکھوں گا، جب تک یہ احساس نہ ہوجائے کہ میں پوری طرح تیار ہوں۔ تو تیرہ برس تک ایک لفظ نہیں لکھا۔ جب میں تیار ہوگیا، تو میں نے 'باگھ' لکھا اور مجھے احساس تھا کہ جو انتظار کیا ہے، وہ ٹھیک ہے۔ اگر میں فوراً دو تین فضول ناول لکھ لیتا، تو بات نہ بنتی۔

اقبال: 'اداس نسلیں' اور 'باگھ' کی زبان میں فرق نظر آتا ہے، باگھ زیادہ چست اور گٹھا ہوا ہے۔

عبداللہ حسین: آپ نے بہت اچھا لفظ کہا: گٹھا ہوا۔ ہاں، وہ زیادہ توجہ کے ساتھ لکھا گیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ مجھے انگلینڈ میں رہتے اتنے برس ہوگئے تھے، مگر میں نے 'باگھ' میں انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ جب ناول چھپ گیا تو لوگوں نے کہا عبداللہ حسین کئی سال سے باہر رہ رہے ہیں، مگر ناول پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ آدمی اپنے گاؤں سے باہر نہیں نکلا۔ دراصل اگر آپ ناول نگاری کے آرٹ کے مطابق لکھیں، تو ناول بنتا ہے۔ 'نشیب' کے دیباچے میں میں نے لکھا ادب ایک طویل المیعاد کام ہے، ناول کا اصل امتحان وقت ہے۔ نقاد یا تبصرہ نگار جو مرضی کہتے رہیں، فرق نہیں پڑتا۔ اگر بیس تیس سال بعد تحریر پڑھی جارہی ہے، تو پھر ٹھیک ہے۔ اگر غائب ہوجاتی ہے تو پھر اچھی نہیں۔

اقبال: آپ نے متعدد بار 'اداس نسلیں' کو محبت کی کہانی قرار دیا۔

عبداللہ حسین: ہاں، یہ میں نے کہا تھا۔ میں آپ کے لیے محبت کی تعریف کرنا چاہوں گا۔ وہ یہ نہیں ہے کہ آپ کے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی ہے، آپ کا اور اس کا رابطہ ہوجاتا ہے۔ آپ کے گھر والے ان کے ہاں رشتہ لے جاتے ہیں۔ وہ بھی راضی ہوجاتے ہیں۔ آپ کی شادی ہوگئی۔ آپ بھی خوش، گھر اور محلے والے بھی خوش اور لوگ کہتے ہیں، یہ محبت کی شادی ہے۔ This is nonsense۔ محبت کی تعریف یہ ہے کہ آپ اس کی خاطر کس کس شے کی قربانی دے سکتے ہیں۔ 'اداس نسلیں' میں عذرا ایک نواب کی بیٹی ہے، نعیم ایک کسان کا بیٹا، جس کے پاس کسی قسم کے وسائل نہیں۔ اس کے لیے عذرا اپنے پورے خاندان سے، اپنی کلاس سے بغاوت کرکے سب کچھ چھوڑ دیتی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ What are you prepared to give up? تو اس نے

نعیم کے لیے، جس کا بازو بھی کٹا ہوا تھا، سب کچھ چھوڑ دیا۔ یہ تھی محبت کی شادی۔

اقبال: اس میں طبقاتی تقسیم کو بھی آپ نے منظر کیا؟

عبداللہ حسین: (ذرا لاتعلقی سے) ہاں، طبقاتی تقسیم بھی کہانی میں آتی ہے۔ نعیم کا بھائی علی کارخانوں میں کام کرتا ہے۔ عذرا نے اپنے طبقے سے بغاوت کی تھی۔ تو یہ ہے۔

اقبال: ناول کی تفہیم میں ناول نگار سے رجوع کرنے کے آپ خلاف ہیں؟

عبداللہ حسین: دراصل ناول نگار سے اس کے ناول کے بارے میں سوال کرنا مجھے عجیب لگتا ہے۔ ناول نگار نے لکھ دیا، لوگ اپنی سوچ کے مطابق پڑھیں، اُس کا تجزیہ کریں۔ جتنا آپ نے ادب کا علم حاصل کیا ہوگا، اتنا اچھا تجزیہ ہوگا۔ اگر آپ ایم اے کر لیتے ہیں، اگلے پانچ چھ برس اپنا اور باقی دنیا کا ادب پڑھتے ہیں، تو تھوڑا بہت علم آ جاتا ہے۔ اگلے بیس سال مستقل پڑھتے رہے، تو اور علم آ گیا۔ جتنا زیادہ ادب کا علم ہوگا، اتنا اچھا تجزیہ ہوگا۔ قاری کو خود ہی تجزیہ کرنا چاہیے۔ ناول نگار سے پوچھنا زیادتی ہے۔ اب مجھے نہیں پتا کہ میرے ناول اور کہانیاں کہاں اور کیسے پیدا ہوئے۔ لکھنے والا خاص طور پر فکشن لکھنے والا بہت سی باتوں سے لاعلم ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کہانیاں کہاں سے آئیں؟ کیسے پھیلتی چلی گئیں۔ اس سے سائنسی انداز میں سوال نہیں کیا جا سکتا۔ لکھنے والے کو بہت سی باتوں کا پتا نہیں ہوتا۔ فکشن میں دو جمع دو کا نتیجہ چھ بھی آ سکتا ہے اور پانچ بھی۔

اقبال: تو یہ اس کی Instinct ہے، جبلت، ایک غیر اختیاری رجحان۔

عبداللہ حسین: ہاں۔ اور یہ صلاحیت صرف فکشن نگار میں نہیں، دیگر تخلیق کاروں میں بھی ہوتی ہے۔ مصرع یا نئی کہانی ذہن میں کیسے پھوٹتی ہے؟ گھاس کا پتا کیسے نکلتا ہے؟ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ ایک سائنس داں کے دماغ میں پہلا خیال کیسے آتا ہے۔ ہاں، بعد میں تحقیق کر کے اُسے دریافت کر لیا جاتا ہے، مگر آپ اس کے ذہن میں جنم لینے والے پہلے خیال کے بارے میں پوچھیں، تو وہ (سائنس داں) اُس کا جواب اطمینان بخش نہیں دے سکے گا تو ادب میں دو جمع دو چار کا کلیہ کام نہیں کرتا۔

اقبال: آپ مغرب میں رہے، وہاں ادیب کو جو احترام ملتا ہے، یہاں اس کا فقدان ہے۔ اس کا سبب؟

عبداللہ حسین: ہمارا معاشرہ بالکل فضول ہے۔ لڑائی، جھگڑے چل رہے ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے خدا حافظ سے اللہ حافظ ہو گیا۔ میں تو ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتا۔ ہمارے ہاں مذہب کی اصل روح ختم ہو گئی ہے، صرف رسومات رہ گئی ہیں۔ مذہبی لوگوں کی شروع سے آرٹ سے لڑائی ہے۔ پس ماندہ ممالک میں یہ رجحان غالب ہے۔ خوش حال ممالک میں یہ جھگڑا ختم ہو گیا۔ میں پاکستان کو Unreal society کہتا ہوں۔ جھوٹ، دغا بازی۔ یہاں ادیب کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اسے انسانی قدروں کو اجاگر کرنا ہے۔ (کچھ سیکنڈز کا وقفہ لیتے ہوئے) مجھے ابھی ابھی خیال آیا کہ لوگ جو کہتے ہیں، میرے کرداروں میں مایوسی اور غم زدگی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنے اردگرد انسانی قدروں کی پامالی نظر آتی ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اسے نارمل سمجھ رہے ہیں۔ شاید اس وجہ سے میرے اندر مایوسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مگر وہ میری شخصیت نہیں۔ (مسکراتے ہوئے) اب یہ ایک بالکل نئی بات میں نے بتائی ہے۔ آپ کسی اور

تحریک الگ معاملہ ہے۔ اس کے مقصد ہوتے ہیں، منشور ہوتا ہے، جہاں تک ادیب کا تعلق ہے، اس کے ہاں یہ عمل لاشعوری ہونا چاہیے۔ جس طرح ترقی پسندوں نے ایک مہم شروع کی تھی کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے، ویسا ادب تخلیق کیا جائے، وہ ناکام ہو گئی۔ یہ غیر شعوری معاملہ ہے۔ ادب اچھا ہے، تو وہ لوگوں تک پہنچے گا، اور ان کے لاشعور کا حصہ بن جائے گا۔ جب صبح آپ کی آنکھ کھلتی ہے، تو ذہن میں کوئی کہانی یا کوئی شعر منڈلا رہا ہوتا ہے۔ یعنی لاشعور میں دفن خیال نیند کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب آپ کے شعور میں اس گہرائی تک چلا گیا کہ وہ آپ کے لاشعور کا حصہ بن گیا ہے۔

پیرائے میں لکھ دیں، بہت بڑے نقاد بن جائیں گے۔

اقبال: اردو فکشن کا مستقبل آپ کو کیسا نظر آ رہا ہے؟

عبداللہ حسین: لوگوں میں لکھنے کی امنگ ہے۔ بہت سے لوگ سمجھ رہے ہیں۔ افسانے اچھے لکھے جا رہے ہیں، اور خاصے لکھے جا رہے ہیں۔ تو مستقبل تو ہے۔

اقبال: آپ نے انسانی قدروں کی تذلیل کا تذکرہ کیا، تو فکشن نگار کو ان کی نشان دہی کرنا چاہیے؟

عبداللہ حسین: ہاں۔ یہ ادیبوں، فلسفیوں اور سوشل سائنٹسٹ کا کام ہے۔ تعلیم ہی سے ہر شے نکلتی ہے۔ تعلیم سے روشنی پیدا ہوگی، تو انسانی قدریں بھی اجاگر ہوں گی۔ ان کی نشو و نما ہوگی۔ اگر تعلیم نہیں، تو ادیب بھی کوئی کردار ادا نہیں کر سکے گا۔ سوشل سائنٹسٹ تو ایک خشک قسم کا مضمون لکھ دیتا ہے، جو کچھ ہی لوگوں پر اثر کرتا ہے مگر ادیب کا کام لوگوں کے دلوں تک پہنچتا ہے۔ شاعری میں، کہانی میں ایک کشش ہوتی ہے۔ الف لیلہ کے وقت سے، شہرزاد کے وقت سے انسان کہانی سے مسخر ہے کہ اب آگے کیا ہوگا۔ اگلے موڑ پر کیا ہے۔ ادیب کا کام لوگ آسانی سے جذب کر لیتے ہیں۔ اگر وہ انسانی قدروں کے بارے میں لکھے، تو وہ موثر ثابت ہوتا ہے۔

اقبال: تو کیا ادیب کو تبدیلی کے لیے، اصلاح کے لیے ادب تخلیق کرنا چاہیے؟

عبداللہ حسین: تحریک الگ معاملہ ہے۔ اس کے مقصد ہوتے ہیں، منشور ہوتا ہے، جہاں تک ادیب کا تعلق ہے، اس کے ہاں یہ عمل لاشعوری ہونا چاہیے۔ جس طرح ترقی پسندوں نے ایک مہم شروع کی تھی کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے، ویسا ادب تخلیق کیا جائے، وہ ناکام ہو گئی۔ یہ غیر شعوری معاملہ ہے۔ ادب اچھا ہے، تو وہ لوگوں تک پہنچے گا، اور ان کے لاشعور کا حصہ بن جائے گا۔ جب صبح آپ کی آنکھ کھلتی ہے، تو ذہن میں کوئی کہانی یا کوئی شعر منڈلا رہا ہوتا ہے۔ یعنی لاشعور میں دفن خیال نیند کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب آپ کے شعور میں اس گہرائی تک چلا گیا کہ وہ آپ کے لاشعور کا حصہ بن گیا ہے۔ اسی سے تبدیلی آتی ہے۔

اقبال: 'اداس نسلیں' پڑھا گیا، سراہا گیا، مگر اس کا ترجمہ نہیں ہوا، یہ کام آپ کو خود کرنا پڑا۔ قرۃ العین حیدر کو بھی یہ مرحلہ خود ہی انجام دینا پڑا تھا...

عبداللہ حسین: ہمارے لوگ سست اور کاہل ہیں۔ محنت نہیں کرتے۔ اس لیے ہم زندگی کے کسی شعبے میں ترقی نہیں کر سکے۔ تنزلی کی طرف جا رہے ہیں، کیونکہ ہم محنت سے جی چرانے والے لوگ ہیں۔ اتنے ضخیم ناول کا ترجمہ کرنا بڑی محنت کا کام ہے۔ چالیس برس تک میں انتظار کرتا رہا۔ سب کہتے ہیں کہ جی بڑا اچھا ناول ہے۔ بھئی، اگر اچھا کہتے ہو، تو اس پر طویل تجزیاتی مضمون لکھو یا اس کا انگریزی میں ترجمہ کرو۔ تنگ آ کر میں نے خود ہی ترجمہ کیا۔

اقبال: کیا ہمارے ہاں اس معیار کے مترجم ہیں، جو اردو ادب پارے کو انگریزی میں ڈھال سکیں؟

عبداللہ حسین: ہاں ہاں، بہت اچھی انگریزی لکھنے والے لوگ ہیں۔ انگریزی اخبارات میں ٹھیک ٹھاک مقالے لکھتے ہیں، مگر ہمارے لوگ کاہل ہیں۔ غیر تخلیقی ہیں۔ آج تک ہمارے معاشرے میں کوئی تخلیقی کام نہیں ہوا۔ ہمیں کرکٹ دیکھتے ہوئے پچاس سال ہو گئے، اس عرصے میں 'پاکستان زندہ باد' کے علاوہ کوئی نعرہ ایجاد نہیں کر سکے۔ مجھے تو اس سے Nausea ہوتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں آپ دیکھیں فٹ بال کے لیے کیسے گانے لکھے گئے، نعرے بنائے گئے۔ تو یہ غیر تخلیقی لوگ ہیں۔

اقبال: آغاز ایک ضخیم ناول سے، پھر مختصر ناول، طویل مختصر افسانہ مزاج کے زیادہ قریب کیا ہے؟

عبداللہ حسین: اس وقت میرا پسندیدہ رجحان ناویلا ہے، جسے ہمارے ہاں ناولٹ کہتے ہیں۔ ناولٹ کی تعریف ہی اور ہے۔ ناولٹ ہے ڈائجسٹوں میں خواتین کے لیے رومانوی طرز پر لکھی جانے والی طویل کہانیاں۔ ناویلا سنجیدہ فکشن ہے، جو سو سے ڈیڑھ سو صفحے کا ہوتا ہے۔ آج کل میری توجہ کا مرکز یہی ہے۔

اقبال: انگریزی میں بھی ایک ناویلا لکھ رہے ہیں؟

عبداللہ حسین: جی بالکل۔ وہ مکمل کر کے ایجنٹ کو دے دیا ہے۔ اب اردو میں ایک ناویلا شروع کیا ہے۔ ساتھ چھوٹی بڑی کہانیاں لکھوں گا۔ چھ کہانیوں کا مجموعہ ہوگا۔ میرے ذہن میں اُن کے خیالات ہیں۔ ہوسکتا ہے، تین ناویلا ہوجائیں اور تین مختصر کہانیاں۔ یعنی چھ کا ہندسہ ہے۔ آج کل تو جو کچھ Rubbish لکھتا ہوں، چھپوا دیتا ہوں (قہقہہ)

اقبال: ہمارے ہاں ادیب رائلٹی کے معاملے میں شکوہ کرتے نظر آتے ہیں...

عبداللہ حسین: ایک طویل عرصے تک یہ مسئلہ رہا، مگر اب چند ادیبوں کو، جن کی کتابیں بکتی ہیں، رائلٹی ملتی ہے۔ لیکن مزے کی بات ہے کہ خود پیسے دے کر کتاب چھپوانے والے بھی بہت آگئے ہیں۔ سب کو شوق ہے کہ ان کی کتاب آجائے۔ بہت سے پبلشرز ہیں، جو کہتے ہیں؛ ہم چھاپ دیں گے، اتنے پیسے لگیں گے اور لوگ دے دیتے ہیں۔ البتہ اب رائلٹی دینے کا رواج ہوگیا ہے۔ 'سنگ میل' والوں نے سب سے پہلے شروع کیا تھا۔ مجھے اچھی رائلٹی دیتے ہیں۔ تارڑ، انتظار حسین اور دیگر کو دیتے ہیں۔ اب میری کتابیں، چاہے سے چار پانچ سال بعد آئیں، مگر ٹھیک تعداد میں بک جاتی ہیں۔

اقبال: آپ اب 83 برس کے ہوگئے، تو لکھنے کا ڈھب کیا ہے؟ دن کا وقت مقرر یا شام کا؟

عبداللہ حسین: میں کرسی پر بیٹھ کر ہاتھ سے لکھتا ہوں۔ انگریزی ٹائپ کرتا ہوں۔ وقت کوئی مقرر نہیں۔ کبھی صبح لکھتا ہوں، کبھی شام۔ میں فارغ آدمی ہوں نا۔ کہیں مجھے جانا نہیں۔ سو رہا ہوں، تو سو رہا ہوں۔ تو جو بھی وقت ملتا ہے وہی میں صرف کرتا ہوں۔

اقبال: زبیر رضوی کے پرچے 'ذہن جدید' میں اردو ادب کے پروفیسرز کے درمیان ایک سروے ہوا، جس میں 'اداس نسلیں' کو 'آگ کا دریا' پر فوقیت دیتے ہوئے اردو کی تاریخ کا بہترین ناول قرار دیا گیا۔

عبداللہ حسین: ہاں، وہ 'ذہن جدید' والوں نے کروایا تھا۔ قرۃ العین کا 'آگ کا دریا' دوسرے نمبر پر آیا تھا۔ وہ اس وقت زندہ تھیں۔ میں نے سوچا، بھئی انھیں تو بڑا صدمہ پہنچے گا۔ تو میں نے ایڈیٹر کو خط لکھا۔ میں نے کہا: لوگوں نے اس سروے میں 'اداس نسلیں' کو ووٹ دیے ہیں، ان کی نوازش، لیکن میں خود قرۃ العین حیدر کو اردو کا سب سے بڑا ناول نگار مانتا ہوں۔ ویسے انھوں نے لکھا ہی بہت ہے۔ ساری عمر یہی کام کیا۔ ہم تو ادھر اُدھر کھیلتے رہے۔ خط بھیج کر انھیں بھی اطلاع دے دی۔ وہ بھی خوش ہوگئی ہوں گی۔

اقبال: آپ دو ناولوں کے درمیان موازنے کے رجحان کو کیسے دیکھتے ہیں؟

عبداللہ حسین: ہونا تو نہیں چاہیے۔ ناولوں کا الگ الگ مزاج ہوتا ہے، مگر لوگ کرتے آرہے ہیں، انھیں اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔

اقبال: آپ کے ہم عصروں میں انتظار حسین ایک بڑا نام ہے...

ایک طویل عرصے تک یہ مسئلہ رہا، مگر اب چند ادیبوں کو، جن کی کتابیں بکتی ہیں، رائلٹی ملتی ہے۔ لیکن مزے کی بات ہے کہ خود پیسے دے کر کتاب چھپوانے والے بھی بہت آگئے ہیں۔ سب کو شوق ہے کہ ان کی کتاب آجائے۔ بہت سے پبلشرز ہیں، جو کہتے ہیں؛ ہم چھاپ دیں گے، اتنے پیسے لگیں گے اور لوگ دے دیتے ہیں۔ البتہ اب رائلٹی دینے کا رواج ہوگیا ہے۔ 'سنگ میل' والوں نے سب سے پہلے شروع کیا تھا۔ مجھے اچھی رائلٹی دیتے ہیں۔ تارڑ، انتظار حسین اور دیگر کو دیتے ہیں۔ اب میری کتابیں، چاہے سے چار پانچ سال بعد آئیں، مگر ٹھیک تعداد میں بک جاتی ہیں۔

عبداللہ حسین: میں انھیں سراہتا ہوں۔ وہ 90 سال کے ہوگئے ہیں۔ ساری عمر لکھا۔ طویل اور مختصر کہانیاں، ناول، کالم، ان کی زندگی کا اثاثہ ادب ہے اور یہ بلاشبہ قابل تعریف ہے۔ انٹرنیشنل مین بکر پرائز والوں نے انھیں زندگی بھر کے کام پر چنا ہے۔

اقبال: اردو ناول پر بات ہو، تو تذکرہ 'آگ کا دریا' اور 'اداس نسلیں' سے آگے نہیں بڑھتا، کیا اور کوئی اچھا نہیں لکھا گیا؟

عبداللہ حسین: لکھے گئے ہیں، اچھے ہیں۔ چند میں نے پڑھے بھی ہیں۔ مرزا اطہر بیگ نے دو ناول بہت اچھے لکھے۔ مستنصر حسین تارڑ نے کم از کم دو ناول اچھے لکھے ہیں۔ عاصم بٹ کا پہلا ناول اچھا ہے۔

اقبال: ادب کے شائقین کے لیے کیا تجویز کریں گے؟

عبداللہ حسین: میں اس طرح کی تجاویز پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ ادب کے اساتذہ کا کام ہے۔ سب کچھ پڑھنا چاہیے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ جتنا زیادہ آپ پڑھیں گے، اتنا علم وسیع ہوگا۔ ایک مقام پر یہ صلاحیت پیدا ہوجائے گی، تب آپ ناول کے اچھے یا برے ہونے سے متعلق خود ہی فیصلہ کرسکیں گے۔ میرا تو خیال ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہیے۔

اقبال: آپ اردو ناقدین سے مطمئن نہیں۔ کیا یہی شکایت ہے کہ وہ پڑھتے نہیں؟

عبداللہ حسین: سست ہیں، چالیس سال پرانے دور میں جی رہے ہیں۔ نئی چیزیں پڑھتے نہیں۔

اقبال: بیرونی ادیبوں میں کون پسند ہیں؟

عبداللہ حسین: ولیم فاکنر میرا فیورٹ ہے، لیکن سب سے بڑا ناول نگار تو دوستوفسکی ہے۔ مارکیز کا آج کل Craze ہے، مگر مجھے اس کے ناول سمجھ میں نہیں آئے۔ ہاں، میلان کنڈیرا نے ایک نئی قسم کا ناول ایجاد کیا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ جیسے میں نے 'فریب' کی کہانیوں کو دو تین حصوں میں تقسیم کر کے لکھا ہے، پہلے حال کا تذکرہ، پھر ماضی کی کہانی۔ میں نے یہ نیا تجربہ کیا۔ لوگوں نے پسند کیا۔

اقبال: اردو فکشن نگاروں کا اتنا چھوٹا سا قبیلہ، اس میں بھی گروہ بندیاں؟

عبداللہ حسین: گروہ بندیاں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں سیاست کی وبا پھیل گئی ہے۔ ذرائع ابلاغ میں سب سے مضبوط ہے ٹی وی۔ اس پر سیاست کے علاوہ کوئی بات نہیں ہے۔ تو وہاں سے یہ وبا ادب میں بھی آگئی ہے۔ کراچی والوں سے مجھے شکوہ ہے۔ اردو فکشن میں پنجاب کا بڑا حصہ ہے، جسے آپ نظر انداز نہیں کرسکتے، لیکن آپ ماننے کو تیار نہیں، گروہ بنا لیتے ہیں، تو آپ کو متعصب ہی کہا جائے گا۔ خیر، میری تو یہ لوگ بہت عزت کرتے ہیں۔ اور پھر مجھے اس عمر میں ان باتوں سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔

اقبال: ہمارے ادیب اور شعرا یا تو سوٹ میں نظر آتے ہیں، یا کرتے پاجامے میں، آپ کا لباس سب سے مختلف۔ یہ سہولت ہے یا روایت سے بغاوت کی شکل؟

عبداللہ حسین: مجھے کپڑوں کا کوئی شوق نہیں۔ میں کراچی میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہمارے ایک نوجوان دوست میرے کمرے میں آئے۔ میری چپل ٹوٹی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا، مگر اپنے ایک دوست سے کہنے لگے، بھئی عبداللہ حسین کی چپل ٹوٹی ہوئی تھی، ان کے لیے کچھ پیسوں کا انتظام کیا جائے (قہقہہ)۔ تو میرا یہی معاملہ ہے۔ لباس اور کھانے پینے کے معاملے میں رکھ رکھاؤ کا قائل نہیں۔ ■

ماخذ: اجرا، اکتوبر تا دسمبر 2014، کتابی سلسلہ 20

مذاکرہ

شرکا: مسعود اشعر، فخر زماں، کشور ناہید، سعادت سعید، انور سن رائے

ٹرانسکرپشن: اکرم کامل

مسعود اشعر: عبداللہ حسین صاحب آپ غالباً پانچ سال بعد پاکستان تشریف لائے ہیں۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے سوچا کیوں نہ آپ سے مکالمہ کیا جائے۔ یہ بتایئے کہ آپ نے 'باگھ' کے بعد کیا لکھا یا کیا لکھ رہے ہیں؟

عبداللہ حسین: میرے دوستوں کو معلوم ہے کہ ان دنوں میں نے ایک انگریزی ناول مکمل کیا ہے جو انگلستان میں پیدا ہونے والی دوسری نسل کی کہانی ہے حالانکہ اس میں پہلی نسل کا بھی ایک حصہ ہے لیکن وہ تھوڑا ہے زیادہ حصہ سیکنڈ جنریشن کا ہے۔ وہ لوگ جو وہاں کم عمری میں چلے گئے یا وہیں پیدا ہوئے ان لوگوں کے مسائل زیادہ ہیں۔ یہ بڑا اہم موضوع ہے۔

مسعود اشعر: آپ کی ایک کہانی 'واپسی کا سفر' کا بھی اس ناول سے کوئی تعلق ہے؟

عبداللہ حسین: وہ تو پہلی نسل کی کہانی ہے ویسے وہ بھی اس ناول میں شامل ہے۔

مسعود اشعر: سنا ہے کہ اس ناول پر فلم بھی بن رہی ہے؟

عبداللہ حسین: جی ہاں! اس پر فلم بھی بن رہی ہے۔ یہ نوجوانوں کی ایک فلم کمپنی بنا رہی ہے جنھوں نے ٹیلی ویژن پر بھی کام کیا ہے۔ دو ایک فلمیں بھی بنائی ہیں۔ انگریز لوگ ہیں۔ اصل میں ان دنوں وہاں یہ موضوع بڑا مقبول ہے۔ چینل فور پر بھی بہت سے پروگرام ہوتے ہیں اور فلمیں بھی بنی ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ موضوع اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی اور اس میں چلنے کے بھی امکانات ہیں اس لیے اس ناول پر بھی فلم بنائی جاری ہے۔

مسعود اشعر: پاکستان کے رہنے والوں اور لکھنے والوں کو وہاں کے پاکستانی ادیبوں سے شکایت رہی ہے کہ انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کے بارے میں بہت کم لکھا ہے جبکہ اس تجربے کو اردو ادب میں آنا چاہیے کیونکہ ہندوستان کے لکھنے والوں نے تو اپنی زبان میں اپنے تجربات اور مشاہدات کو پیش کیا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اس ناول میں اسے پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ پہلا پاکستانی ناول ہوگا جو انگریزی میں ہوگا۔

عبداللہ حسین: جی ہاں! یہ ایک ایسے آدمی کا پہلا ناول ہوگا جو اردو میں بھی لکھتا ہے۔

کشور ناہید: تو کیا یہ انگریزی زبان میں لکھنے کا پہلا تجربہ ہے؟

عبداللہ حسین: جی ہاں! میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہاں یہ انگریزی میں چھپے اور یہاں پاکستان میں اردو میں شائع ہو۔ یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ دو کتابیں ساتھ ساتھ شائع ہوں گی۔

کشور ناہید: اس ناول کا اردو ترجمہ کون کر رہا ہے؟ آپ خود کر رہے ہیں یا کوئی اور؟

عبداللہ حسین: اس کا ترجمہ میں نہیں کر رہا۔ کوئی کر دے تو اچھا ہے۔ میں تو اب اردو میں ایک مختصر ناول لکھ رہا ہوں جو ڈیڑھ سو صفحات کا ہوگا۔ اسے میں نے بہت دیر سے شروع کر رکھا ہے۔ آدھا ہو گیا ہے اب اسے ہی پہلے ختم کروں گا۔

کشور ناہید: اس کا موضوع کیا ہے؟

عبداللہ حسین:
پاکستان اور محبت — یعنی محبت کی کہانی۔

کشور ناہید: آپ کی محبت میں تو بہت سے آمیزے موجود ہوتے ہیں۔ سیاست سے معاشرت تک کیونکہ 'باگھ' بھی ایک طرح سے محبت کی کہانی ہے لیکن اس محبت نے جہاں جہاں ٹھوکریں اور جیلیں کاٹیں وہ محبت کے سودے تو ہیں۔

عبداللہ حسین: جی ہاں یہ محبت کے سودے ہیں۔

فخر زماں: عبداللہ حسین صاحب 'باگھ' بنیادی طور پر مزاحمت کا ناول ہے۔

عبداللہ حسین: اس میں تین چار موضوعات ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس میں ایک موضوع انصاف کا ہے، معاشرتی انصاف بلکہ اس میں ایک جملہ ہے، جہاں ایک آدمی جیل میں ہے اور غالباً سی آئی ڈی کا ایک آدمی اس کو قائل کرنے کے لیے اس کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم ایسے کرو تو ہم تمھیں چھوڑ دیں گے۔ وہ ہر طرح سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ آدمی نہیں مانتا پھر اسے آخر میں خیال آتا ہے کہ اس طرف سے آؤ شاید یہ حربہ کارگر ثابت ہو اور وہ کہتا ہے ''اچھا یہ بتاؤ کہ تمھارا خدا اور رسول ہے؟'' یہ آدمی (جو جیل میں ہے) کہتا ہے ''اس سے خدا اور رسول کا کیا تعلق ہے؟ میں تو انصاف مانگتا ہوں۔'' یہ ایک بڑا لطیف جملہ ہے

اوراس سارے حصے کی بنیاد ہے کیونکہ ہمیں تو بتایا گیا ہے کہ جو تم پر ظلم کرتے ہیں، جبر کرتے ہیں انھیں معاف کردو۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تو کرو ورنہ فیصلہ خدا پر چھوڑ دو وہ اجر دے گا، انصاف کرے گا، عدل کرے گا وغیرہ وغیرہ...

فخر زماں: 'باگھ' کے حوالے سے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کیا اس میں علامتی توجیہات بھی ہیں؟

عبداللہ حسین: میں نے شعوری طور پر کوئی علامت نہیں بنائی اور نہ ہی میرا خیال ہے کہ شعوری طور پر علامت کو بنانا چاہیے۔ اگر وہ بن جائے تو اور بات ہے سب سے اچھا سمبل وہی ہے جو پڑھنے والوں کے ذہن میں خود بخود بن جائے۔

کشور ناهید: آپ نے لکھنے کا آغاز ناول سے کیا۔ چند افسانوں کے علاوہ باقی سب ناول ہیں تو کیا آپ ناول اس لیے لکھتے ہیں کہ یہ بڑا کینوس آپ کو متوجہ کرتا ہے۔

عبداللہ حسین: ایسی بات نہیں ہے بڑا کینوس متوجہ نہیں کرتا، بلکہ وہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ اب جو میں ناول لکھ رہا ہوں اسے میں نے مختصر کہانی کے طور پر شروع کیا تھا لیکن وہ لمبی ہوگئی میں نے سوچا چلو اسے ناولٹ بنا لیتے ہیں۔ پھر میں نے اسے لکھ بھی لیا لیکن خود مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں آئی کیونکہ لکھتے لکھتے اس کا موضوع ایسا بن گیا کہ میں نے سوچا کہ یہ تو ناول کی تکنیک ہی میں لکھا جائے گا لہٰذا دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے ذہن میں کہانی ہی آتی ہے جو بعد میں طویل ہو کر ناول بن جاتی ہے۔

کشور ناهید: لاطینی امریکیوں اور کالے امریکیوں نے اپنے حالات سے متاثر ہو کر ناول لکھے۔ ان کے ہاں جو علاحدگی کی تحریکیں چلیں اور معاشرے میں جو تبدیلیاں آئیں انھوں نے انھیں موضوعِ سخن بنایا۔ کیا ان چیزوں نے آپ کو اس نئے ناول کو انگریزی میں لکھنے پر مائل کیا یا آپ نے اپنے معاشرے کے تضادات کے حوالے سے یہ سوچا کہ اس موضوع کو بھی متعارف کرایا جائے؟

عبداللہ حسین: نہیں سوچا تو نہیں۔ شعوری طور پر تو میں لکھتا ہی نہیں اسی لیے میں بہت کم لکھتا ہوں۔ اب کوئی تحریک پیدا ہوتی ہے تو میں لکھ دیتا ہوں۔

موضوع کا انتخاب خود بخود ہو جاتا ہے بلکہ کئی سال تک میرے ذہن میں رہتا ہے لیکن یہ آپ کی بات درست ہے کہ جو موضوعات آدمی کے ذہن میں آتے ہیں وہ آدمی کو متحرک کرتے ہیں اور وہ اپنے ہی معاشرے سے نکلتے ہیں باہر کی چیزوں سے نہیں نکلتے۔

مسعود اشعر: ابھی آپ نے کہا کہ آپ بہت کم لکھتے ہیں تو اس کی وجہ کیا بہت زیادہ محنت ہے یا بار بار غور و فکر؟

عبداللہ حسین: اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بہت سے کاموں میں مصروف رہتا ہوں۔ دوست بہت زیادہ ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں اخبارات پڑھتا رہتا ہوں اس لیے وہ ادب وغیرہ پر باتیں کرنے آجاتے ہیں حالانکہ انھیں علم نہیں کہ میں لکھتا بھی ہوں۔

مسعود اشعر: آپ کے یہ دوست انگریز ہیں؟

عبداللہ حسین: ہاں۔ کئی پاکستانی بھی ہیں جن کا تعلق میر پور یا پنجاب کے دور دراز علاقوں سے ہے۔ ان سے میری اچھی دوستی ہے۔ خوب گپ شپ رہتی ہے حالانکہ ان میں سے بہت سے تو لکھ پڑھ بھی نہیں سکتے۔

کشور ناهید: آپ نے وہاں جا کر کیا یہ محسوس کیا کہ وہاں جو پرانے پاکستانی آباد ہیں ان کے ذہنوں میں نہ جانے کس

اب جو میں ناول لکھ رہا ہوں اسے میں نے مختصر کہانی کے طور پر شروع کیا تھا لیکن وہ لمبی ہوگئی میں نے سوچا چلو اسے ناولٹ بنا لیتے ہیں۔ پھر میں نے اسے لکھ بھی لیا لیکن خود مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں آئی کیونکہ لکھتے لکھتے اس کا موضوع ایسا بن گیا کہ میں نے سوچا کہ یہ تو ناول کی تکنیک ہی میں لکھا جائے گا لہٰذا دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے ذہن میں کہانی ہی آتی ہے جو بعد میں طویل ہو کر ناول بن جاتی ہے۔

نے یہ بات ڈال دی ہے کہ انھیں اپنی تہذیب کو محفوظ کرنا ہے اور تہذیب کو محفوظ کرتے کرتے وہ چالیس سال پیچھے جا رہے ہیں۔ وہ آج کی جو ضرورتیں اور غایتیں اور معاشرت کی جو پابندیاں ہیں یا آج کل کے جو تمام حوالے ہیں وہ انھوں نے اپنے اوپر حرام کیے ہوئے ہیں؟

عبداللہ حسین: یہ ہمیشہ اقلیتوں کی نفسیات رہی ہے۔

کشور ناهید: تو کیا آپ اسے بھی اپنا موضوع بنانے پر غور کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ان میں دوسری نسل کے تضادات جو آرہے ہیں وہ اس لیے زیادہ آرہے ہیں کہ وہ رہ تو رہے ہیں بیسویں صدی میں اور ان کے والدین کی معاشرت ہے چودھویں صدی کی۔

عبداللہ حسین: اصل میں وہ اپنے آپ کو اقلیت سمجھتے ہیں اور اگر انھوں نے اپنی معاشرت اور اپنی شناخت کو اسی طرح برقرار نہ رکھا جس طرح ہمارے یہاں پاکستان کے گاؤں میں ہے تو ہم ضائع ہو جائیں گے۔ وہ لوگ جو وہاں بیس سال پہلے گئے تھے وہ اب بھی وہیں پر ہیں جہاں پاکستان چالیس سال پہلے تھا جبکہ پاکستان میں جو چالیس سال میں ترقی ہوئی ہے وہ اس سے بھی پیچھے ہیں۔

مسعود اشعر: اس سلسلے میں نئی نسل کا کیا رویہ ہے؟

عبداللہ حسین: ان کے مسائل الگ ہیں۔ وہ زیادہ مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔

کشور ناهید: ماضی کی طرف لوٹنا نئی اور پرانی دونوں جنریشنز میں ہے؟

عبداللہ حسین: البتہ اب وہاں ایک طبقہ پیدا ہو رہا ہے جو یہ سوچتا ہے کہ چونکہ ساری دنیا کے جو لوگ ہیں وہ اپنی تہذیب کی طرف جا رہے ہیں۔ انھیں بھی واپس جانا چاہیے۔

کشور ناهید: تہذیب کی طرف جانا اور بات ہے اور ماضی کی طرف لوٹنا اور بات ہے۔

عبداللہ حسین: اس میں نقص یہی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تہذیب کی طرف جا رہے ہیں حالانکہ وہ ماضی کی طرف جا رہے ہوتے ہیں لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہیں رہے گی جب یہ لوگ بڑے ہوں گے ان کی شادیاں ہوں گی اور ان کے بچے ہوں گے تو وہ وہاں تیسری جنریشن پیدا ہو چکی ہوگی اور پھر حالات بدل چکے ہوں گے۔

فخر زماں: پندرہ سال سے آپ ملک سے باہر ہیں۔ 'اداس نسلیں' کے بعد آپ کے جو ناول آئے ان میں جو Locale بنتا ہے وہ پاکستان کے حوالے سے ہے جبکہ آپ سے جب ذاتی طور پر پاکستان کے بارے میں بات کی جاتی ہے تو اداسی یا ناسٹلجیا نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میرے اندر پاکستان واپس جانے کی خواہش نہیں ہے، لیکن تحریر میں آپ پاکستان کے ساتھ بالکل جڑ کر رہتے ہیں۔ یہ ذاتی اور تحریری رویہ ہے۔ اس کی وضاحت کیجیے۔

عبداللہ حسین: پاکستانی تو میں ہوں اور وہ ساری چیزیں مجھ میں ہیں جو ایک پاکستانی میں ہوتی ہیں۔

کشور ناهید: کیا یہ بھی ایک طرح سے ماضی کی طرف جانے والی بات نہیں ہے؟ کیونکہ جب آپ لکھتے ہیں تو آپ کے اندر گجرات ہوتا ہے، لاہور ہوتا ہے یا اسلام آباد یا وہ تہذیب ہوتی ہے جو یہاں زندہ ہے۔

عبداللہ حسین: اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا سارا تجربہ یہاں کا ہے اور میں اپنی معاشرت کے بارے میں اپنی سرزمین کے بارے میں زیادہ بہتر لکھ سکتا ہوں مجھے لکھنے کی تحریک بھی یہیں سے ملتی ہے۔ پہلی دفعہ بیس سال بعد وہاں کے بارے میں

لکھنے کی تحریک ملی ہے تو میں نے یہ ناول لکھا ہے لیکن یہ کوئی پیچھے جانے والی بات نہیں۔ میرے مآخذ یہیں کے ہیں۔

کشور ناھید: آپ نے عورتوں کے تضادات اور ان کی جانکنی کو جس طرح بیان کیا ہے وہ ہمارے ہاں بہت کم بیان کی گئی ہے۔ آپ کی کہانی 'نشیب' کے حوالے سے آپ نے جس طبقے کی نمائندگی کی وہ عورت کہاں کی تھی یورپ، انگلستان کہ پاکستان کی؟

عبداللہ حسین: میرے خیال میں عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں رہا کسی بھی لحاظ سے بلکہ میں عورتوں کو بہت سے مردوں کے مقابلے میں بہتر سمجھتا ہوں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو میرا خیال ہے کہ عورتیں اپنی جسمانیت کے لحاظ سے اپنی معاشرت کے لحاظ سے اور اپنی تحریک کے لحاظ سے مردوں سے بہت بہتر ہیں یہ میرا ایمان ہے۔

فخر زماں: آپ کے ہاں اداس نسلیں، نشیب، جلاوطن یا واپسی کا سفر، میں جو عورتیں دکھائی گئی ہیں ان سب کا جو طرزِ احساس ہے بنتا ہے وہ ایک مخصوص قسم کا طاقتور ہے۔ یہ آپ کا اپنا تجربہ ہے یا آپ ان کو اس شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں؟

عبداللہ حسین: میں نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا لیکن اس پر میرا مضبوط ایمان ہے کہ اگر ہم عورتوں کو جوان کا حق ہے انھیں طاقت دے دیں۔ ان کے اختیار دے دیں تو ہماری بہت سی مشکلات ختم ہوسکتی ہیں۔ ہماری معاشرت، تہذیب، ہمارا ملک اور ہماری سیاست بہت بہتر ہوسکتی ہے اس لیے کہ عورتوں میں عجیب وغریب قسم کی قوت ہوتی ہے اور ان میں ایک ہمہ گیریت ہوتی ہے۔

سعادت سعید: آپ کے ناولوں میں شروع میں بڑا اسرار سا محسوس ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ کردار سامنے آتا ہے۔

عبداللہ حسین: میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک کی، معاشرے کی اور ہماری اپنی جو مشکلات ہیں اس کے دو حل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادیبوں کی بات سنی جائے اور ان کو اہمیت دی جائے اور دوسرا عورتوں کی بات سنی جائے۔ اہمیت سے میری مراد وہ عورتیں ہیں جو اس لائق ہیں۔

کشور ناھید: 'اُداس نسلیں' سے لے کر 'باگھ' تک سب میں سیاسی سطح ہے اور سیاسی ماحول کی تبدیلی اور سیاسی جبر جیسی چیزیں آتی ہیں۔ لیکن اس میں آپ کہیں Loud نہیں ہوتے۔ کیا اس کے لیے آپ نے باقاعدہ کوشش کی ہے کہ دونوں دھاروں میں بھی رہیں اور اصل سے آنکھ بھی ملائیں۔

عبداللہ حسین: میرے خیال میں جب آپ اپنے کو حاوی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے خیالات کو فکشن کی جزئیات کے بجائے بیان کرتے ہیں تو آپ خواہ مخواہ اپنے آپ کو سامنے لا رہے ہوتے ہیں۔

کشور ناھید: آپ اپنے خیالات کو بناتے تو ہیں؟

عبداللہ حسین: صرف فکشن کی ضروریات کے مطابق۔

فخر زماں: آج کل ہمارے ہاں یہ تحریک ہے کہ اردو کے علاوہ پاکستان کی دوسری زبانوں میں بھی لکھا جائے۔ آپ کا تعلق چونکہ گجرات سے ہے اور آپ پنجابی ہیں بلکہ میرے خیال میں آپ نے ایک دفعہ اعلان بھی کیا تھا کہ آپ پنجابی ناول یا ناولٹ بھی لکھیں گے۔ کیا آپ اس حوالے سے بتا سکتے ہیں کہ آپ نے اب تک پنجابی میں کیوں نہیں لکھا؟ یا آپ لکھنا چاہیں گے؟

عبداللہ حسین: دراصل میری ایک کمزوری ہے اور وہ بہت سے لوگوں میں بھی رہی ہے کہ پنجابی میں لکھنے اور

میرا ایک فلسفہ بھی بن گیا ھے کہ انسان کی ذات پر بہت سے جبر آزمائے جاتے ھیں۔ شروع سے آخر تک یعنی پیدا ھونے سے مرنے تک۔ کچھ زندگی کی صورت ھی ایسی ھے چاھے وہ یہاں ھو چاھے یورپ میں ھو امریکہ میں ھو۔ انسان کی زندگی پر بہت سے جبر عائد ھوتے ھیں، عائد کیے جاتے ھیں۔ آزمائے جاتے ھیں اور ان میں سے بچ کے نکل جانا یا نہ بچ کے زندہ رہنا یہ انسان کا ایک بڑا مسئلہ ھے اور وہ چیز صرف سیاسی چیز ھی نہیں اس کی کئی شکلیں ھیں۔ آپ کی ایک مسلسل کشمکش بن کر رہ جاتی ھے اور آپ کسی اسٹیج پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب میرے سارے کام ھو گئے ھیں۔ مسئلے حل ھو گئے اب میں آرام سے بیٹھ سکتا ھوں۔

پڑھنے کی شروع ہی سے روایت قائم نہیں ہوسکی جبکہ ہماری دوسری زبانیں ہیں مثلاً سندھی ہے اس میں اخبارات نکلتے ہیں۔ رسالے چھپتے ہیں، کتابیں بھی چھپتی ہیں۔ اسی طرح پشتو ہے اس میں بھی روزانہ اخبارات نکلتے ہیں، رسائل بھی ہیں اور کتابیں بھی چھپتی ہیں لیکن پنجابی میں ایسا نہیں ہوسکا۔

انور سن رائے: آپ کے تمام فکشن میں ایک فرد کے حوالے سے اذیت پائی جاتی ہے اور وہ مسلسل اس پابندیوں سے گزرتا رہتا ہے اور وہاں پر آپ بہت کھلتے ہیں۔ یہ آپ کا پسندیدہ موضوع بھی ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ انسانی حرمت کے حوالے سے یہ آپ کے تجربے کے قریب کی چیز ہے۔

عبداللہ حسین: ذاتی طور پر تو مجھے Persicution کا تجربہ نہیں ہے لیکن اپنے اردگرد کی دنیا میں ہر روز Persicution کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ میرا ایک فلسفہ بھی بن گیا ہے کہ انسان کی ذات پر بہت سے جبر آزمائے جاتے ہیں۔ شروع سے آخر تک یعنی پیدا ہونے سے مرنے تک۔ کچھ زندگی کی صورت ہی ایسی ہے چاہے وہ یہاں ہو چاہے یورپ میں ہو امریکہ میں ہو۔ انسان کی زندگی پر بہت سے جبر عائد ہوتے ہیں، عائد کیے جاتے ہیں۔ آزمائے جاتے ہیں اور ان میں سے بچ کے نکل جانا یا نہ بچ کے زندہ رہنا یہ انسان کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور وہ چیز صرف سیاسی چیز ہی نہیں اس کی کئی شکلیں ہیں۔ آپ کی زندگی ایک مسلسل کشمکش بن کر رہ جاتی ہے اور آپ کسی اسٹیج پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب میرے سارے کام ہو گئے ہیں۔ مسئلے حل ہو گئے اب میں آرام سے بیٹھ سکتا ہوں۔

کشور ناھید: ہم ذرا پیچھے جائیں تو ہمیں ایک شخص ملتا ہے جس کا نام محمد خان تھا۔ وہ کون تھا اور یہ عبداللہ حسین کیسے بن گیا؟ کیا اس کے سفر کا آپ کو علم ہے؟

عبداللہ حسین: اس میں مجھے کوئی اصرار نہیں ہے نہ میں اصرار کرنا چاہتا ہوں۔ محمد خاں میرا نام تھا اور سرکاری کاغذوں، پاسپورٹ تک میں بھی اب بھی میرا یہی نام ہے۔ بس لکھنے کے لیے مجھے یہ نام پسند آیا اور میں نے عبداللہ حسین رکھ لیا۔

کشور ناھید: یہ کب کی بات ہے؟

عبداللہ حسین: 'اداس نسلیں' لکھنے سے ذرا پہلے کی۔

کشور ناھید: کیا اس سے پہلے کچھ نہیں لکھا تھا جس طرح ہم سب کچا پکا لکھتے ہیں؟

عبداللہ حسین: میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ میں نے ایک کہانی لکھی۔ یہاں سے 'حسن پرست' نامی ایک رسالہ نکلتا تھا۔ وہ چھوٹی سی کہانی تھی اس میں چھپ گئی۔ عرصے تک وہ رسالہ میرے پاس رہا۔

کشور ناھید: محمد خان کالج میں آیا تو اس نے کیا کیا؟

عبداللہ حسین: پڑھتا رہا، دوستوں کے ساتھ پھرتا رہا...

سعادت سعید: آپ کے سارے ناولوں میں، ناولٹوں میں اور افسانوں میں زیادہ تر حقیقت نگاری ہے جبکہ ہمارے ناول نے بہت آگے کا سفر طے کرلیا ہے اور اس میں حقیقت نگاری کے علاوہ اور بھی بہت سی تکنیک آگئی ہیں۔ کبھی آپ کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ آپ بھی کوئی نئی تکنیک اپنائیں؟

عبداللہ حسین: میرے خیال میں لکھنے والا اپنے مزاج کے مطابق لکھتا ہے۔ جب تک کوئی تحریک نہ ہو یا آپ کا مزاج نہ ہو آپ غیر معمولی چیز نہیں لکھ سکتے۔

■

ماخذ: ماہ نو، لاہور، جولائی 1987

طاہر مسعود

قید

'قید' عبداللہ حسین کا نیا ناول کسی ایسے تھرمامیٹر کی طرح ہے جس سے سماج کی اندرونی کیفیات کا درجۂ حرارت معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس ناول میں ایک قسم کی مقناطیسیت بھی ہے یعنی ایک ایسی صفت جو توجہ کو اپنی طرف منعطف کیے رکھتی ہے۔ سماج دلچسپ، پیچیدہ اکائی ہے۔ معلوم اور نامعلوم حقیقتوں کا مرتب مثل ایک درخت کے جس کا معتد بہ حصہ زمین میں پیوست نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ ناول ان حقیقتوں کو ذہنی تجربے سے گزار کر ان میں نئی ترتیب قائم کرتا ہے جیسے بچے تصویر کے ٹکڑے کرتے ہیں اور پھر ان ٹکڑوں کو اپنی مرضی سے جوڑ کر نئی شکل دے دیتے ہیں۔ جدید ناول نگاری بالعموم واضح کو مبہم بنا دیتی ہے اور مبہم کو مزید مبہم — ناول میں یہ طریقۂ کار اس وصف کو مجروح کر دیتا ہے جو ناول میں مقناطیسیت پیدا کرتی ہے۔ یہ ناول اس مہمان کی طرح ہوتے ہیں جسے مروتاً برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ناول 'قید' میں واقعات کا بہاؤ منہ زور دریا کی طرح ہے جو اپنے پہلے ریلے میں آپ کو بہا کر لے جائے گا۔ دوبارہ مطالعہ بتائے گا کہ یہ ناول نہیں ہے جو نظر آرہا ہے۔ پھر آپ چاہیں تو اسے اِدھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کر دیکھ بھی سکتے ہیں۔ کہیں کہیں سے اس کا ذائقہ دوبارہ چکھنا اس کتاب کے فن میں مفید نہیں ہوگا کیونکہ اب آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ناول نے کئی مقامات پر آپ کو زبردست دھوکا دیا ہے۔

'قید' کا بہاؤ عصریت میں مضمر ہے۔ پنجاب کی دیہی زندگی کے پس منظر میں خانقاہیت اور بے روح راسخ العقیدگی اور اس سے پیدا ہونے والی بہیمانہ صورت حال، یہاں مذہب کے پرتقدس اور خوشنما پردے میں مکر و فریب، ریاکاری و جھوٹ اور ظلم و استحصال کا پرتعفن کھیل کھیلا جاتا ہے۔ غریب توہم پرست دیہاتیوں کی اذیت بھری زندگی پیروں فقیروں اور مولویوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔

خانقاہیں بیمار اور مایوس العلاج مریضوں کی آخری اُمید ہیں، جہاں مائیں لاغر بچوں کو اٹھائے آتی ہیں اور بانجھ عورتیں اولاد کی تمنا کے لیے۔ کوئی نوکری کے لیے کوئی محبوب کی جستجو میں، کوئی مقدمہ جیتنے کے لیے اور کوئی دشمن کو تباہ کرنے کے لیے۔ یہ سارے وہ لوگ ہیں جو خدا کی زمین پر انصاف اور خوشحالی سے محروم ہیں۔ یہ صابر و شاکر لوگ جنھیں زندگی نے کچھ نہیں دیا جن کے گراں بار شب و روز خوبصورتی اور مسرت سے عاری ہیں۔ پیر کے دامن کو اُمید کا دامن سمجھ کر تھام لیتے ہیں اور کیسی ستم ظریفی ہے کہ ان جعلی پیروں کے ہلتے ہوئے لب اور ان کے عیار ہاتھوں کی جنبش سے ان کے تاریک روزنوں میں روشنی کی کرن پھوٹتی ہے، ان کی امیدیں بر آتی ہیں۔

یہ ناول ہمیں بتاتا ہے کہ ایسے پیر فقیر کسی پروپیگنڈے اور پبلسٹی کے بغیر ہی خلقِ خدا کی توجہ کے مرکز بن جاتے ہیں۔ لوگ ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور مایوسی سے نجات پاکر شاداں و فرحاں لوٹتے ہیں۔ گویا یہ خانقاہی نظام لاتعداد مجبوروں کی ٹوٹتی ہوئی آس کو ازسرِ نو بندھاتا ہے۔ نہ صرف غریبوں اور مظلوموں کو بلکہ دولت مند اور تعلیم یافتہ مرد و عورتیں بھی مکر و فریب کے اس دربار سے احتراماً الٹے قدموں واپس جاتے ہیں۔ وہ تقدیر کے فیصلوں کو دولت کی قوت سے بدلنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ دردکا درماں پیر کی نظرِ کرم ہی سے ممکن ہے۔ توہم پرستی اور جہالت صدیوں سے ہمارے خون میں رچ بس گئی ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات سے عدم واقفیت ہی ایسے معاشرے کی تشکیل کرتی ہے جو بالآخر ڈیرہ پیروں اور تنگ نظر مولویوں کی جنت بن جاتا ہے۔ جہاں ممتا کی پیاس عورتوں کو بے لباس اور عقل سے کوری مذہبیت نوزائیدہ بچوں کو سنگسار کرا دیتی ہے۔ یہ ابنارمل سوسائٹی کی علامات ہیں۔ یہاں دین کی رحمتیں ایسے ابرِ کرم کی مانند ہیں جو ریگستانوں میں برستے ہیں تو دھرتی اپنا زہر ببول اور تھوہر کے پرخار پیڑوں کی صورت میں اُگلتی ہے۔

'قید' سماجی حقیقت نگاری کا ناول ہے۔ یوں تو جدید نقادوں کے نزدیک حقیقت نگاری زندگی کے اکہرے رخ کو پیش کرنے کے باوصف پیش پا افتادہ چیز بن گئی ہے، لیکن عبداللہ حسین کے ناول سے پتہ چلا کہ ایمائیت، اشاریت، علامت اور استعاراتی فکشن بلکہ فیشن کے تیز بہاؤ میں سماجی حقیقت نگاری میں اب بھی اتنی توانائی ہے کہ وہ عصرِ حاضر کی پیچ در پیچ اور تہہ دار زندگی کو فنی اظہار کا پیکر عطا کر سکے۔ عبداللہ حسین نے 'قید' میں حقیقت نگاری کے پہلو بہ پہلو ایک علامتی کردار بھی تراشا ہے۔ یہ..... سروری ہے جس کا ناول کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کردار کا بقیہ کرداروں سے کیا رشتہ ناتہ اور ناول میں اس کردار کا کیا جواز ہے۔ اس کے میل کچیل سے اَٹے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے میں جو مضمحل اور بیمار روح ہے، کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے؟ کیا یہ خانقاہیت کا وہ بیمار گھن زدہ جسد ہے جو ہماری تہذیب کے چہرے پر زخم کی طرح رِس رہا ہے، اور سلامت علی جیسے تعلیم یافتہ، روشن دماغ، زیرک اور معاملہ فہم نوجوان کی گدی نشینی کے بعد مائی سروری کے معاملاتِ زندگی کا یکا یک بحال ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے، اس کے سفید بال کا سیاہ ہو جانا اور منہ میں نئے دانتوں کا نکلنا — آخر اس بھید کے پیچھے کیا ہے؟

ہاتھ اور ہاتھوں میں اپنا چہرہ ٹکائے بیٹھی ٹک ٹک دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی کھاپی لیتی ہے۔ مہینے میں ایک آدھ بار اسے نہلا دُھلا دیا جاتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے ایک بار اس کے جسم کے نچلے حصے میں زخم پڑ جاتے ہیں جس کے بعد حکیم کے مشورے پر اس کے پلنگ میں دو سوراخ کر دیے جاتے ہیں تاکہ ان زخموں کو تازہ ہوا ملنے کا راستہ بن جائے۔ سلامت علی بچپن میں پلنگ کے نیچے لیٹ کر اس دو سوراخوں (دو آنکھوں) کو تکتا رہتا ہے — اتنی مختصر سی تفصیل کے بعد مائی سروری کا کردار ناول سے غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن ناول

کے اختتام پر چند جملے — چند بلیغ ایمائیت سے بھرپور جملے ملتے ہیں کہ سلامت علی کے گدی پر بیٹھتے ہی مائی سروری نے اپنا کام کاج شروع کر دیا بلکہ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس کے سفید بال کالے ہونے لگے تھے اور نئے دانت بھی نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ مائی سروری کا کردار ناول میں معنوی گہرائی پیدا کرتا ہے۔ ناول کی تعمیری فضا میں یہ کردار ملگجے اندھیرے کی طرح ہے جس میں منظر پراسرار سے ہو جاتے ہیں۔

'قید' ہمارے معاشرے کا آئینہ خانہ ہے، ہمارا معاشرہ جو کثیر الجہت مسائل اور اس کی پیچیدگیوں سے عبارت ہے۔ اس کی سطح پر جو تضادات دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تو اپنی جگہ، اس کی تہہ میں بھی متصادم رجحانات و تصورات ہیں، ان کی جڑیں صدیوں کی روایات میں پیوست ہیں اور ان کا تعلق بیشتر ضعیف الاعتقادی سے ہے۔ ضعیف الاعتقادی کیا ہے؟ کیا محض ایمان کا ضعف؟ یا جہالت کا شاخسانہ؟ یا یہ تقدیر اور نامساعد حالات سے جنگ آزمائی کا آخری حربہ اور ہتھیار ہے۔ جب پتوار ہاتھوں سے چھوٹ جائے تو پرشور دریا میں ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ ناامیدی اضمحلال پیدا کرتی ہے اور ضعیف الاعتقادی امید۔ پس یہ کروڑوں عوام کی وہ قوت ہے جس کے سہارے وہ جیتے ہیں، خواہ کسی کے نزدیک یہ خود فریبی ہی کیوں نہ ہو۔

سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کی طرح پیروں اور مولویوں کی قوت کا سرچشمہ بھی خلقِ خدا ہوتی ہے۔ ان کی مقبولیت کا راز اسی یقین میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ تقدیر کے فیصلوں کی خبر رکھتے ہیں۔ اس میں عمل دخل رکھتے ہیں اور مقرب اللہ ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پاکستانی سیاست میں پیر اور مولوی موثر عنصر کی حیثیت نہ رکھتے۔ پیر اور مولوی کے اثرات و اختیارات اپنی نوعیت میں قابلِ لحاظ طور پر جدا ہوتے ہیں۔ ایک طریقت کا نمائندہ، دوسرا شریعت کا۔ پیر حاجت روا ہوتا ہے۔ اس حاجت روائی کے عوض اسے عقیدت و احترام اور اس کے نتیجے میں مادّی مراعات ملتی ہیں۔ اس کے برعکس مولوی امتناعات پر زور دیتا ہے۔ وہ بے روح اور اندھی مذہبیت کے زیرِ اثر بصیرت سے عاری فتوے کے اجرا میں اپنا افتخار ڈھونڈتا ہے۔ اقبال نے اس لیے انھیں چار رکعت کے امام کہا تھا۔

ناول 'قید' کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب میں جو ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں ان کا انداز تزک کی کتابوں کے ذیلی عنوانات کی طرز پر ہے مثلاً 'رضیہ سلطانہ اور احمد شاہ کا آمنا سامنا' 'صاحبزادہ سلامت علی شاہ کا ظہور' وغیرہ۔ عنوانات کی اس مشابہت کی وجہ تسمیہ کیا محض عنوانات میں جدت پیدا کرنا ہے یا ناول نگار نے ناول کو سماجی دستاویز بنانا چاہا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ کتاب کی ابتدائی وضاحت سے کیا جا سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس کتاب میں جو حکایتیں بیان ہوئی ہیں ان کے اندر استعمال ہونے والے تمام نام و مقام فرضی ہیں — گویا واقعات سچے ہیں۔ بہرکیف یوں بھی ایک اعلیٰ ناول اپنے عہد کی سماجی اور سیاسی دستاویز تو ہوتا ہی ہے۔

'قید' کے کرداروں کا تجزیہ کرنے سے پہلے آیئے اس کے ادبی محاسن پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ اس ناول کی اہمیت مرکزی خیال کی وجہ سے نہیں ہے کہ اس نوع کے موضوعات پر ادب اور ذرائع ابلاغِ عامہ کی سطح پر خاصا کچھ لکھا اور پیش کیا جا چکا ہے۔ پریم چند سے اردو فکشن میں جس حقیقت نگاری کی ابتدا ہوئی تھی ترقی پسند تحریک نے اسے باقاعدہ منظم تحریک کی شکل دے کر تنگ نظری، توہم، جہالت اور غربت کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور ایسے برے بھلے لٹریچر کا راستہ ہموار کیا جو اقتصادی مسائل اور سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتا تھا۔ اسی بنا پر اگر ترقی پسند نقاد 'قید' کو ترقی پسند ناول قرار دیں تو تعجب کی بات نہ ہوگی۔ میرے نزدیک 'قید' کی انفرادیت جو اسے دوسرے ناولوں سے علیحدہ کرتی ہے، وہ اس کا بیانیہ ہے، نثر کا اسلوب ہے اور کہانی کی بُنت ہے۔ اردو فکشن میں بالعموم جو نثر لکھی جاتی ہے اس میں شاعری کے اوزار استعمال کیے جاتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی نثر جس میں تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ 'قید' کی نثر اس علت سے پاک ہے۔ 'اُداس نسلیں' سے 'قید' تک پہنچتے پہنچتے عبداللہ حسین کی نثر زمانے کے سرد و گرم کا مزہ چکھنے کے بعد پختہ عمری کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ ان کی نثر میں اُداس چاندنی سے زیادہ گرم دھوپ کی توانائی آ چکی ہے۔ وہ لفظوں کی کفایت کنجوس ماروا ڑی کی طرح کرنے لگے ہیں۔ 'قید' کی کہانی کے واقعات کو بیان کرنے میں بھی عبداللہ حسین نے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں واقعات کی قطعی ترتیب کو توڑ کر ایک نئی ترتیب قائم کی گئی ہے جس سے ناول میں استعجاب اور دلچسپی کا عنصر بڑھتا چلا جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس میں انھوں نے کافی محنت اور ذہانت سے کام لیا ہے۔

'قید' کا مرکزی کردار کرامت علی ہے۔ اس کردار کے ارتقا کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہے۔ تحریک آزادی کے ایک مخلص اور جانثار کارکن سے لے کر دُبہ پیر بننے تک یہ کردار جن ذہنی اور نفسیاتی تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے اس کا بے لاگ تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کردار میں کئی جھول ہیں۔ اس کردار کے اندر چند بنیادی تضادات ایسے ہیں جو ناول کے بنیادی تھیسس کی نفی کر دیتے ہیں۔ ناول نگار نے کرامت علی کے بچپن سے جوانی تک کے کردار کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں وہ حساس، نیک اطوار اور اچھے چال چلن کا شخص ہے۔ وہ تحریک آزادی کا ایک ایسا گمنام سپاہی ہے جسے دورانِ جنگ محاذ سے واپس بلا لیا گیا۔ اس کے کردار کے تشکیلی عناصر میں کوئی کجی اور ٹیڑھ نظر نہیں آتا نہ ہی اس کی شخصیت کی تربیت و تعمیر یا خاندانی پس منظر میں کوئی ایسا نقص یا کمی ہے، نہ وہ دولت کا بھوکا اور لالچی شخص ہے، نہ اس کی ضروریاتِ زندگی اتنی ہیں کہ وہ کسی قسم کے احساسِ محرومی کا شکار ہو اور دولت شہرت، اثر و رسوخ اور طمع میں مبتلا ہو۔ رضیہ سلطانہ کے اندوہناک واقعہ نے اس کی شخصیت کی کایا کلپ کر دی اور وہ دنیاوی علتوں کو تیاگ دے کر مسجد میں گوشہ نشین ہو گیا۔ یہاں سے ایک اتفاقی واقعے کے نتیجے میں اس کی زندگی کا دھارا ایک بار پھر اپنا رخ بدلتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ایک بددیانت، دغاباز اور عیار و مکار کا روپ دھارتا چلا جاتا ہے۔

ناول نگار نے کرامت علی کی شخصیت کا قلبِ ماہیت جس طرح ہوتے ہوئے دکھایا ہے اس پر کئی اعتراضات ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو یہ کہ ناول نگار نے کرامت علی کے کردار کی بنیادی ساخت کی تبدیلی اور تبدیلی کے عمل کے دوران اندرونی نفسیاتی کشمکش کو کہیں پر ظاہر نہیں کیا ہے۔ کرامت علی نے مسجد میں جوق در جوق آنے والے حاجت مندوں سے بچنے کی جتنی کوششیں کیں ان میں بڑی بے دلی پائی جاتی ہے جس کی مثال یہ ہے کہ جس اتفاقی واقعے کے باعث اس کی شہرت ہوئی وہ اس کی اصل حقیقت تک آنے والوں کو آگاہ تک کرتا۔ یہ بات گھڑا گھڑایا مفروضہ لگتی ہے کہ لوگ باگ زبردستی کسی کو منصبِ ولایت پر فائق کر دیں۔ داستانی کہانیوں میں تو ایسے واقعات عام ملتے ہیں لیکن ایسا ناول جو حقیقت نگاری کا دعویٰ رکھتا ہو، اس میں واقعات کا قرینِ قیاس ہونا لازمی ہے۔ چلیے اس اعتراض کو معمولی نوعیت کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے بنیادی اعتراض یہ ہے کہ کرامت علی کے کردار میں بنیادی تبدیلی کا سبب خارجی دباؤ کو ٹھہرایا گیا ہے۔ یعنی کرامت علی خود تو ایک گوشہ نشین اور عبادت گزار خدا کا بندہ تھا جسے خلقِ خدا نے اپنی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے اپنا ملجا و ماویٰ بنا لیا۔ گویا ناول نگار نے کرامت علی کے کردار کی قلبِ ماہیت میں اسے انفرادی ذمے داری سے قطعی طور پر بری کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خارجی دباؤ اتنا شدید ہے کہ کرامت علی جیسا نیک طینت آدمی شریفانہ طور طریقے چھوڑ کر خباثت اور شیطنیت پر اُتر آئے تو بعد کی صورت حال کی ذمے داری ضعیف الاعتقاد لوگوں پر عائد ہوتی ہے تاکہ خود کرامت علی پر، اور پھر ایسی صورت میں اس کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے کہ ناول کے بقیہ حصے میں اس کے استحصالی کردار کی نقاب کشائی نفرت و حقارت کے ساتھ کی جائے، اس لیے کہ یہ لوگ ہی ہیں جو اپنی حاجت کے لیے روپیہ پیسہ، اناج اور نذر و نیاز لے کر اس کی خانقاہ میں جاتے ہیں اور وہ عورتیں جو اولاد کی تمنا میں استخارے کے نام پر کرامت علی کے سامنے بے لباس ہونا پسند کرتی ہیں۔ پھر تو ناول نگار کا زاویۂ نگاہ کرامت علی کے بجائے آنے والوں کی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی پر مرکوز ہونا چاہیے اور اس کا تجزیہ ہونا چاہیے، کیونکہ لوگوں کے دکھ ان کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ اور آخری بات یہ کہ جب حاجت مندوں کی حاجتیں کرامت علی کی خانقاہ سے پوری ہوتی ہیں اور وہ وہاں سے خوش خوش لوٹتے ہیں تو پھر کرامت

علی کا کردار لائقِ تحسین ہوگا کہ لائقِ تنقیص۔

اصل بات یہ ہے کہ کرامت علی کا کردار ایک جھوٹا کردار ہے۔ عام مشاہدہ بھی یہی ہے کہ جعلی یا ڈبہ پیر ہمارے معاشرے میں باقاعدہ ایک ادارے کی صورت رکھتے ہیں۔ ان کے اپنے گروہ ہوتے ہیں جو منصوبہ بندی کے ساتھ معصوم اور بھولے بھالے لوگوں کو پھانستے ہیں اور اس کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنی جعلسازیوں سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور پیسے بٹورتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں وہ بھانڈا پھوٹ جانے کے خوف سے کسی ایک جگہ قیام بھی نہیں کرتے اور دیہاتوں، قصبوں اور چھوٹے شہروں میں گھومتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار پکڑے بھی جاتے ہیں مار کھاتے ہیں اور حوالات میں بند کر دیے جاتے ہیں۔ یہ واقعہ کہ کرامت علی دس پندرہ برس تک نہ صرف دیہاتیوں بلکہ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی بیوقوف بناتا رہا۔ جن میں فوج کے جرنیل حضرات بھی شامل تھے اور اس کی جھوٹی دعاؤں میں تاثیر بھی رہی اور مایوس لوگ اس کے پاس آ کر مسرور و مطمئن لوٹتے رہے۔ اگر اس مفروضے پر یقین بھی کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کرامت علی واقعی صاحبِ کشف و کرامات تھا۔ ایسے پیروں کی تو ہمیں عزت کرنی چاہیے۔ عبداللہ حسین طویل عرصے سے لندن میں مقیم ہیں۔ پاکستان کی تہذیب و معاشرت کی بابت ان کی معلومات کا ذریعہ لندن کے پاکستانی محنت کش افراد ہیں۔ جن سے وہ اپنے ناولوں اور کہانیوں کا مواد حاصل کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس ناول کی تعمیر میں ان کے براہِ راست تجربے یا مشاہدے کا دخل کم ہی رہا ہے اور انھوں نے اس ضمن میں ٹھوس معلومات کی طرف بھی توجہ نہیں دی۔

رضیہ سلطانہ 'قید' کا ایک اور کردار ہے جس میں بڑی توانائی پائی جاتی ہے۔ بظاہر ناول کا یہ حصہ سب سے زوردار محسوس ہوتا ہے۔ جس میں رضیہ سلطانہ جیل خانے میں قتل کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد پنجابی فلم کی ہیروئن کی طرح چیختی اور دہاڑتی ہے۔ عبداللہ حسین کا فن ناول کے اس حصے میں اپنی جزئیات نگاری کے لحاظ سے بہت کامیاب نظر آتا ہے۔ رضیہ سلطانہ شریف، دیندار گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ عالم ہے۔ صفدر شاہ کی محبت اور جسمانی رفاقت کے باوجود وہ طبعاً اوباش یا آوارہ و بدچلن نہیں ہے۔ جیل کی کال کوٹھری میں جس صبح اسے پھانسی دی جانے والی ہے اس رات وہ تینوں قتل کا احوال بیان کرتی ہے۔ لیکن اس تفصیلات کے بیان میں وہ جنسی مناظر کی عکاسی لفظوں کے ذریعے جس بے شرمی اور چابکدستی سے کرتی ہے وہ رضیہ سلطانہ سے زیادہ عبداللہ حسین کا اعتراف نامہ محسوس ہوتا ہے۔

بچے کے سنگسار کیے جانے کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ کوئی عورت جوشِ انتقام میں اس کے قاتلوں کو ہلاک کر دے۔ اگر رضیہ سلطانہ نے جس طریقے سے اپنے بچے کے قاتلوں کو صرف ایک نظر دیکھ کر یاد رکھا، انھیں ڈھونڈ نکالا اور پھر چُن چُن کر قتل کیا۔ وہ اپنی جگہ خود کسی سنسنی خیز فلم کی کہانی سے کم نہیں۔) اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کے قتل میں وہ جنسی ترغیب کو بطورِ حربہ استعمال کرے لیکن پھانسی کی کوٹھری میں مع تشبیہ و استعارے کے جنسی درندگی کی تصویر کشی ناقابلِ فہم سی بات لگتی ہے۔ ناول کا یہ حصہ نثری اسلوب کے لحاظ سے تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ لیکن امر واقعہ کے اعتبار سے بعید از قیاس بات۔ ایسا لگتا ہے کہ رضیہ سلطانہ جیسے ہی واقعہ سنانا شروع کرتی ہے عبداللہ حسین اسے پیچھے دھکیل کر سامنے آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں:

''اے عورت! پیچھے ہٹ اور یہ قصہ مجھے سنانے دے کیونکہ میں زبان و بیان پر تجھ سے زیادہ عبور رکھتا ہوں۔ اور دو عدد ایسے ناولوں کا مصنف بھی ہوں، جس میں اس قسم کے مناظر کو لکھنے کا حق ادا کر چکا ہوں۔ میں اس نوعیت کے بیان میں وہ کمالات دکھا سکتا ہوں جو تو نہیں دکھا سکتی۔''

رضیہ سلطانہ پیچھے ہٹ جاتی ہے اور عبداللہ حسین واقعی جو کچھ کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ حالانکہ ناول میں اہم بات یہ تھی کہ رضیہ سلطانہ نے قتل کیوں کیا؟ بقیہ تفصیلات غیر ضروری ہیں اور کہانی میں خواہ مخواہ طوالت پیدا کرتی ہیں۔ اگر ان حصوں کے پیراگراف کے پیراگراف کاٹ دیے جائیں تو نہ صرف یہ کہ کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ عین ممکن ہے ناول زیادہ چست (Compact) ہو جائے۔ رضیہ سلطانہ کی تقریرِ دلپذیر تو کئی مواقع پر مضحکہ خیز صورت اختیار کر گئی ہے مثلاً جب مولوی احمد شاہ رضیہ سلطانہ سے کہتا ہے کہ قتل کے واقعات بیان کرنا ضروری نہیں، خدا کے حضور توبہ کرنا اور گناہوں کی معافی مانگنا ضروری ہے تو رضیہ سلطانہ جواب میں واقعات سنانے کے جواز میں جو دلیل پیش کرتی ہے، ملاحظہ ہو:

''میاں جی، رضیہ سلطانہ بولی ''میں نے پہلے عرض کی تھی، جب تک میں اپنے سارے جرموں کا احوال بتا نہیں لیتی میرا اقبال نہیں ہوگا۔ یہ احوال بیان کر کے ہی اور اس دوزخ سے دوبارہ گزر کر ہی میں اپنے وجود سے گناہوں کی سیاہی دھو سکتی ہوں۔ میری آخری رات ہے میاں جی! پروردگار کے لیے مجھے ردّ نہ کیجیے، میری بات سن لیجیے۔'' (ص 86)

رضیہ سلطانہ احمد شاہ سے جتنی شدید نفرت کرتی ہے اس پس منظر میں یہ ملتجیانہ لب و لہجہ اور قتل کے واقعات کا سنانے پر اصرار اور پھر جنسی بیان کے چٹخارے ناول کے اس حصے کو فنی طور پر کمزور، مضحکہ خیز اور غیر ضروری بنا دیتے ہیں۔

اب آیئے ناول کے مرکزی واقعے کی طرف جو ناول کی بنیاد ہے۔ کیونکہ ناول میں بعد کے تمام اہم واقعات یعنی کرامت علی کا نوکری چھوڑ جانا۔ مسجد میں گوشہ نشینی اختیار کرنا، ادریس شاہ کا دیوانہ ہو جانا وغیرہ اسی واقعے کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ واقعہ رضیہ سلطانہ کے نوزائیدہ بچے کا سنگسار کیا جانا ہے۔ کہانی کا سنسنی خیز موڑ یہ ہے کہ رضیہ سلطانہ کماد کے کھیتوں میں چھپ کر اپنے نوزائیدہ بچے کو دیکھ رہی ہے جو مسجد کی سیڑھیوں پر پڑا ہے۔ مولوی ادریس شاہ کے اشارے پر بچے پر سنگ باری شروع ہوتی ہے:

''جب مراد نے اٹھا کر اسے پتھر مارا۔ پھر علی محمد نے اور چودھری اکرم نے، تو میں نے پہلی بار اس کی ننھی سی چیخ کی آواز سنی۔ اس نوزائیدہ کے سر کی ملائم ہڈی جو ایک مٹھی میں دبا کر ٹکڑے ٹکڑے کی جا سکتی تھی، بھاری پتھروں کی مار میں تھی۔ اس وقت میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت تھی کہ میں ان تینوں کا کلیجہ نکال لیتی، مگر ٹانگوں نے جواب دے دیا تھا۔ میرے حلق سے چیخ بلند ہونے لگی تو آواز بیٹھ گئی۔'' (ص 95)

یہ منظر نامہ واقعیت نگاری کے خلاف ہے۔ یہ تصور ہی محال ہے کہ ماں کے سامنے اسی کے نوزائیدہ بچے کو سنگسار کیا جا رہا ہو، اس کی چیخیں بلند ہو رہی ہوں اور بجائے اس کے کہ ماں کے جسم میں بجلی کی سی تیزی اور طاقت پیدا ہو اور وہ بچے کو بچانے کے لیے آگے بڑھے اس کی ٹانگیں جواب دے جاتی ہیں۔ ٹانگوں کا جواب دے جانا حوصلے کی پستی کی علامت ہے۔ خوف و دہشت کا شکار ہو جانے کی نشانی ہے۔ حیرت ہے کہ ناول نگار ماں کی فطرت اور عورت کی نفسیات سے اس درجہ ناواقف ہیں۔ حالانکہ یہ تو بڑی سادہ اور عام سی بات ہے کہ چرند پرند اور حیوان تک اپنی نسل کی بقا و حفاظت کے لیے اپنے سے قوی درندوں تک کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ بات فہم سے بالاتر ہے کہ نوزائیدہ بچے پر سنگ باری کے وقت رضیہ سلطانہ ہوش و حواس میں تھی اور ساری آوازیں سن رہی تھی اور سارے منظر صاف طریقے سے دیکھ رہی تھی تو ممتا کی فطرت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ساری قوت مجتمع کر کے اپنے بچے کو بچانے کے لیے چیختی ہوئی باہر نکلتی اور اس طرف بھاگتی۔ لیکن ناول میں جو کچھ دکھایا گیا ہے وہ کہانی کو آگے بڑھانے کا تقاضا ہو تو ہو ممتا کی فطرت کی بہر حال بڑی ناپختہ عکاسی ہے۔ ناول کے واقعات جب تک عقلی اعتبار سے قابلِ قبول نہ ہوں ان میں اثر پذیری کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟

'قید' کی کہانی چالیس برسوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ تحریکِ آزادی سے سابقہ دورِ حکومت تک۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول میں عصریت کا اہتمام کرنے کے لیے سابقہ دورِ حکومت میں چونکہ اسلام کا چرچا سرکاری سطح پر کثرت سے ہوا تھا۔ لہٰذا اسے بھی کہانی میں کھینچ تان کر لایا گیا ہے۔ اس کا بیان ناول میں درست ہو یا نہ ہو، فنی اعتبار سے ان کا اسلوب نہایت صحافیانہ ہے۔ کسی لیڈر کے سیاسی بیان کی حیثیت سے تو شاید یہ مناسب ہو لیکن ناول میں عصرِ حاضر کی سیاسی صورتِ حال پر اس نوعیت کا رواں تبصرہ ناول نگار کے زاویۂ نگاہ کی سطحیت کو ظاہر کرتا ہے۔

ماخذ: ماہ نو، لاہور، مئی 1989

ممتاز احمد خان

عبداللہ حسین کے دو ناولٹ

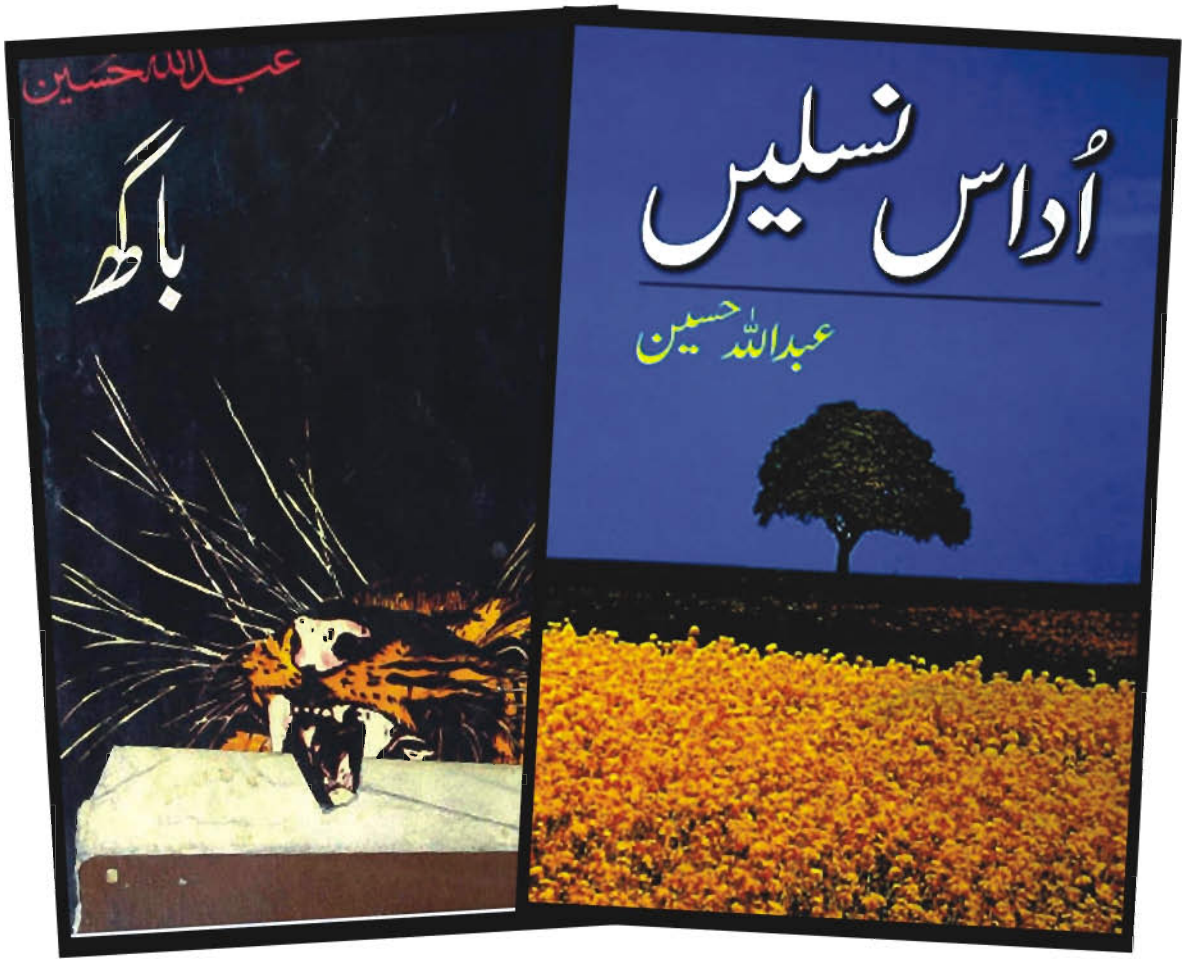

معروف پاکستانی ناول نگار عبداللہ حسین کا پہلا ناول 'اداس نسلیں' ہے۔ اس ناول نے ان کو بڑا ادبی مرتبہ عطا کیا۔ پھر ایک طویل عرصے تک وہ خاموش رہے اور 1981 میں ان کی دوسری کتاب 'نشیب' منظر عام پر آئی 'نشیب' میں ان کے دو ناولٹ 'نشیب' اور 'واپسی کا سفر' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی چار مطبوعہ کہانیوں اور ایک غیر مطبوعہ کہانی کو بھی اسی مجموعے میں شامل کر دیا گیا ہے۔ خاص طور پر ان کی تین کہانیاں ندی، سمندر اور دھوپ اس مجموعے میں آنے سے قبل ہی خاصی پسند کی گئی تھیں۔ ان کی دیگر دو کہانیاں جلاوطن اور مہاجرین ہیں۔ ان کا معیار بھی پہلی تین کہانیوں جیسا ہے۔

عبداللہ حسین نے 'اداس نسلیں' لکھ کر پورے انڈو پاک میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ اس ناول میں انھوں نے زبردست گہری نظر اور تاریخی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی شعور کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کے کانٹے کے تول جیسی نثر تو آج بھی ناول کو بار بار پڑھواتی ہے انھیں کردار کی نفسیاتی تحلیل پر زبردست عبور حاصل ہے پھر حقیقی ماحول کو فکشن بنانے کے فن میں وہ جواب نہیں رکھتے۔ اسی لیے جب 'نشیب' سامنے آیا تو اس کو دلچسپی سے پڑھا گیا۔ (ویسے 'نشیب' کے فوراً بعد ان کا دوسرا ناول 'باگھ' بھی منظر عام پر آچکا ہے) نشیب نامی ناولٹ میں عبداللہ حسین نے ایک بالکل نئے موضوع کو برتا ہے۔

بہتوں کے لیے شاید یہ ایک جاسوسی ناولٹ ہو لیکن اگر اس کو دلچسپی اور گہرائی کے ساتھ پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عبداللہ حسین نے عورت کی نفسیات کے ایسے پہلو کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے فکشن میں نیا نہیں ہے۔ اس کو مختلف انداز سے مختلف ناولوں میں پیش کیا گیا ہے مثال کے طور پر قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' میں چمپا کا کردار یہ بتاتا ہے کہ عورت ایک عجیب سی بے قراری و بے چین روح ہے۔ شاید یہ بے قراری اور بے چینی اس کی فطرت میں قدرت ہی نے ودیعت کی ہو۔ اسی طرح نثار عزیز بٹ کے ناول 'نگری نگری پھرا مسافر' کی ہیروئن انگارہ بھی اسی قسم کی

مخلوق ہے جو اپنی بے قراری پر اپنی عینیت پسندی کا پردہ ڈال دیتی ہے۔ پھر ان کے تیسرے ناول 'کاروانِ وجود' میں ثمر اور سارہ دو ایسے کردار ہیں جو آسودگی اور اطمینان کی تلاش میں کافی دور نکل جاتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے ناول 'راجہ گدھ' کی سلیمی تو خودکشی میں اپنے لیے نجات کا راستہ پالیتی ہے۔ خدیجہ مستور کے ناول 'آنگن' کی عالیہ اور 'زمین' کی ساجدہ بھی ایسے ہی دو کردار ہیں۔ گویا عورت کے اندر کی کشمکش، اس کی ناآسودگی بہت کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے آدرش کے کشکول کا خالی رہ جانا مختلف شکلوں میں ادبی ناولوں کے ذریعے ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہاں 'نشیب' میں کوثر کا کردار اتنا مضبوط اور پرفیکٹ ہے کہ اس کے ہیرو ایاز اور کہانی کار (جو نشیب کی کہانی بیانیہ کے ذریعے بطور 'میں' سناتا ہے) پر مکمل طور پر چھا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ایاز کی بیوی نسیم کا کردار بھی اولین اہمیت اختیار کرلیتا ہے، اس لیے کہ ناول نسیم پر ہی ختم ہوتا ہے۔ کہانی کار کی ڈائری بتاتی ہے:

''باقی وہ گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ بیٹوں کے خط پڑھتی ہے اور کئی کئی دن تک ان کے جواب لکھتی رہتی ہے۔ اس کے کمرے میں پرانے اخباروں اور رسالوں کے ڈھیر پڑے ہیں جن میں ایاز کی اور اس کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ کبھی کبھار وقت گزاری کے لیے انھیں اٹھا کر پڑھتی ہے مگر بیشتر وقت وہ اب اپنے کمرے میں کرسی پہ بیٹھی باہر دیکھتی رہتی ہے۔ جہاں باغ میں جگہ جگہ گھاس اُگ آئی ہے۔ شام کے وقت دیر تک اس کے کمرے میں بتی نہیں جلتی۔ اس کے چہرے کے نقوش ڈھے گئے ہیں مگر وہ لباس کے معاملے میں ابھی تک خاصی محتاط ہے۔ اس کی عمر بھر کی یہ ایک عادت ایسی ہے جو برابر چلی آرہی ہے۔ اس کا ذوق شروع سے بہت عمدہ رہا ہے اور جب بھی میں اس سے ملتا ہوں صاف ستھرا اور نفیس لباس اس کے زیب تن ہوتا ہے مگر میرے چہرے پر آنکھیں لگی ہیں میں دیکھ سکتا ہوں لباس کے اندر وہ ہڈیوں کا موٹھ ہوچکی ہے۔ کئی بار مجھے خیال آتا ہے کہ اس عورت کو کس بات کا صلہ مل رہا ہے۔ اس نے ایک باعزت اور باوقار زندگی بسر کی ہے۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔''

اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ بتایا جاسکے کہ اس ناولٹ میں عبداللہ حسین نے خاص طور پر جن کرداروں پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے وہ نسیم ہے اور اسی کے تقابل کے طور پر کوثر ہے جسے اس کا سیدھا سادا وفا شعار شوہر ظفر قتل کرکے اعتراف جرم بھی کرلیتا ہے۔ کہانی میں پیچیدگی یہ ہے کہ ظفر اپنی معصوم بیوی پر بغیر کسی ثبوت اور تحقیق کے الزام لگاتا ہے کہ وہ بدچلن تھی مگر کہانی کار اپنے دوست ایاز... جو کہ ایک کامیاب وکیل ہے... کی خاطر اس نتیجے تک قاری کو پہنچاتا ہے کہ عورت کی داخلی بے چینی اور بے قراری اور نامعلوم کی تلاش اور اس کے حصول میں ناکامی کا تعلق بدچلنی سے نہیں ہوسکتا... یہاں جرم، عورت کی نفسیات اور معاشرے... کے روایتی نظریات کے مابین جنگ چھڑی ہوئی ہے اور یہ کہ ناکامی اور موت ایسی بے قرار روح کا مقصد ہے... اس لحاظ سے دیگر ناولوں سے جو حوالے دیے گئے ہیں ان سے بتانا یہ مقصود تھا کہ عبداللہ حسین نے اس خاص موضوع کو ایک دوسری سطح بلکہ منفرد سطح پر برتا ہے۔

'نشیب' گو کہ ایک ناولٹ ہے لیکن اس میں اصل رو اور زیریں رو کا ایسا تانا بانا بندھا ہے کہ کہانی بڑی وسعت اختیار

''باقی وہ گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ بیٹوں کے خط پڑھتی ہے اور کئی کئی دن تک ان کے جواب لکھتی رہتی ہے۔ اس کے کمرے میں پرانے اخباروں اور رسالوں کے ڈھیر پڑے ہیں جن میں ایاز کی اور اس کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ کبھی کبھار وقت گزاری کے لیے انھیں اٹھا کر پڑھتی ہے مگر بیشتر وقت وہ اب اپنے کمرے میں کرسی پہ بیٹھی باہر دیکھتی رہتی ہے۔ جہاں باغ میں جگہ جگہ گھاس اُگ آئی ہے۔ شام کے وقت دیر تک اس کے کمرے میں بتی نہیں جلتی۔ اس کے چہرے کے نقوش ڈھے گئے ہیں مگر وہ لباس کے معاملے میں ابھی تک خاصی محتاط ہے۔ اس کی عمر بھر کی یہ ایک عادت ایسی ہے جو برابر چلی آرہی ہے۔

کرلیتی ہے۔ اس میں صرف اتنا بتانا ضروری ہوجاتا ہے کہ کہانی ایک ڈائری کی شکل میں ہے جو بیس سال پہلے کہانی کار 'میں' نے لکھی تھی۔ اب وہ بیس سال بعد اسے سنا رہا ہے اور اس طور پر سنا رہا ہے کہ قاری کو یہ بتا سکے کہ زمانہ بہت ظالم ہوتا ہے جن کرداروں سے اس کا بچپن سے تعلق رہا تھا یا جن سے وہ نوجوانی میں ملا تھا وہ کیا تھے کیا ہوگئے۔ مکافاتِ عمل ہر ایک کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے انسان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک دور آتا ہے جب کایا پلٹ جاتی ہے۔ ایاز کے ساتھ وہ بچپن سے کھیلا۔ ایاز بچپن ہی سے سیماب فطرت لڑکا تھا۔ وہ کسی ایک صورت حال پر قناعت نہیں کرسکتا۔ اس نے میٹرک کیا۔ بی ایس سی کیا پھر اچانک قانون کا امتحان پاس کیا تاکہ اس کے ذریعے بڑا آدمی بن سکے۔ وہ جب انگلستان سے واپس آیا تو اس نے شہر میں دھاک بٹھا دی اور شہر کے معروف بیرسٹر مظہرالدین شیخ کی لڑکی نسیم سے شادی کی۔ اس نے آمریت کے دور میں انسانی حقوق پر مضمون لکھا جس کے بعد اسے ایڈووکیٹ جنرل کا عہدہ سنبھالنے کی پیشکش ہوئی۔ ایاز آگے بڑھتا رہا۔ آخر کوثر کے قتل کے کیس نے اسے بڑے نفسیاتی خلجان میں مبتلا کردیا... کہانی کار کو اس نے اس کیس میں ملوث کردیا مسئلہ یہ کہ کوثر کا شوہر ظفر بہت اچھا آدمی تھا تو اس نے اسے قتل کیوں کیا۔ ایاز کسی قسم کے اشارے یا CLUE کو حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ آخر کہانی کار نے کافی کوششوں کے بعد مقتولہ کوثر کی ماں سے رابطہ قائم کیا جو واحد عورت تھی اور سچائی کا علم رکھتی تھی۔

''ساری خدائی کے اندر صرف میں ہوں''، وہ بولی ''جسے سچائی کا علم ہے۔''

''پھر آپ اسے لوگوں کے سامنے بیان کیوں نہیں کرتیں؟''، میں نے

''کیا میں اپنی بیٹی کی ناموس بچالوں گی؟''

مسئلہ یہ ہے کہ ظفر نے یہ بیان دیا تھا کہ وہ بدچلن تھی.. کوثر کی داستان جب عام ہوئی تو ہر شخص نے یہی سمجھا کہ وہ بدچلن ہوگی ورنہ کون مرد بلاوجہ اپنی بیوی کو قتل کرے گا ادھر کوثر کی ماں کتنی زبردست حقیقت کا انکشاف کرتی ہے:

''جب مرد عورت کو ہلاک کرتا ہے تو بھی عورت بدکار ہوتی ہے جب عورت مرد کو ہلاک کردیتی ہے تو پھر بھی وہ بدکار ہوتی ہے۔ صرف جرم کا فیصلہ کیا جاتا ہے... عورت کی بدکاری مسلم ہوتی ہے..''

کوثر کی ماں ایک چھوٹا سا کردار ہے جو بالکل آخر میں آتا ہے مگر وہ اپنی گفتگو سے قاری کی آنکھیں کھول دیتی ہے اور جرم و سزا سے متعلق ایک ڈائمنشن Dimension ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس سے ہٹ کر پھر وہی عورت کی بے قراری، بے چینی اور کسی ان دیکھی چیز کی تلاش کا معاملہ کوثر کی ماں سامنے لاتی ہے:

''کوئی آٹھ ماہ ہوئے ایک دن میری بیٹی میرے پاس آئی اور بولی ماں۔ میرا دل نہیں لگتا۔ بس اتنا اس نے کہا میں نے سوچا عورت کا دل کہاں لگا کرتا ہے۔ تم ایک مرد ہو اس بات کو شاید نہ سمجھ پاؤ مگر یہ حقیقت ہے عورتیں جس دن بیاہ کر کے گھر سے جاتی ہیں اس دن کی کسک ان کے دل میں چھپی رہتی ہے ہم میں سے بیشتر یہ جان بھی نہیں پاتے کہ یہ کس شے کا درد ہے کون سی ایسی چیز ہے جو کھوگئی ہے۔ گزارہ چلتا رہتا ہے...''

پھر وہ تقریباً چنگھاڑتی ہوئی یہ بھی کہتی ہے۔

''میری بیٹی کو چاہے قصوروار سمجھو۔ مگر وہ بدکار نہیں تھی۔''

کوئی بھی حساس قاری کوثر کی ماں کے خیالات کو سمجھے بنا آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ کس قدر زبردست بات ہے... یہ کسی شے کا درد ہے کون سی ایسی چیز ہے جو کھوگئی ہے... بس اسی کی تلاش قاری کا، عبداللہ حسین کا اور تمام نفسیات دانوں کا روگ ہے زندگی میں یا یوں کہہ لیجیے کہانی میں یا اس سے بھی آگے بڑھ کر یوں سمجھ لیجیے کہ فن میں ایسی بات بھی ہوتی ہے جو بیان نہیں کی جاسکتی۔ عبداللہ حسین نے ایک روسی رقاصہ کا واقعہ لکھا ہے کہ جس سے کسی نے پوچھا کہ وہ اپنے ناچ کا مطلب بتا سکتی ہے تو اس نے پھٹ سے جواب دیا کہ اگر وہ بتا سکتی تو ناچنے کا تکلف کیوں کرتی۔ آگے چل کر کہانی کے حوالے سے انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس میں وہ بات تو ہوتی ہے جو بیان کی جاسکتی ہے لیکن وہ بھی ہوتی ہے جو بیان نہیں کی جاسکتی۔ میرے خیال میں عورت کی اس خاص نفسیات کے حوالے سے انھوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ کوثر کی کہانی بیان کرکے انھوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ فن میں یا کہانی میں ان کہی باتیں تلاش کرنا ہی قاری یا نقاد کا کام ہے۔ خود اسی عذاب سے ایک اچھا کہانی کار یا فن کار بھی گزر چکا ہوتا ہے... عورت کی نفسیات کا صحیح پتہ چلانا ایک پراسرار عمل سے گزرنے کا نام ہے۔ کیا یہ سب کچھ ایک خاص قسم کی مسٹری Mystery ہے اور کیا اس پراسراریت ہی میں ایک جان لیوا لطف ہے اور اس سے بڑھ کر کیا یہی زندگی کرنے کا سامان ہے۔ انسانی کردار بالخصوص عورت ایک معمہ ہے۔ اس کی تہہ میں پہنچ کر کوئی صحیح کوڑی لے آنا کارِ عبث ہے مگر یہ ایک پراسراریت تو ہے... انسانی کردار کی... ماڈرن سائنس دانوں کے امام البرٹ آئن اسٹائن Einstein نے ایک مضمون میں پراسراریت کو زندگی کرنے کے لیے ضروری خیال کیا تھا:

"The fairest thing we can experience is the mysterious. It is the fundamental emotion which stands at the cradle of true art and true science. He who knows it not, can no longer wonder no longer feel amazement is as good as dead."

واضح رہے کہ آئن اسٹائن نے مجموعی طور سے کائنات کی پراسراریت کو زندگی کرنے کا وسیلہ بتایا تھا۔ عبداللہ عورت کو پراسرار ہستی یا ایک قسم کا چیستاں بنا کر پیش کرتے ہیں جس میں مرد دلچسپی لیتا ہے اور اس کی پراسراریت میں روز ازل سے غوطہ زن ہے۔

اب چونکہ اس پراسراریت ہی میں ایک لطف ہے لہٰذا یہ بتانا کہ آخر وہ ان کہی بات کیا ہے جو عبداللہ حسین نے صاف صاف نہیں بتائی ہے اس کا جواب صرف اتنا ہے کہ کوثر کے حوالے سے عورت کے اندر جس بے چینی کرب اور بے قراری..... بس میرا دل نہیں لگتا... کا تذکرہ ہے کہ یہ بذات خود عورت کی فطرت کا لازمی حصہ ہے اور یہ یونہی چلتا رہے گا۔ یہی بات کوثر کی ماں نے بھی کہی تھی۔ اور یہی عورت کے کرب کی نامعلوم لذت ہے اور یہی لذت وہ شاہراہ حیات ہے جس پر وہ پیدائش سے لے کر موت تک چلتی رہے گی۔

عبداللہ حسین سے کہانی کو دو اور سطحوں پر برتا ہے۔ انھوں نے دراصل یہ بھی کہنا چاہا ہے کہ اس دنیا میں آسودگی کے

عبداللہ حسین سے کہانی کو دو اور سطحوں پر برتا ہے۔ انھوں نے دراصل یہ بھی کہنا چاہا ہے کہ اس دنیا میں آسودگی کے حصول کی بھی ایک حد ہے۔ اس کی زیادتی انسان کے لیے بربادی کا سامان بھی پیدا کرتی ہے۔ ایاز جو فطری طور پر سیماب طبیعت ہے زندگی میں بڑے بڑے مقامات حاصل کرتا ہے اور جب مادی آسودگی کا یہ پہیہ اپنا چکر مکمل کرنے لگتا ہے تو ردعمل بھی سامنے آتا ہے۔ کوئی اس سے بچ نہیں سکتا اس لیے کہ اعمال کے بطون میں نتائج چھپے ہوتے ہیں۔ ایاز وزیر بنتا ہے اور پھر اس پر زوال آتا ہے۔ جب وہ اقتدار سے علاحدہ ہوتا ہے تو اس پر بدعنوانی کا مقدمہ چلتا ہے اور اسے سزا بھگتنا پڑتی ہے۔

حصول کی بھی ایک حد ہے۔ اس کی زیادتی انسان کے لیے بربادی کا سامان بھی پیدا کرتی ہے۔ ایاز جو فطری طور پر سیماب طبیعت ہے زندگی میں بڑے بڑے مقامات حاصل کرتا ہے اور جب مادی آسودگی کا یہ پہیہ اپنا چکر مکمل کرنے لگتا ہے تو ردعمل بھی سامنے آتا ہے۔ کوئی اس سے بچ نہیں سکتا اس لیے کہ اعمال کے بطون میں نتائج چھپے ہوتے ہیں۔ ایاز وزیر بنتا ہے اور پھر اس پر زوال آتا ہے۔ جب وہ اقتدار سے علاحدہ ہوتا ہے تو اس پر بدعنوانی کا مقدمہ چلتا ہے اور اسے سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ عبداللہ حسین کا دامن یہ سچویشن Situation پیش کرنے کے وقت کیا تھا لیکن میرا خیال ہے وہ قاری کو یہ بتانا چاہتے ہیں... بندے بہت زیادہ کی خواہش نہ کر ورنہ حد سے زیادہ بلندی پر پہنچ کر تو نشیب میں ضرور آگرے گا۔

جہاں تک دوسری سطح کا تعلق ہے وہ ایک مکالمہ ہے! جی ہاں۔ عبداللہ حسین اپنے ہی جیسے دوسرے کہانی، ناولٹ یا ناول لکھنے والوں سے مخاطب ہوتے ہیں یعنی یہ کہ کیا کہانی کار کو جاسوس بھی ہونا چاہیے کہانی کار یا ناولٹ کا 'میں' کہتا ہے:

''دراصل اب میں اپنے سراغ رسانی کے کام سے لطف اندوز ہونے لگا تھا غالباً ہر ایک ادیب کے اندر ایک سراغ رساں اور ایک دروغ گو چھپا بیٹھا ہوتا ہے اسی لیے وہ اپنی من گھڑت باتیں اتنی سنجیدگی کے ساتھ لوگوں کے سامنے سچائی کا نام دے کر پیش کرتا ہے اور شاید اسی لیے ادیب کا کام اتنا پرخطر بھی ہوتا ہے کیونکہ جب وہ سچائی کی کوئی اصل صورت نہیں نکال سکتا تو محض ایک دروغ گو سراغ رساں بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ خیال کرکے میرا دل لرز اٹھتا تھا کہ دنیا پہلے ہی ایسے خطرناک لوگوں سے بھری پڑی تھی۔''

اس اقتباس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بات تو یہ کہ کہانی کار جاسوسی کے موضوع کو بھی ادب میں اونچی سطح پر برت سکتا ہے۔ آخر دوستووسکی کا مشہور زمانہ ناول کرائم اینڈ پنشمنٹ Crime and Punishment کیا تھا خود کامیو Camus نے اپنے زبردست ناول دی آؤٹ سائڈر The Outsider میں ایک قتل کو موضوع بنا کر اپنے مخصوص فلسفے کی وضاحت کی اور دوستووسکی نے لاشعور کو موضوع بنایا۔ اس بات کو لکھنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک حلقے نے یہ کہا تھا کہ عبداللہ حسین اب جاسوسی ادیب بھی بن گئے ہیں حالانکہ انھوں نے کوثر کے قتل کو موضوع بنا کر عورت کی نفسیات کے ایک مخصوص گوشے کو آشکار کیا اور اپنے ساتھ قاری اور نقاد کو بھی ملوث کیا۔

پھر اسی اقتباس سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کہانی لکھنا عذاب کو پالنے کے مترادف ہے۔ دوسرے انسانوں کے اذہان یا لاشعور میں جا بیٹھنا اور کہانی کی کوڑی لانا اتنا آسان نہیں جس قدر کہ سمجھا جاتا ہے۔ ادیب کو سچائی کی اصل صورت نکالنا پڑتی ہے ورنہ وہ جھوٹا کہلائے گا۔ اسی لیے ناولٹ کے آخری پیراگراف میں کہانی کا دوسرا اہم مرد کردار 'میں' اپنی ڈائری سے یہ الفاظ پڑھ کر ناولٹ کو ختم کرتا ہے:

''جہاں تک میری زندگی کا تعلق ہے خدا کا شکر ہے بسر ہو رہی ہے۔ مگر بیس سال سے میں نے کوئی کہانی نہیں لکھی۔ البتہ ڈائری باقاعدگی سے لکھتا ہوں۔ ڈائری میں اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات قلم بند کرتا رہتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات

لکھنا کس قدر آسان ہے لیکن ہمارے سامنے جو کردار آرہے ہیں یا جارہے ہیں ان کی حقیقی زندگی کی منظر کشی ان کے داخلی کرب کے حوالے سے کرنا کس قدر دشوار گزار عمل ہے۔ عبداللہ حسین اس کرب سے گزرے ہیں اور انھوں نے اس نقطۂ نظر کو کہانی کار کے کردار کے توسط سے ثابت کیا ہے۔ اس لحاظ سے 'نشیب' کو ایک کامیاب ناولٹ قرار دیا جاسکتا ہے۔

(2)

ناولٹ 'واپسی کا سفر' تھیم کے اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود ایک نقطے پر آکر نشیب سے مل جاتا ہے۔ اس کا منظر نامہ انگلینڈ سے تعلق رکھتا ہے چونکہ عبداللہ حسین انگلستان کی زندگی سے واقف ہیں لہٰذا اس ناولٹ میں بھی واقعیت کی سطح بلند ہے۔ اس ناولٹ میں خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے پاکستانی اور انگریزی کرداروں کے حوالے سے بات کی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے میری Mary کی زندگی پیش کی ہے جو اس اعتبار سے دکھی لڑکی ہے کہ اس کا باپ مرجاتا ہے اور ماں جو کہ شرابی اور غیر ذمے دار ہے وہ بھاگ نکلتی ہے۔ میری کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ آوارہ گردی یا گھٹیا جنسی زندگی بسر کرے۔ اس کے کردار کے حوالے سے اخلاقی زوال کو انگلش زندگی کی بنیاد بتایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ حد سے زیادہ آزادی مادر پدر آزاد معاشرے کو جنم دیتی ہے اور عورت کو مرد خواہ یورپی نژاد ہوں کہ پاکستانی اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے کتے کتیوں کے ساتھ 'سلوک' کرتے ہیں۔ لیکن پاکستانی کردار خاص طور پر ثاقب انسانی فطرت کے اس گوشے کی نمائندگی کرتا ہے جسے ناسٹلجیا (Nostalgia) کہا جاتا ہے... یعنی دوسرے وطن میں رہ کر اپنے وطن کی یاد... مگر یہاں عبداللہ حسین نے عورت اور تارک وطن کے درمیان ایک قدر مشترک وضع کی ہے یعنی یہ کہ دونوں جلاوطن ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ دونوں 'بے وطن' ہوتے ہیں۔ ثاقب جو ارشاد کے ساتھ میری کو لے کر ایک ہی کمرے میں بند ہوجاتا ہے اور یہ سب کچھ معمول کے مطابق ہوتا ہے ارشاد حسین شاہ کا بھتیجہ ہے جس کا حسین شاہ نے میری سے مصنوعی شادی کے معاہدے کے ساتھ انگلینڈ میں قیام کرایا تھا واضح رہے کہ حسین شاہ سے میری کا بچہ بھی ہوجاتا ہے لیکن ارشاد اور ثاقب دونوں اس کو بیوی کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ثاقب کا ارشاد اور اس کے چچا حسین شاہ سے جھگڑا ہوجاتا ہے جس میں دونوں مارے جاتے ہیں۔ ثاقب پکڑا جاتا ہے اور اسے نفسیاتی مریض قرار دلوا کر دماغی اسپتال میں بھرتی کرادیا جاتا ہے۔ بعد میں جب ثاقب کو اس آزار سے نجات ملتی ہے تو اس کو پاکستان بھیجنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ انگلینڈ میں وہ جلاوطن ہی تھا اور اپنے مخصوص حالات کے نتیجے کے طور پر اس جلاوطن یا بے وطن کو آخر کار پاکستان ہی واپس پہنچنا تھا۔ اسی اثنا میں ناولٹ کے 'میں' یا کہانی کار کی ملاقات دس سال بعد میری سے ہوجاتی ہے جو بتاتی ہے کہ اس نے ایک آئرش Irish سے شادی کرلی ہے لیکن وہ خوش نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ادھر 'کہانی کار' خود اپنی ازدواجی زندگی کی جھلکیاں بھی دکھاتا جاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی خوشی کے لیے بہت کچھ کرتا ہے لیکن یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کہ ناراض ناراض سی ہو یا جیسے بے وطن ہو!

''مجھے اپنی بیوی سے کوئی گلہ نہیں بڑی خدمتی ہے مگر پتہ نہیں اس کو کس بات کا غم کھائے جاتا ہے۔ جب سے آئی ہے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ ہر طرح کا آرام ہے۔ اپنا گھر ہے، کار موجود ہے۔ ٹیلی ویژن لے کر دیا ہوا ہے اسے دیکھتی رہتی ہے ہر چیز وافر موجود ہے۔ فراغت کی زندگی ہے بچے اسکول جاتے ہیں مگر اس کے چہرے پر میں نے خوشی کی لکیر نہیں دیکھی میں پوچھتا ہوں کیا تیرا دل نہیں لگتا۔ کہتی ہے میرے دل کا کیا ہے جدھر آپ کا دل ادھر میرا دل۔ مجھے سمجھ نہیں آتی پھر اسے غم کس بات کا ہے مجھے میری Mary کی بات یاد آتی ہے میں سوچتا ہوں میری ٹھیک ہی کہتی ہوگی شاید عورتیں بھی بے وطن ہوتی ہیں۔ مجھے اپنی ماں اور بہن کا چہرہ یاد آتا ہے۔''

عبداللہ حسین کے یہ دونوں جدید ناولٹ فکری و فنی دونوں اعتبار سے کامیاب ناولٹ ہیں۔ اس وقت پاکستانی ناولوں میں بھی تجربے ہورہے ہیں۔ خوشیوں کا باغ (انور سجاد) اور دیوار کے پیچھے (انیس ناگی) جنم کنڈلی (فہیم اعظمی) راجہ گدھ (بانو قدسیہ) کاروان وجود (نثار بٹ) وغیرہ اس کی مثالیں ہیں لیکن عبداللہ حسین نے ان ناولٹوں میں بھی اپنے ناول والا اسلوب برقرار رکھا ہے ان کا دوسرا ناول 'باگھ' جدیدیت ہی کے زمرے میں آتا ہے اور انھیں کسی طور بھی روایتی ناولٹ یا ناول نگار کا طعنہ دے کر رد نہیں کیا جاسکتا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ان کی تحریروں میں اتنی جان ضرور ہے کہ وہ ہر دور میں زندہ رہیں اور تازگی کا بھی احساس دلاتی رہیں۔ اس لیے کہ ان کا فن عارضی کے بجائے انسان کے ابدی جذبوں سے بحث کرتا ہے۔

واضح رہے کہ ان الفاظ سے قبل یہ واقعہ پیش آچکا ہے کہ ایک بات پر مشتعل ہوکر اس نے اپنی بیوی کو ایک تھپڑ مار دیا جس کے جواب میں اس نے بھی اس کے سر پر شیشے کا جگ دے مارا تھا۔ لیکن محض یہ وجہ دونوں کے درمیان ناراضی کا باعث نہ تھی وہ تو ویسے ہی 'نشیب' کی کوثر والی فطرت رکھتی تھی کہ جو کہا کرتی تھی... میرا دل نہیں لگتا... نہ معلوم اس دنیا میں کتنی عورتیں ہوں گی جن کا یہی رویہ ہوتا ہوگا۔ انگلینڈ میں وہ لوگ جو مستقلاً رہ رہے ہیں اور وہ لوگ جنھیں اپنے اپنے ورک پرمٹ Work Permit کے غیر موثر ہونے کے بعد پاکستان واپس آنا ہے۔ دونوں میں غریب الوطنی یا ناسٹلجیا کی کیفیت موجود ہے۔ اب چونکہ عبداللہ حسین عورت کی نفسیات کو کھوجنے کا جتن کرتے ہیں اس لیے انھوں نے بے وطن یا جلاوطن لوگوں کے جذبات اور عورت کی ذہنی بے وطنی کے درمیان تعلق پیدا کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس اعتبار سے ناولٹ 'نشیب' اور 'واپسی کا سفر' ایک ہی خط مستقیم پر وضع کردہ ناولٹ نظر آتے ہیں۔ واضح رہے کہ عورت کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ اور ابدی بے قراری عبداللہ حسین کا خاص موضوع ہے۔ ان کے ناول 'اداس نسلیں' کی ہیروئن عذرا کا کردار بھی انھی خطوط پر وضع کیا گیا ہے۔ آسودگی اس کی زندگی سے بھی غائب ہے۔ وہ بھی کچھ بجھی بجھی سی عورت ہے۔ عبداللہ حسین کے یہاں ایک بات بہت ہی واضح ہے۔ وہ یہ کہ مادی آسائشوں اور تمول کا دل کی خوشی سے کوئی تعلق نہیں اور اپنے اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے وہ عورت کو محور فن بناتے ہیں جو کہ اپنی فطرت میں قدیم و جدید ہونے کے معاملات سے بلند تر ہے۔

غرض یہ کہ عبداللہ حسین کے یہ دونوں جدید ناولٹ فکری و فنی دونوں اعتبار سے کامیاب ناولٹ ہیں۔ اس وقت پاکستانی ناولوں میں بھی تجربے ہورہے ہیں۔ خوشیوں کا باغ (انور سجاد) اور دیوار کے پیچھے (انیس ناگی) جنم کنڈلی (فہیم اعظمی) راجہ گدھ (بانو قدسیہ) کاروان وجود (نثار بٹ) وغیرہ اس کی مثالیں ہیں لیکن عبداللہ حسین نے ان ناولٹوں میں بھی اپنے ناول والا اسلوب برقرار رکھا ہے ان کا دوسرا ناول 'باگھ' جدیدیت ہی کے زمرے میں آتا ہے اور انھیں کسی طور بھی روایتی ناولٹ یا ناول نگار کا طعنہ دے کر رد نہیں کیا جاسکتا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ان کی تحریروں میں اتنی جان ضرور ہے کہ وہ ہر دور میں زندہ رہیں اور تازگی کا بھی احساس دلاتی رہیں۔ اس لیے کہ ان کا فن عارضی کے بجائے انسان کے ابدی جذبوں سے بحث کرتا ہے۔

ماخذ: دریافت، کراچی جولائی اگست 1991

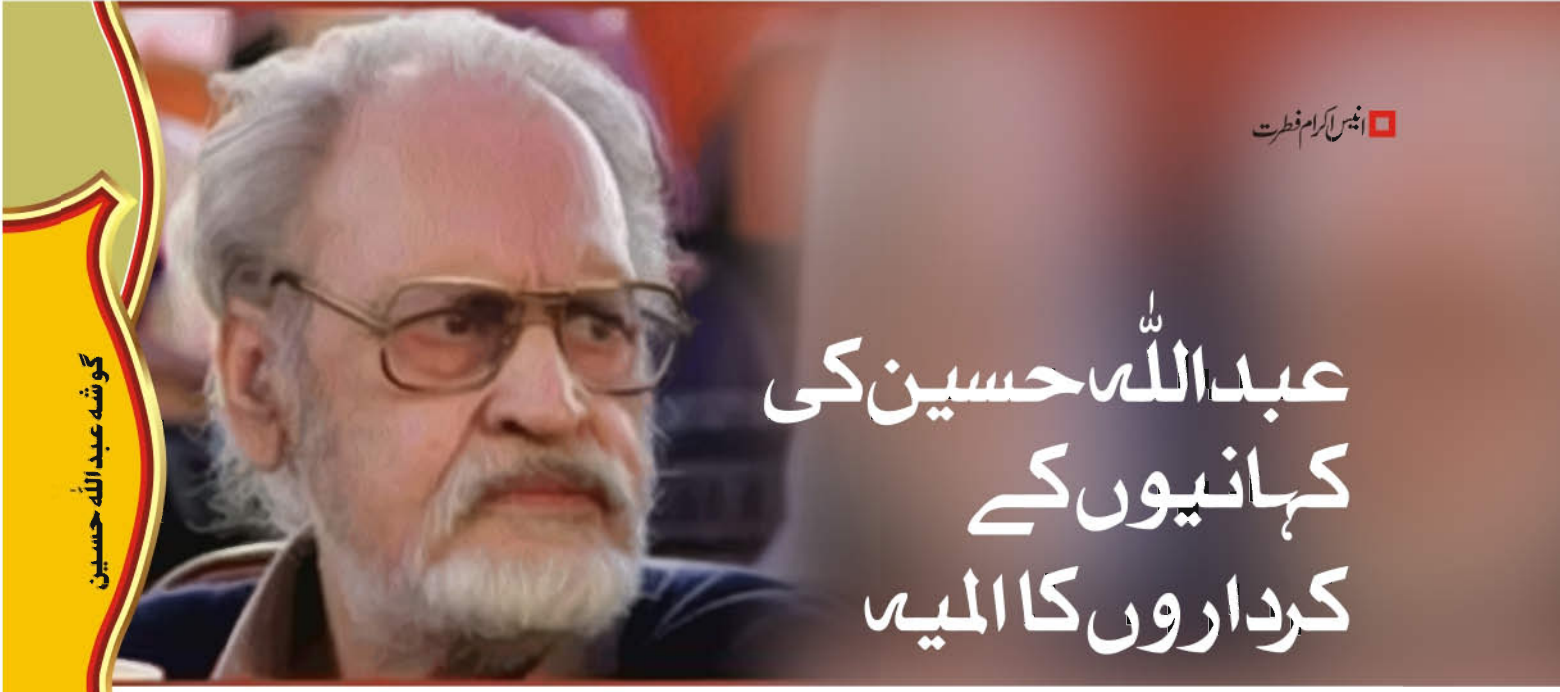

عبداللہ حسین کی کہانیوں کے کرداروں کا المیہ

انیس اکرام فطرت

باطنی عدم اطمینان، ناخوشی، افسردگی، اُداسی ورتنہائی، عمومی طور پر عبداللہ حسین کی کہانیوں کے کرداروں کا بنیادی مسئلہ ہے۔ ان کرداروں کی زندگیاں ظاہری طور پر نارمل ہیں۔ دنیاوی، مادی ضروریات، گھر، بنگلہ، گاڑیاں، سامانِ عیش و آرام، دولت، زمینیں، جائیدادیں، اولاد، اور وہ سب کچھ جس کے لیے ایک عام آدمی خواہش رکھتا ہے وہ سب ان کو میسر ہے مگر وہ عدم اطمینان، بے سکونی، ناخوشی، افسردگی، اُداسی اور تنہائی کا مسلسل شکار رہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ زندگی کے ہمہ وقت تحرک اور روزمرہ کے معمولات، اعمال و وظائف سے جڑے ہوئے ہیں۔ گویا ظاہری زندگی کے متحرک رواں دواں ہجوم میں شامل ہونے کے باوجود وہ باطنی سطح پر اس سرزمین زیست میں اجنبی، جلاوطن اور مہاجر ہیں۔

عبداللہ حسین کی کہانیوں کے کرداروں کی عمومی طور پر یہی کیفیت ہے لہٰذا ان میں ایسی باطنی کیفیات کے حوالے سے بڑی گہری مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی زندگیوں کے معمولات، طرزِ عمل اور رویے کافی حد تک آپس میں مماثلت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے طرزِ عمل اور رویوں کا تعین کرنے والی وجوہات یا ان کے المیوں کی نوعیت مختلف ہے۔

مثال کے طور پر بلانکا (’ندی‘) کا المیہ اُس کی پیدائش کا حادثہ ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی غیر قانونی اولاد ہے۔ اس بات کا علم ہی بلانکا کے لیے سوہانِ روح بن چکا ہے۔ پیدائش کا یہ المیہ اس کی سائیکی کا مستقل حصہ ہے جو اس کے نفسیاتی الجھاؤ، ہیجان، طرزِ عمل اور سماجی رویوں کا تعین کرتا ہے۔ ثروت (’پھول کا بدن‘) کا المیہ بلانکا سے مختلف ہے، وہ محبت کی ناکامی اور لاحاصلی کا شکار ہے۔

ثروت ایک طرف تو اپنے محبوب نعیم (جو ثروت کی محبت سے ناآشنا تھا) کی بے اعتنائی اور عدم توجہی کی وجہ سے المیے کا شکار ہوئی اور دوسری طرف خود اپنی زبان سے محبت کا اظہار نہ کر سکنے اور معاشرے کی بے جا پابند روایات اور لڑکی کی مرضی معلوم کیے بغیر شادی کر دینے کی روایت نے اُسے المیہ سے دوچار کیا ہے۔ اس کے بدن کی ناآسودگی اُس کے لیے روحانی آزار بن جاتی ہے جس کے ردِعمل میں شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ نعیم سے اپنی محبت کا جسمانی خراج وصول کرتی ہے اور اپنی نارمل زندگی کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

شوکت (’رات‘) زندگی میں اپنی محبت (جمال) حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے شادی کرتا ہے۔ کاروارِ جہاں میں اپنی محنت اور جدوجہد سے ایک کامیاب صحافی بن جاتا ہے۔ اُسے ایک متوسط طبقے کی اچھی زندگی میسر ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود باطنی طور پر وہ ایک انجان سی لاحاصلی اور مغائرت کا شکار رہتا ہے۔ زندگی کے معمولات میں جمال کے ساتھ گھومتے پھرتے ہوئے وہ عجیب و غریب اور مضحکہ خیز حرکات کرتا ہے۔ ایک نامعلوم سی بے کلی اور تنہائی کا شکار رہتا ہے۔ اس کے باطن میں ایک وسعت پذیر خلا در خلا ٹھہر سا گیا ہے جس میں اُس کی روح بھٹکتی پھرتی ہے اور پھر وہ آخر کار خود کو سمندر کی گہری وسعتوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ شوکت (شوکی) کا المیہ زندگی کی بے معنویت، لایعنیت اور بے وقعتی کے احساس سے جنم لیتا ہے۔

اسی طرح شیخ عمر دراز اور اس کے بیٹے آفتاب (مہاجرین) کے المیے کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہے لیکن یہاں زندگی کی بے معنویت، لایعنیت اور بے وقعتی کا احساس نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ شیخ عمر دراز جو متوسط طبقے کا خوش حال فرد ہے ”کچھ کہے سنے اور ظاہر کیے بغیر اپنے آپ کو“ بندوق مار کر خودکشی کر لیتا ہے اور بے معنویت کا یہ احساس اگلی نسل میں بھی منتقل ہوتا ہے۔

”وقت کی اور عمر کی اور آدمی کے بدن کی کوئی حقیقت نہیں اور صرف ایک شے پر دُنیا کا وجود قائم ہے اور وہ آدمی کے دل کی یاد ہے جو نسل در نسل دنیا کو باندھتی ہے۔“

یہ احساس آدمی کے دل کی یاد سے پھوٹتا ہے اور اس دل کی یاد پر دنیا کا وجود قائم ہے اور دل کی یاد کے سامنے وقت، عمر اور انسان کے بدن کی کوئی حقیقت یا حیثیت نہیں۔ یادیں ہمیشہ گزرے ہوئے لمحوں، دنوں یا سالوں پر محیط ہوتی ہیں جو وقت کے گزر جانے، عمر کے ڈھلنے اور بدن کی شکست و ریخت کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ پیچھے رہ جانے والا وقت، گزرے ہوئے مقام، جگہیں، گھر، گلیاں، بازار، کھیت، کھلیان، باغات، درخت، پھول کلیاں، ندیاں، بارشیں، منظر، لوگ، رویے، ماحول، اشیا اور پوری زندگی، جب یہ سب کچھ پیچھے رہ جائے تو انسان اُن کی یادوں کے ساتھ وقت کے ہر اگلے پڑاؤ میں، جہاں بہت کچھ اور بعض اوقات سب کچھ بدل چکا ہوتا ہے، وہاں وہ انسان ایک مہاجر ہوتا ہے۔ دل کی یادیں انسان کے خاتمہ تک اور پھر اگلی نسل میں منتقل ہوتی ہے۔ لہٰذا اس معمورۂ دنیا میں ہر انسان ایک مہاجر ہے اور دل کی یادیں جس پر دنیا کا وجود قائم ہے اس مہاجر کا کل اثاثہ ہوتی ہیں۔ دنیا کی ساری خواہشیں اور ساری مادی اشیا حاصل ہو بھی جائیں تب بھی دل کی یاد کے سامنے یہ سب کچھ بے معنی، بے وقعت اور لایعنی ہو کر رہ جاتا ہے جس سے اُکتاہٹ اور نفسیاتی ہیجان پیدا ہوتا ہے اور بعض حساس لوگ اس اکتاہٹ اور ہیجان سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتے ہیں جیسا کہ آفتاب کا والد شیخ عمر دراز کرتا ہے۔ (یا ’رات‘ کا کردار شوکت کرتا ہے۔)

لیکن اگلی نسل کا آفتاب اگرچہ اسی قسم کی ذہنی اور نفسیاتی اذیت میں گرفتار ہے مگر وہ اپنے باپ کی طرح خودکشی نہیں کرتا یا شاید ابھی چالیس سال کی عمر تک وہ اس سطح کے شدید نفسیاتی الجھاؤ اور ہیجان تک نہیں پہنچا کہ اپنی زندگی ہی ختم کر ڈالے۔ کہانی نگار نے اس موڑ پر کہانی ختم کر دی ہے اس کے علاوہ اس کہانی میں شیخ عمر دراز کے پورے قصے میں ایک چھوٹا بچہ (آفتاب) باپ کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اسی طرح آفتاب

کے پورے قصے میں کبھی اُس کا چھوٹا بیٹا فاروق قصے کا ایک کردار ہے گویا یہ گھرانہ ایک اُداس نسل ہے۔ دونوں قصوں کے ماحول میں فرق ہے۔ پہلے قصے میں دیہات اور ماحول کی وسعت اور جزئیات نگاری میں مصنف کی کمال ہنرمندی کے ساتھ ساتھ ایک نوع کی یکسانیت کا احساس بھی ابھرتا ہے۔ جبکہ آفتاب والے قصے میں ایک بھرپور شہر کا ماحول بھرپور جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ بہت خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ دونوں کردار (شیخ عمر دراز اور آفتاب) کہانی میں موجود ماحول میں گھومتے پھرتے ہوئے اس ماحول سے وابستہ اپنے اپنے ماضی کی یادوں کے عکس در عکس اثر رنگ میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کے ذہن، دل اور تصورات میں ان کے ماضی اور حال کی اَن گنت تصویریں آگے سے پیچھے کی طرف اور پیچھے سے آگے کی طرف مسلسل حرکت پذیر رہتی ہیں۔ دل کی یاد ماضی اور حال کی یادوں کے اندھیروں اجالوں میں لیے لیے گھومتی رہتی ہیں۔

'دھوپ' میں سعید کی کہانی بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ بلکہ 'دھوپ' اور 'مہاجرین' جڑواں کہانیاں محسوس ہوتی ہیں۔

''بارش شراٹے سے ہو رہی تھی اور دن کا اجالا گھٹتا جا رہا تھا۔ آفس کے اندر کوئی شے بڑی نازک مگر قدیم اور زور آور ٹوٹ کر آزاد ہو چکی تھی اور لہو کے ساتھ گردش میں تھی۔ وہ دل کے سر ہونے تک جیتا رہا تھا اور اس بات پر نہ خوش تھا نہ خفا۔ بس بارش کے اَن گنت قطروں کی تھاپ کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا اور دل میں جانتا تھا کہ ان میں نہ رنگ ہے، نہ بو، نہ لے صرف حیات ہے۔''

درج بالا سطریں کہانی کا اختتام ہیں۔ شراٹے کی بارش، دن کے اجالے کا گھٹنا، اندر کسی نازک قدیم زور آور شے کا ٹوٹ کر آزاد ہونا، لہو کے ساتھ گردش میں رہنا، دل کے سر ہونے تک جیتے رہنا، اس بات پر نہ خوشی نہ خفگی، بارش کے قطروں میں نہ رنگ، نہ بو اور نہ ہی لے کا ہونا، صرف حیات کا ہونا، یہ سطریں سعید کی کہانی اور اس کے المیے کا نچوڑ ہیں۔ تیز بارش اور دن کے اجالے کا گھٹنا دراصل ماضی کی یادوں کے ساتھ ڈھلتی عمر میں آئندہ زندگی کے کم ہونے کے احساس کا کرب ہے۔ ماضی کی یادیں بارش کے قطروں کی طرح ہیں جن میں نہ رنگ ہے نہ بو اور نہ ہی لے باقی ہے بس یہ یادیں ہیں اور زندہ ہیں اور ان کے ساتھ سعید بھی۔ وہ نازک قدیم اور زور آور شے جو ٹوٹ کر آزاد ہو کر خون کی گردش میں شامل ہو چکی ہے وہ اس کے جوان ماضی کی ایک خواہش جو اب حسرت بن کر لہو میں رینگتی ہے اور وہ دل کے سر ہونے تک جیتا رہا مگر اس نازک قدیم اور زور آور آرزو کو عمر رفتہ میں دشتِ رائیگاں کی جادہ پیمائی اور مسافتوں کی لاحاصلی نے پاشکستہ کر دیا ہے۔ یہی وقت کا جبر ہے۔ پاشکستہ مسافر لاحاصل آرزوؤں تمناؤں کی گٹھری اٹھائے گم صم، اب راستے اُسی کے لیے چلتے ہیں آرزوئیں تمنائیں خزاں کے خشک زرد پتوں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتی ہیں۔ مسافر کے دل میں منزل پانے کی خواہش کی شدت اور قوت کی حدت کم ہو چکی ہے۔ وہ زندہ زندگی کی کشش سے آزاد، بے نیاز اور غیر جانبدار ہو گیا ہے۔ جذبات و کیفیات بے رنگ، یک رنگ ہو چکے، نہ خوشی نہ غم سب کچھ ایک جیسا۔ یہ سب کردار دریا کی گزرگاہ پر آباد ہونے والے بھربھری ریت کے ٹیلوں کی طرح ہیں۔ وقت اور زندگی کا بہاؤ ان کو مٹا دیتا ہے۔ بربادی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ وہ اپنے وجود کو یا تو خود ہی مٹا دیتے ہیں یا اسے لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وجود میں حیات تو باقی رہتی ہے مگر زندگی نہیں۔ اس حیات میں ان کے لیے نہ

عبداللہ حسین کے افسانوں میں وقت بھی ایک کردار ہے، بہت توانا، زور آور اور بے بس کر دینے والا۔ زیر نظر تمام کہانیوں میں یہ کردار بہت اہم ہے۔ زور آور اور بے بس کر دینے والا۔ 'جلاوطن' میں بوڑھے کی کہانی 'ندی' میں ندی اور نیا گرافالز کا پانی زندگی اور وقت کی علامت ہے۔ 'ندی' کی کہانی ایک اہم کردار سلطان حسین کی زبانی ہے اور ساری کہانی گزرے ہوئے وقت کے ڈھنڈلکوں میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ اپنی پرتیں کھولتی ہے۔ 'سمندر' کا تو مرکزی کردار ہی وقت ہے۔ یہاں زندگی اور وقت ایک دوسرے کا 'Melting Pot' بن گئے ہیں اور یہ "Melting Pot' پھیل کر سمندر بے کردار میں ڈھل گیا ہے جو فیروز سے مکالمہ کرتا ہے اور کبھی یہاں مکالمہ اور خود کلامی آپس میں مدغم ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

رنگ ہوتا ہے نہ بو، نہ لے۔ بس ایک حیاتِ بے مصرف جو نہ چلتی ہے نہ رکتی ہے۔

عبداللہ حسین کے افسانوں میں وقت بھی ایک کردار ہے، بہت توانا، زور آور اور بے بس کر دینے والا۔ زیر نظر تمام کہانیوں میں یہ کردار بہت اہم ہے۔ زور آور اور بے بس کر دینے والا۔ 'جلاوطن' میں بوڑھے کی کہانی 'ندی' میں ندی اور نیا گرافالز کا پانی زندگی اور وقت کی علامت ہے۔ 'ندی' کی کہانی ایک اہم کردار سلطان حسین کی زبانی ہے اور ساری کہانی گزرے ہوئے وقت کے ڈھنڈلکوں میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ اپنی پرتیں کھولتی ہے۔ 'سمندر' کا تو مرکزی کردار ہی وقت ہے۔ یہاں زندگی اور وقت ایک دوسرے کا 'Melting Pot' بن گئے ہیں اور یہ "Melting Pot' پھیل کر سمندر بے کردار میں ڈھل گیا ہے جو فیروز سے مکالمہ کرتا ہے اور کبھی یہاں مکالمہ اور خود کلامی آپس میں مدغم ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ سمندر کا پھیلاؤ، وسعت، گہرائی اور جبروت فیروز کی لاحاصلی اور دل کی کسک کو اٹھا کر ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پھینک دیتا ہے یہاں وقت اور زندگی سمٹ کر ایک ندی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ فیروز اپنے ماضی، گزرے ہوئے وقتوں کے کنول ندی کے پانی میں تیرتے ہوئے دیکھ کر دل میں کسک کی اٹھان کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور پھر وہ دل کی یاد کی کاغذی ناؤ کو اسی ندی کے حوالے کر دیتا ہے کہ ندی کا یہ پانی یادوں کی کاغذی ناؤ کو نیاگرا فالز کی اچھلتی برفانی لہروں تک لے جائے کہ ان لہروں کی جھاگ میں بلانکا کی خوشبو اٹھتی ہے جو خوشبو بکھیرتی ہے فیروز کے دل کے مضافات میں۔

اسی طرح 'دھوپ'، مہاجرین، واپسی کا سفر، رات، وقت اور وقت کے تسلسل کے عنوانات ہیں۔ ان کہانیوں میں وقت آگے اور پیچھے کی طرف دوڑتا ہے۔ حال سے ماضی کے دھندلے جزیروں کی طرف اور ماضی سے حال کے جنگلوں کی طرف اور یوں حیات کی رگوں میں دوڑتے ہوئے ان کرداروں اور ان کی کہانیوں کو جنم دیتا ہے۔ لیکن ان کرداروں کی آنکھوں سے آنسو بن کر نہیں ٹپکتا۔ 'دھوپ' اور 'مہاجرین' کے خدوخال میں بہت مشابہت جھلکتی ہے۔ دونوں کہانیوں میں انسانی زندگی کی تمام خوشیاں، غم، دکھ، اداسیاں، تنہائیاں، یادیں، نسل در نسل رواں نظر آتی ہیں۔ دونوں کہانیوں میں باپ اور بیٹے ساتھ ساتھ ہیں۔ بیٹے آنے والا کل ہیں جبکہ باپ ماضی میں اپنے باپ کے ساتھ گزرے ہوئے وقتوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ یوں ان کہانیوں میں ماضی اور حال ایک اکائی کی صورت اختیار کر گئے ہیں لہٰذا اس کرۂ ارض کی اسٹیج پر ہونے والے ڈرامے میں سب پر غالب اور زور آور کردار وقت ہے جو سب کچھ طے کرتا ہے اور سب کچھ کا خاتمہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ''یہ وقت کا ظلم ہے جس پر ہم قادر نہیں جس کی...'' اس میں انسانی کردار ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، یہ انسانی ڈراما صدیوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس کا آغاز اور انجام کوئی نہیں اس میں کوئی انٹرول نہیں۔ ہر شے گول ہے اس لیے ہر شے اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ یہ تواتر ہے جس کی وجہ سے یکسانیت پیدا ہوتی ہے۔

عبداللہ حسین کی کہانیوں میں اور ناولوں میں بھی فلسفہ وجودیت (Existentialism) بے معنویت اور لایعنیت (Absurdily) کی گہری چھاپ ملتی ہے جو ان کہانیوں کو ادبی فلسفے کا درجہ عطا کرتی ہے۔

مضمون کی طوالت سے بچنے کے لیے یہاں میں صرف تین کرداروں سے متعلق اپنی معروضات تھوڑی تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔ میں اپنی معروضات کو صرف کہانیوں کے کرداروں کے حوالے تک محدود کروں گا۔ کہانیوں کے باقی فنی اور فکری پہلوؤں کے جائزے کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہوگی۔

جہاں انسانی تعلقات اور رشتوں ناتوں کے نتیجے میں انسانوں میں باہمی چپقلش، رقابتیں، دشمنیاں اور نفرتیں جنم لیتی ہیں، وہاں ان میں باہمی رواداری، قرابتیں، دوستیاں، محبتیں اور حسن سلوک کی مثبت قدریں بھی رواج پاتی ہیں۔ خیر و شر انسانی بستیوں کی ہی فصلیں ہیں جو رویوں کے ہر دم بدلتے موسموں کی بدولت ہی پھلتی پھولتی ہیں۔ وسیع تر تناظر میں یہی خیر و شر تمام عالمی ادب کی مشترکہ اساس اور میراث ہے۔ انسانی رابطے، باہمی میل جول، رشتے ناتے، عمل ردعمل، سیاسی، سماجی، معاشی، نفسیاتی، طبقاتی، اجتماعی، انفرادی، نظریاتی اور مابعدالطبیعیاتی نظریات و اعتقادات اور انسانی رویوں کے مثبت و منفی ملاپ یا ٹکراؤ اور غیر مرئی عمرانی معاہدے کے نتیجے میں انسانی سماج اور تمدن و تہذیب کی صورت گری تشکیل پاتی ہے اور یہی تمام عناصر ادب اور دیگر فنون کی آبیاری کرتے ہیں۔

جس طرح کسی بھی سماج میں ہر فرد معاشرے کی اجتماعی صورت گری میں برابر کا شریک ہوتا ہے اسی طرح ناول، افسانہ یا ڈراما میں بھی انسانی کردار انفرادی سطح کے ساتھ ساتھ باہمی میل ملاپ، رویوں اور عمل ردعمل کے ذریعے فن پارے کی مجموعی شکل و صورت بناتے ہیں۔ ان فن پاروں میں رونما ہونے والے واقعات یا تو کرداروں کے عمل ردعمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں یا پھر یہ واقعات خارجی طور پر وقوع پذیر ہونے کے بعد کرداروں پر ہونے والے اثرات اور ان کے ردعمل سے ان فن پاروں کا ارتقا ہوتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم عبداللہ حسین کی کہانی 'ندی' کو دیکھتے ہیں تو اس میں اہم اور مرکزی کردار بلانکا ہے۔ ساری کہانی اُسی کے اردگرد گھومتی ہے۔ عبداللہ حسین کی کہانیوں کے کرداروں میں یہ کردار سب سے زیادہ مضبوط اور شاہکار کردار ہے۔ یہ بلاشبہ کردار نگاری کے حوالے سے اردو ادب کے چند بے مثال کرداروں میں شامل ہے۔

بلانکا کے کردار کا مسئلہ بنیادی طور پر وہ نفسیاتی ہیجان اور اذیت ہے جو اس کی پیدائش کے حادثے (جس کا اُسے علم ہے) کی پیداوار ہے اور اس اذیت سے چھٹکارا کسی صورت بھی ممکن نہیں۔ اس حادثے سے صرف نفسیاتی الجھاؤ اور مسلسل ذہنی اذیت نے ہی جنم نہیں لیا بلکہ اس کے علاوہ تنہائی، بیگانگی، ناخوشی و افسردگی بھی بلانکا کا مقدر بن چکی ہے۔ اگرچہ جرم اس نے نہیں کیا مگر وہ خود کو مجرم سمجھتی ہے اور یہ سب کچھ وہ سارے جہان سے چھپا کر زندگی کے تحرک اور ہنگاموں میں شامل ہے۔ یہ راز وہ کہانی کے کلائمکس پر صرف سلطان حسین پر افشا کرتی ہے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ وہ جانتی ہے کہ وہ سلطان حسین اس سے واقعی محبت کرتا ہے لیکن وہ اس سے شادی نہیں کرسکتی:

''تمھارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے۔ اُس نے پوچھا۔ آٹھ ہزار میل۔ سلطان... اس نے کہا، ہم زندگی میں ہزاروں میل طے کریں گے لیکن یہ آٹھ ہزار میل شاید کبھی طے نہ کر پائیں۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

اور پھر وہ کہتی ہے:

جس طرح کسی بھی سماج میں ہر فرد معاشرے کی اجتماعی صورت گری میں برابر کا شریک ہوتا ہے اسی طرح ناول، افسانہ یا ڈراما میں بھی انسانی کردار انفرادی سطح کے ساتھ ساتھ باہمی میل ملاپ، رویوں اور عمل ردعمل کے ذریعے فن پارے کی مجموعی شکل و صورت بناتے ہیں۔ ان فن پاروں میں رونما ہونے والے واقعات یا تو کرداروں کے عمل ردعمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں یا پھر یہ واقعات خارجی طور پر وقوع پذیر ہونے کے بعد کرداروں پر ہونے والے اثرات اور ان کے ردعمل سے ان فن پاروں کا ارتقا ہوتا ہے۔

''میں تمھیں یہ سب کچھ اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم سے شاید دوبارہ ملاقات نہ ہو۔''

سلطان سے وہ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ دراصل وہ اپنے دل کا غبار ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ صرف Catharsis کے لیے اور پھر وہ جانتی تھی کہ سلطان اپنے وطن لوٹ جانے والا ہے۔ آٹھ ہزار میل دور۔ شاید ہمیشہ کے لیے اور شاید اُس سے دوبارہ کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ سلطان سے گفتگو میں واضح اور کھلے الفاظ میں میرو (جو اپنے وطن اٹلی واپس جاچکا ہے) سے اپنی چاہت، اور محبت کا اظہار کرتی ہے۔

''اُن دنوں میں اُس کے (میرو کے) پیچھے دیوانی ہو رہی تھی کیونکہ وہ مجھے تباہ کرنے پر قادر تھا۔''

میرو سے اپنی محبت کا اقرار اور اظہار وہ کہانی میں متعدد بار کرتی ہے۔ میرو کہانی میں حاضر نہیں غائب ہے اُس محبت کا اظہار اور اُس کا ذکر وہ بیتے دنوں کے حوالے سے صرف سلطان سے ہی کرتی ہے۔ لیکن میرو سے اس کی محبت بھی یک طرفہ تھی وہ سلطان کو بتاتی ہے:

''یہ میری خوش قسمتی ہے۔ وہ بولی، کہ آج تک میرو کے علاوہ کسی مرد نے مجھے متاثر نہیں کیا اور میرو نے خود ہی میرے قریب آنے سے احتراز کیا۔ اُس نے مجھ پر بڑا احسان کیا اور میں اُس کی شکر گزار ہوں لیکن سلطان...''

درج بالا مکالموں کے اقتباسات میں بلانکا کی زبان سے نکلنے والے الفاظ، لہجہ اور ادائیگی اور مکالمے کی بُنت بہت خوبصورت اور حقیقت پسند ہونے کے ساتھ بلانکا کے کردار، اُس کی شخصیت (جس کا مکمل خاکہ کہانی میں مختلف جگہوں پر اُس کے خود خیال انداز اور طرزِ تکلم کے ذریعے کہانی نگار نے تصویر کیا ہے) اور اس کے المیہ اور ذہنی ہیجان کے عین مطابق ہے۔ ان مکالموں کی ظاہری اور باطنی گہرائی کا کرب اور کسک قاری کو فوری متاثر کرتا ہے۔

میرو سے متاثر ہونے اور محبت کرنے کی ایک وجہ تو بالکل واضح ملتی ہے وہ یہ کہ میرو اور بانکا کی پیدائش کا حادثہ ایک جیسا ہے۔ دونوں کے المیے کا دکھ یکساں ہے اور وہ اسی حوالے سے میرو سے مطابقت پاتی ہے۔ میرو واحد مرد ہے جسے وہ اپنے ہی قبیلے کا فرد سمجھتی ہے۔ لیکن محبت کی شدید خواہش کے باوجود میرو کی طرف سے بے اعتنائی نے اُسے اور زیادہ تنہا اور دکھی کر دیا ہے۔

میرو اپنے وطن واپس جاچکا ہے۔ اب وہ اس کی یادوں میں کسک بن کر بستا ہے۔ لیکن وہ میرو کو ایک 'سمبل' کہتی ہے۔ وہ اُس کے لیے کس چیز کا سمبل ہے؟ محبت کا؟ بے اعتنائی و بے وفائی کا؟ ماضی میں ملاقاتوں اور خوشگوار لمحوں کا؟ بھائی چارے کا؟ یا اُس جرم کی مماثلت کا جو دونوں کے ماں باپ سے الگ الگ سرزد ہوا؟ یا محرومی اور لاحاصلی کا؟

بلانکا سلطان کو بتاتی ہے:

''میں اُن دنوں اُس (میرو) کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی کیونکہ وہ مجھے تباہ کر دینے پر قادر تھا... لیکن اُس (میرو) نے مجھ سے کہا۔ زندگی میں اگر خوش رہنا ہے تو دنیا سے بھائی چارہ کرو پاگل لڑکی۔ باقی سب بیکار ہے۔ سب بھول جاؤ، میں نے اطمینان کا سانس لیا اور آہستہ آہستہ اپنی دیوانگی پر قابو پانے لگی۔ لیکن میرے پاس اس کا ذہن نہ تھا۔ وہ اپنے حادثے کو بھول گیا تھا میں اپنے حادثے کو نہیں بھول سکی۔''

پھر اُس نے ایک مرتبہ سلطان سے کہا:

''میرو کو کون یاد کرتا ہے۔ وہ تو محض ایک سمبل تھا، 'سمبل'، 'ہاں' اُس نے مختصراً کہا۔

دفعتاً سلطان بلانکا کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتا ہے کیونکہ سلطان حسین پر جہاں بلانکا کی شخصیت کے کچھ اسرار کھلے وہاں 'بھائی چارہ' اور 'سمبل' کے الفاظ نے حیرت اور اسرار کا ایک اور پردہ بلانکا کی شخصیت کے گرد تان دیا۔

دراصل اندر کی مستقل بے اطمینانی اور کرب ناک افسردگی نے بلانکا کی سائیکی کو بری طرح متاثر کیا وہ اپنے بارے میں سب کچھ دنیا سے چھپانے کے لیے کئی قسم کی شخصیات میں بٹ چکی اُسے اپنی پہچان اور شناخت چاہیے۔ زندگی میں ظاہری شمولیت اُس کی شخصیت کا ایک روپ ہے وہ دوستوں سے ملتی جلتی ہے پوری یونیورسٹی میں مشہور۔ دوستوں کے ساتھ مختلف تقاریب اور ریستورنٹس میں جاتی ہے۔ کبھی کبھی عجیب و غریب حرکتیں کرتی ہے قہقہے بھی لگاتی ہے۔ ڈانس کی محفلوں میں شرکت کرتی ہے۔ کئی ایک دوستوں سے قربت کے تعلقات بھی قائم کرتی ہے۔ سلطان کو چومنے کے لیے بھی کہتی ہے۔ مختلف موضوعات پر فنکارانہ انداز میں گفتگو بھی کرتی ہے۔ موضوعات میں کتابیں، موسیقی، سیاسیات، مختلف اسکینڈلز وغیرہ شامل ہوتے ہیں لیکن وہ یہ سب کچھ لوگوں کو خصوصاً مردوں کو مرعوب کرنے کے لیے کرتی ہے اور مردوں سے بچنے کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کرتی ہے کیونکہ کسی کو بھی قربت کی ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دینا چاہتی۔ لہٰذا اس نے اپنے اوپر کئی خول چڑھا رکھے ہیں۔ ایک زرہ بکتر سی پہن رکھی ہے۔ وہ سلطان کو یہ بات اس طرح کہتی ہے:

''گھر میں میری دو شخصیتیں ہوگئی ہیں۔ یہاں پہنچنے پر تین ہوگئیں۔ چار ہوگئیں، پتا نہیں کتنی ہوگئیں۔''

کئی شخصیتوں میں بٹا ہوا انسان، Persnality Crisis یا Identity Crisis یعنی شخصیت کی شناخت کے مسئلے سے دوچار رہتا ہے۔ شناخت کے بغیر قدموں تلے زمین نہیں رہتی جہاں وہ قدم جما کر چل سکے اور وہ معاشرے میں معلق شخصیت بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے کردار کا انجام خودکشی یا موت کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

'رات' میں شوکت خودکشی کرتا ہے اور 'مہاجرین' میں شیخ عمر دراز۔ جبکہ 'ندی' میں بلانکا بظاہر حادثاتی موت کا شکار ہوتی ہے لیکن کہانی کار نے 'پولیس رپورٹ کے مطابق' کے الفاظ استعمال کر کے یعنی رپورٹ کے مطابق بلانکا کی موت حادثاتی تھی۔ اس واقعہ میں بھی خودکشی کے امکان کی گنجائش رکھی ہے۔

بلانکا کی پیدائش کے حادثے کو عبداللہ حسین نے انفرادی سطح سے اٹھا کر آفاقیت کے بام عروج تک پھیلا دیا ہے جس سے یہ کہانی ایک انسان کی کہانی نہیں بلکہ ازل میں انسان کی تخلیق اور پیدائش اور اس کے اس کرۂ ارض پر ورود و ظہور کی کہانی بن گئی ہے۔

''دنیا میں تمام بچوں کی پیدائش محض حادثاتی نوعیت کی ہوتی ہے۔''

''گو اس کرۂ ارض پر ساری انسانی آبادی کی پیدائش محض حادثاتی نوعیت کی ہے۔''

''یہ وقت کا ظلم ہے جس پر ہم قادر نہیں۔''

اور

''یہ لوگ زمانے کا ضمیر ہوتے ہیں۔''

''اس میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ تم اکیلی نہیں ہو... بلانکا۔''

بلانکا کا مسئلہ ایک سنگین سماجی مسئلہ ہے۔ معاشرہ ایسے بچوں کو کسی طور پر بھی قبول نہیں کرتا۔ انھیں برابری کا مقام نہیں دیتا۔ اُنھیں اُن کے ماں باپ کے جرم کی سزا ملتی ہے۔ حالانکہ وہ معصوم اور بے گناہ ہوتے ہیں۔ بلانکا کو بھی ایسے دوسرے بچوں کی طرح پیدائش کے بعد لاوارث بچوں کے ہوم میں داخل کر دیا گیا تھا۔ ماں باپ نے اپنے چند لمحوں کی آسودگی اور جسمانی لذت کی خاطر کسی کو صدیوں کے کرب اور ہر لمحہ سانسوں کے بڑھتے ہوئے بوجھ کو اٹھانے کے جبر مسلسل کے لیے جنم دیا۔ کسی کی لمحاتی لذت آمیز آسودگی کسی دوسرے کے لیے ہمیشہ رِستا رہنے والا زخم بن جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ وہ اسی کرب کے ساتھ سانسوں کا بوجھ اٹھائے جلوسِ جہاں میں سرگرداں رہتی ہے۔ بلانکا اس بوجھ کی تھکن کے باوجود اس جلوس کارواں سے علیحدہ ہو کر پڑاؤ نہیں کرنا چاہتی اور اس نے اپنی ریزہ ریزہ روح کو چھپانے کے لیے اپنے تھکے وجود پر کئی خول چڑھا رکھے ہیں۔ یہ خول کسی کو بھی اپنے اندر جھانکنے سے روکنے کے لیے ایک ڈھال ہے۔ بلانکا کی ظاہری شخصیت میں بڑی کشش ہے۔ چنچلتا ہے، شوخی ہے، قہقہے ہیں، جذبات ہیں اور ایک نوع کی بے نیازی ہے۔ وہ زندگی کے ہنگاموں میں شامل رہتی ہے۔ لیکن اس کے باطن میں دُکھ، تنہائی اور اُداسی نے سن لگا رکھی ہے جسے پاٹنے پر وہ قادر نہیں ہے یہ سفاک وقت کا ظلم ہے جو ہر حال میں سہنا پڑتا ہے۔

بلانکا پر اپنی پیدائش کے المیے کا راز اُس وقت کھلا تھا تب وہ اپنے دوست رابرٹ کے ساتھ جھوٹ موٹ کے میاں بیوی بن کر لاوارث بچوں کے ہوم گئے تھے جس کا ذکر وہ سلطان سے کرتی ہے:

''لیکن جاتے جاتے اپنی بدحواسی میں وہ (ہوم کی میٹرن) مجھے بتا گئی کہ یہ لڑکی سترہ سال ہوئے اُس (میٹرن) کے سامنے ہی لائی گئی تھی، اور یہ کہ جاڑوں کی اُس صبح کو یہ لڑکی شہر سے باہر باغ کے ایک بنچ پر ٹھٹھرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کی ماں کے بارے میں کسی کو علم نہ تھا باپ قانونی طور پر شاید کوئی تھا ہی نہیں۔''

جاڑوں کے سرد موسم میں باغ کی ٹھنڈی فضا اور بنچ کی ٹھنڈک بلانکا کی رگوں میں ہمہ وقت ٹھٹھرتی تھی۔ اس کا جسمانی وجود زندگی کے ہنگاموں کی حدت کے حصار میں رہتا مگر اس کی روح کسی مردہ خانے کی ٹھٹھری فضا میں معلق رہتی۔ لیکن زندگی کی حدت کا حصار آخر کار ٹوٹنا ہی تھا اور بس روح کی ٹھنڈک نے ماس کی حدت کے حصار کو توڑ ڈالا اور دونوں نیاگرا فالز کی برفانی لہروں کی آغوش میں باہم ہم آہنگ ہوئے۔

(2)

بلانکا کے مقابلے میں ثروت (پھول کا بدن) کا المیہ کمتر سطح کا ہے۔ ایک اعتبار سے ثروت اور بلانکا کے کرداروں میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے وہ دونوں جیتی جاگتی زندگی کے معمولات میں شریک ہیں۔ لیکن دونوں اندرونی طور پر غیر مطمئن ناخوش، افسردہ اور بے سکون ہیں گو دونوں کی باطنی کشمکش اور ہیجان کی وجوہات بالکل مختلف ہیں۔

ثروت تیس بتیس سالہ ایک شادی شدہ لڑکی ہے۔ اس کی بے اطمینانی، ناخوشی اور افسردگی کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے رسم و رواج اور روایات کے مطابق لڑکی سے اُس کی شادی کے لیے مرضی یا رائے معلوم نہیں کی جاتی یا اُسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ثروت یہ الفاظ نعیم سے کہتی ہے:

''تمھیں پتا ہے اس کا مطلب؟ جہاں ہم رہتے ہیں وہاں معقول شریف لڑکی اللہ میاں کی گائے ہوتی ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ جو حیوان مال ہوتی ہے۔ محض قبول کر لی جاتی ہے اور نظر انداز کر دی جاتی ہے اور مستقل نظر انداز کی جاتی ہے..... مستقل۔''

شادی سے متعلق لڑکی کی مرضی یا رائے نہ معلوم کرنے یا اُسے نظر انداز کرنے کے نتیجے میں احساسِ کمتری لڑکی کی سائیکی کا مستقل حصہ بن جاتا ہے۔ وہ ساری عمر ماتحتی اور تابع فرمانی میں گزار دیتی ہے۔ یہ ماتحتی اور تابع فرمانی اگرچہ خاندان اور معاشرے میں لڑکی کی حیثیت کو کمتر درجہ دیتی ہے اور ایک انسان کو حیوان یا اللہ میاں کی گائے کی کمترین سطح تک گرانے کے مترادف ہے یہ نفسیاتی احساس کمتری اُس کی آئندہ زندگی کے اعمال اور رویوں کا تعین کرتا ہے۔ یہ مستقل احساس اپنی جگہ عورت کے لیے ایک المیہ سے کم نہیں لیکن اگر لڑکی کسی سے محبت کرتی ہو اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہو تو یہ المیہ اُس کے لیے سوہان روح بن جاتا ہے اور بعض اوقات آئندہ کی زندگی میں وہ لڑکی معاشرے سے انتقام لے کر اپنے شدید ردعمل کو ظاہر کرتی ہے۔

دوسری وجہ نعیم کا غیر شعوری رویہ ہے۔ ثروت مشرقی روایات میں پلی بڑھی لڑکی ہے وہ نعیم کو شدت سے چاہتی ہے

لیکن کبھی اس چاہت کا اظہار واضح اور کھلے انداز میں نہیں کرسکی۔ نعیم اُس کی چاہت سے بالکل بے خبر اور بے نیاز رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ثروت کے گھر والوں کے کہنے پر نعیم ثروت کی شادی محمود سے کروادیتا ہے۔ جبکہ ثروت اندر ہی اندر نعیم کی طرف سے لاتعلقی اور بے توجہی پر سخت دکھی اور رنجیدہ ہے۔ اس بات کا اظہار وہ کہانی میں اک موڑ پر کرتی ہے۔ ثروت کی شادی شدہ زندگی بظاہر بہتر اور معمول کے مطابق گزر رہی ہے۔ اُس کا شوہر محمود ایک اچھا انسان ہے۔ اُس نے کبھی ثروت کو دکھ یا تکلیف نہیں پہنچائی۔ اس صورتِ حال میں ثروت کے المیے کی ذمے داری خود اسی کے اوپر ہے۔

حقیقی زندگی کی سفاک حقیقتیں اپنا جال بُنتی رہتی ہیں لیکن ثروت جیسے کردار اپنے پرانے خوابوں کے جال میں پھنسے پھنسے ہی زندگی بتا دیتے ہیں اور کبھی ان سفاک اور ناپسندیدہ حقیقتوں کے جال کو توڑنے کا موقع مل جاتا ہے تو یہ اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں کو زندگی کے چند لمحوں سے گرہ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ثروت بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ وہ لڑکپن اور اوائل جوانی میں تو نعیم کی محبت حاصل نہ کرسکی لیکن لڑکپن کی محبت کی تشنگی اس کا نہ بھول جانے والا خواب بن کر اس کے دل وجاں کے کانچ گھر میں جھلملاتا رہا۔ لہٰذا ایک دن اُس نے اپنی شادی شدہ زندگی کی سفاک حقیقت کی آہنی دیوار کو توڑ ڈالا اور اپنا بدن نعیم کے حوالے کردیا۔

یوں ایک طرف اس نے معاشرے کے رسم ورواج اور بندھنوں سے بغاوت کی اور دوسری طرف نعیم سے اس بے توجہی کا انتقام لے لیا۔ اپنی اولین محبت کی خواہش کی یک پہلو تسکین اور نعیم سے انتقام لینے کے بعد ثروت پرسکون ہوکر گھر لوٹ جاتی ہے۔ نعیم اُسے گھر تک چھوڑنے جاتا ہے۔ یہ گفتگو ہوتی ہے:

''پیدل چلتے ہیں، فاصلہ ہی کتنا ہے۔''

''بے سود''، ''ہونہہ؟''

''سب بے سود ہے۔ بے سود۔''

''ایں؟'' ''لاحاصل، فضول، فضول۔''

''نہیں ثروت رکو میری بات سنو۔''

''تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو۔''

وہ بے دلی سے بولی۔

''میرا گھر آگیا ہے۔'' وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ جب وہ اس کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو وہ پلٹ کر کھڑی ہوگئی۔ ''تم اب جاؤ۔''

''کہاں؟'' ''جاؤ۔'' ''مگر ثروت۔''

''نہیں نعیم۔'' وہ بولی ''اب تم جاؤ۔''

گھر کے اندر ثروت کا شوہر اخبار پڑھ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ثروت دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے میں مصروف ہوجاتی ہے۔ اس کا شوہر اس کے پاس بیٹھا اخبار پڑھتا رہتا ہے۔ گویا زندگی سے اپنی مرضی کا حصہ چھین لینے کے بعد اب وہ معمول کی زندگی گزارنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن اندر کی کسک تو ختم نہیں ہوتی۔

''اور اس کا خاوند پاس بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا تو وہ کوشش کرکے مسکرائی اور بولی

''آج دفتر نہیں گئے۔''

لیکن یہ کسک زندگی سے اپنا حصہ چھین لینے کے باوجود ختم کیوں نہیں ہوجاتی؟

دراصل انسان اپنی اِڈ (Id) کے جبر میں اپنی مرضی کا حصہ تو زندگی سے چھین لیتا ہے مگر بہرحال ... ایسا اطمینان اور

حقیقی زندگی کی سفاک حقیقتیں اپنا جال بُنتی رہتی ہیں لیکن ثروت جیسے کردار اپنے پرانے خوابوں کے جال میں پھنسے پھنسے ہی زندگی بتا دیتے ہیں اور کبھی ان سفاک اور ناپسندیدہ حقیقتوں کے جال کو توڑنے کا موقع مل جاتا ہے تو یہ اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں کو زندگی کے چند لمحوں سے گرہ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ثروت بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ وہ لڑکپن اور اوائل جوانی میں تو نعیم کی محبت حاصل نہ کرسکی لیکن لڑکپن کی محبت کی تشنگی اس کا نہ بھول جانے والا خواب بن کر اس کے دل وجاں کے کانچ گھر میں جھلملاتا رہا۔ لہٰذا ایک دن اُس نے اپنی شادی شدہ زندگی کی سفاک حقیقت کی آہنی دیوار کو توڑ ڈالا اور اپنا بدن نعیم کے حوالے کردیا۔

سکون لمحاتی ہی ہوتا ہے۔ جو حقیقی زندگی کی سنگلاخ زمین میں ثمرآور نہیں ہوتا۔ انسان کے لاشعور میں اور اس کی گہری حساسیت میں کہیں ایک چنگاری بھڑک اٹھتی ہے اور وہ نیم پچھتاوے جیسی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ اپنی محرومیوں، لاحاصلیوں کو ساتھ ساتھ لیے اور پھر حصہ چھیننے کے عمل کی لمحاتی مسرتوں کے حصول کے بعد بھی اپنے آپ کو ایک خلا میں معلق پاتا ہے۔ وہ شدت سے تنہائی اور اکیلے پن کی متلی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ ثروت نعیم سے اپنے لڑکپن کی محبت کا خراج تو وصول کرلیتی ہے لیکن...

''اب اُس سے منہ موڑ کر لیٹ گئی تھی۔ اور دیوار کو تکے جارہی تھی اور اس کا لمبا تاریک بدن جس کو ڈھانپنے کی بھی اس نے تکلیف نہ کی تھی، مسلسل جھرجھرا رہا تھا اور وہ ہلکی ہلکی گہری اور ملفوف آوازوں میں ہنسے جارہی تھی، ہنسے جارہی تھی، یا شاید روئے جارہی تھی۔''

نعیم نے کئی بار چاہا کہ اٹھ کر دیکھے۔ یہ ہنسنے کی آواز تھی یا کہ رونے کی، مگر کوشش کے باوجود وہ ایسا نہ کرسکا۔ بعض اوقات انسان کی ہنسی میں رونا اور رونے میں ہنسی شامل ہوتی ہے۔ ثروت بدن کی تشنگی مٹا لینے کے بعد جس کیفیت سے دوچار ہے وہ کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ اس کی ہنسی معاشرے کے بلا جواز بندھنوں اور پابندیوں کو توڑنے کے بعد کا تمسخر ہے جبکہ اس کا رونا اس کے لاشعور کی گہرائیوں میں کہیں دبے ہوئے ارتکاب جرم کے کلبلاتے ہوئے احساس کا نتیجہ ہے۔

دیگر زیرنظر کرداروں کی طرف ثروت بھی زندگی کی لغویت اور بے معنویت کا شکار ہے جس کا بھرپور اظہار درج ذیل الفاظ میں ہوتا ہے:

''بے سود۔ سب بے سود ہے۔ بے سود۔''

''لاحاصل، فضول، فضول۔''

''تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو۔''

وہ بے دلی سے بولی ''میرا گھر آگیا ہے۔''

''تم اب جاؤ۔'' ''نہیں نعیم۔'' ''اب تم جاؤ۔''

اور پھر ثروت کا اپنے خاوند سے بات کرتے ہوئے، کوشش کرکے مسکرانا اور یہ کہنا ''آج دفتر نہیں گئے۔''

☆☆

شوکت (رات) کے المیے کی وجہ اُس کی شدید فرسٹریشن اور گہرا ڈپریشن ہے۔ ایسی نفسیاتی بیماریاں، مایوسی، بے دلی، خودترسی، بیزاری اور خود کو مظلوم سمجھنے جیسی کیفیات کا باعث بنتی ہیں۔ ایسے انسان کو اپنے اردگرد کے ماحول اور لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ ایسے لوگ اکثر اوقات عجیب وغریب ردعمل کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ تنہائی میں الگ تھلگ چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں اور بعض اوقات مضحکہ خیز حرکات کرتے ہیں۔ کبھی اونچا اونچا بولنا شروع کردیتے ہیں اور شور مچاتے ہیں اور کبھی مسلسل باتیں کرنا، زیادہ کھانا کھانا اور بعض اوقات نیند سے گھبرا کر اٹھنا یا بے خوابی کا شکار رہنا۔ ماحول اور لوگوں سے خوف زدہ رہنا یا پھر جنسی عمل میں شدت اور تندی (حیوانی محبت) ایسی شدت وتندی سے ایسے لوگوں کا وقتی طور پر کیتھارسس ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے فرسٹریشن اور ڈپریشن میں کچھ کمی آجاتی ہے۔ بہت زیادہ خواہشات اور توقعات جب پوری نہیں ہوتیں یا زندگی میں لگاتار ناکامیوں کا سامنا کرنے والے عموماً ان بیماریوں کا شکار ہوجاتے ہیں زیادہ حساسیت یا اپنی کسی جسمانی یا کسی دوسری خامی کی وجہ سے احساس کمتری کا پیدا ہونا بھی ایسی نفسیاتی بیماریوں کی وجہ بن جاتا ہے۔

شوکت کی زندگی کے ماضی اور حال کے تانے بانے پوری

کہانی میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جب اس کا بچپن تھا تب ان کا گھرانہ خوش حال تھا۔ اس دور کی کئی یادیں اور تصویریں اُس کے ذہن کے کینوس پر ابھرتی اور ڈوبتی رہتی ہیں۔ سکون کے دن، دوستیاں، اسکول کے راستے کا ماحول، ہمسایہ ایک بچپن کی ساتھی لڑکی کے ساتھ لگاؤ، اس لڑکی کی موت، باپ کی موت کے مناظر، باپ کی موت کے بعد غربت و مفلسی کا دور، اور مشکلات، یونیورسٹی کا دور، اس دور کے ہنگامے، دوستیاں، دشمنیاں، ریاض سے دوستی اور پھر رقابت اور دشمنی، جمال سے محبت، یہ سب کچھ شوکت کی یادوں میں پوری قوت اور شدت کے ساتھ محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ عملی زندگی میں بطور جرنلسٹ ملازمت کے باوجود غیر مطمئن زندگی بسر کرنا۔

ریاض کے ساتھ دوستی اور پھر رقابت کا تعلق شوکت کے لیے ایک بڑے گہرے ذہنی الجھاؤ کا باعث بنتا ہے۔ یونیورسٹی لائف میں دونوں جمال سے محبت کرتے ہیں یہ رقابت کا ایک رخ تھا اور دوسرا اسٹوڈنٹس یونین کے الیکشن میں دونوں کا مدمقابل آنا جبکہ تیسرا پہلو ریاض کی امیری و خوش حالی بھی ہے۔ اگرچہ جمال کی محبت اور الیکشن میں شوکت ریاض کو شکست سے دوچار کر دیتا ہے لیکن فتح مندی کی خوشی شاید اس کے باطن میں چراغ روشن نہیں کرتی ہے۔ شاید وہ ریاض کی دولت اور شان و شوکت سے اندر ہی اندر اتنا مرعوب ہے کہ اس کو شکست دینے کے باوجود بھی اُسے حقیقی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ عملی زندگی میں بطور جرنلسٹ وہ ریاض کے اخبار میں ملازمت کرتا ہے پھر یہ ملازمت چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی وجہ بھی شاید یہ ہے کہ وہ ریاض پر فتح پانے کے باوجود اس کے ماتحت بطور ملازم کام کرنے پر اس کی فتح مندی کا احساس تفاخر ماند پڑ جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ لکھنا لکھانا چھوڑ دیتا ہے۔ ریاض کی ملازمت چھوڑ دینے کے کچھ عرصے بعد شوکت جمیلہ کے شدید اصرار پر دوبارہ ریاض سے ملازمت کے لیے کہتا ہے ریاض اُسے دوبارہ ملازمت دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ رقم بھی ایڈوانس دیتا ہے لیکن وہ مروجہ صحافتی انداز اور صحافتی تقاضے اپنانے کے لیے شوکت سے اصرار کرتا ہے جبکہ شوکت صحافتی معیار کے بارے میں آئیڈیل ازم کا شکار ہے لہٰذا شوکت سب کچھ ٹھکرا کر واپس لوٹ جاتا ہے۔ جمال سے شادی کے کچھ عرصے بعد وہ غربت و مفلسی کی ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہے جس میں گھر کے سامان کے علاوہ جمال کو تحفے میں دی گئی ساڑھیاں تک بِک جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ شوکت کو اس بات کا علم بھی ہو جاتا ہے کہ ریاض نے جمال کو چند ساڑھیاں دی ہیں۔

محبت میں کامیابی، جمال سے شادی اور ایک مشہور کامیاب جرنلسٹ بن جانے کے باوجود شوکت اُداسی اور لایعنیت کا شکار رہتا ہے کیونکہ اس کا ماضی اور حال اس کے لیے مستقل نفسیاتی اذیت کا باعث ہے جس کی وجہ سے وہ فرسٹریشن اور ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے اور آخر کار سمندر میں ڈوب کر خودکشی کر لیتا ہے۔

☆☆

شوکت کے المیے کے بارے میں کہانی کے درج ذیل اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ریاض شوکت کی بیوی جمال سے پوچھتا ہے:

''جمال آخر ہوا کیا، آخر... ہوا... کیا... ہے۔''

''مجھے کچھ پتا نہیں ریاض۔'' وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولی۔

''ایک سیدھا سادہ نارمل اور ذہین انسان تھا۔'' اور...'' وہ اُداسی سے بولا۔ ''بڑا خوش بخت آدمی تھا۔ ہم ساری عمر سے اُسے جانتے آئے ہیں۔ اس کے ساتھ رہے ہیں۔ پھر یہ بیٹھے بٹھائے اس کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ جمال مجھے شک ہوتا ہے کہ تمھیں سب پتا ہے۔ مگر مجھ سے چھپاتی رہی ہو۔'' (ریاض)

''مجھے کچھ پتا نہیں ریاض۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ہر وقت کھاتا رہتا ہے یا سویا رہتا ہے یا مسخرے پن کی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ میں سویرے سے شام تک باتیں کرتی ہوں اور میری کوئی بات نہیں سنتا۔ کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ جو پیسے ہوتے ہیں ضائع کر دیتا ہے۔'' اور اس نے اس کی تند حیوانی محبت کا ذکر کرنا چاہا مگر رُک گئی۔

''گھر میں کچھ بھی نہیں رہا۔'' آخر وہ بولی۔

''مگر یہ بات۔'' اس نے ہوا میں ہاتھ پھیلا کر سوال کیا۔

''میرے لیے اب ایک راز بن چکی ہے۔ کوئی واقعہ'' کوئی حادثہ'' کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ پھر یہ اُسے کیا ہو گیا ہے، کیا ہو گیا ہے جمال۔''

''مجھے کچھ پتا نہیں۔'' وہ رو کر بولی ''مجھے کچھ پتا نہیں۔''

''وہ تند خو اور زہریلا ہو چکا تھا اور کوئی رابطہ کسی سے نہ رکھتا تھا اور مشین کی طرح سرد مہر تھا۔''

''اور اندھیرے میں صرف سانسوں کی مدھم پھنکار رہ گئی جو بلند ہوتی ہوئی کچھ دیر کے بعد ماتمی سرد آہوں میں تبدیل ہو گئی۔ کمرے میں سخت حبس ہو گیا۔''

☆☆

اس کہانی (رات) کے چاروں کردار شوکت، ریاض، جمال اور جمیلہ اپنے اپنے حوالے سے تنہائی، لاحاصلی، ذہنی اذیت اور اُداسی کا شکار ہیں۔ ریاض اور جمیلہ محبت کی ناکامی جبکہ شوکت اور جمال محبت میں کامیابی کے باوجود تنہائی اور اُداسی کی اذیت اور بے دلی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ ایسی زندگی بسر کر لینے پر قادر ہوتے ہیں جبکہ شوکت اس زندگی سے ہار جاتا ہے اور اپنے وجود کو سمندر کی تند و تیز لہروں کے سپرد کر دیتا ہے۔

(3)

المیہ (Tragedy) قدیم یونانی ڈراما کے حوالے سے (جسے دیگر اصناف ادب پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے) ایسے 'انسانی اعمال کی نقل' جن کے ذریعے سے دردمندی، ترس اور دہشت و خوف کے اثرات اور جذبات پیدا ہوتے ہوں جو کسی عمل کو دیکھ کر ذہنی یا نفسیاتی ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ کسی فن پارے میں ایسا عمل ہیرو یا مرکزی کردار (Protagonist) سے سرزد ہوا اور اس کی کسی باطنی خامی یا سوچ کی غلطی (Error of Judgement) کا نتیجہ ہو۔ اور یہ سوچ کا مغالطہ اس کے زوال اور تباہی و بربادی پر منتج ہو۔

المیہ کے اس نقطہ نظر سے جدید دور میں انحراف کے باوجود اس میں المیہ کے کچھ بنیادی عناصر کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں۔ ہم اسی نقطہ نظر سے عبداللہ حسین کے متذکرہ کرداروں کے المیے کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

بلانکا کے کردار کا المیہ دردمندی، ترس اور دہشت کے اثرات و جذبات تو پیدا کرتا ہے لیکن اس المیے کو تقدیر کی کارگزاری تو کہا جا سکتا ہے کردار کی سوچ کی غلطی کا نتیجہ ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ پیدائش کے حادثے کی ذمے داری بہرطور کردار کے کسی عمل کا نتیجہ تو نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی خارجی حادثے کو المیے کا ذمے دار ٹھہرایا جائے تو پھر اسے مکمل المیے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ثروت کے عمل سے دردمندی، ترس اور دہشت ضرور جنم لیتی ہے۔ نعیم سے اس کی یکطرفہ محبت کو سوچ کے مغالطے کے زمرے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ ثروت کے نعیم کے ساتھ جنسی عمل سے کسی حد تک کیتھارسس بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ثروت کا انجام دردمندی یا خوف پیدا نہیں کرتا کیونکہ وہ آخر میں اپنی شادی شدہ نارمل زندگی میں واپس لوٹ جاتی ہے۔

شوکت کا المیہ بہرحال دردمندی، ترس اور دہشت کے اثرات و جذبات طاری کرتا ہے۔ جہاں تک سوچ کے مغالطے کا تعلق ہے یہ عنصر بھی یہاں پایا جاتا ہے۔ شوکت کی ریاض سے توقعات اور اپنے طرزِ صحافت کے بارے میں آئیڈیل ازم ریاض کا شوکت کی توقعات کے برعکس رویہ ظاہر کرنا اور شوکت کے طرزِ صحافت کو معاشرے میں قبولیت کی سند نہ ملنا، اس کی مثالیں ہیں اور پھر اس کی خودکشی کا انجام المیہ کے کلاسیکی یونانی نقطہ نظر کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا اس المیے کو ہم ایک مکمل المیہ کہہ سکتے ہیں۔

■

ماخذ: اجرا، اکتوبر تا دسمبر 2014، کتابی سلسلہ 20

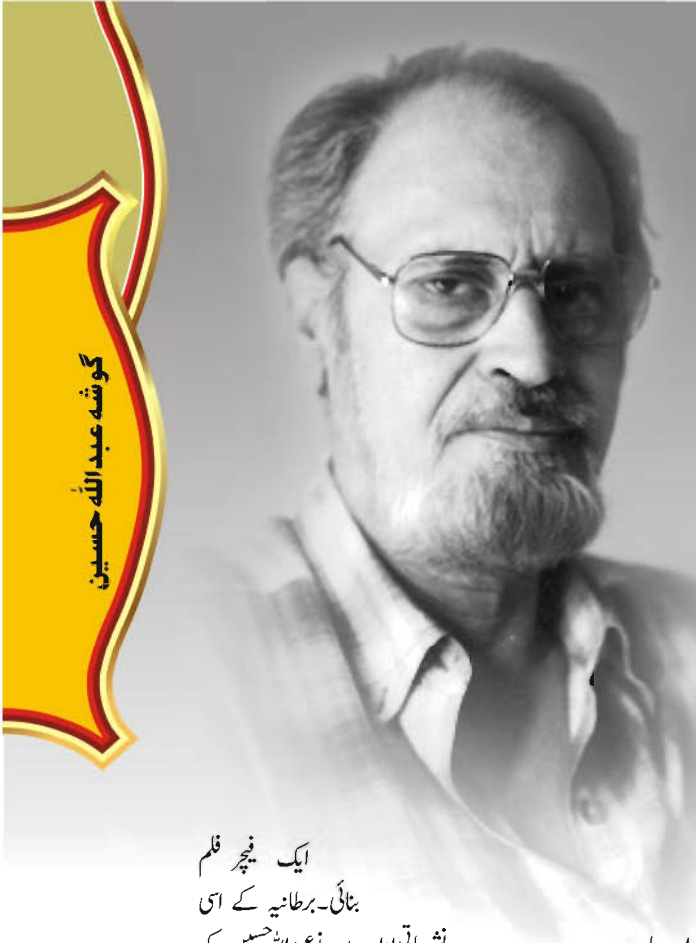

غلام ابن سلطان

عبداللہ حسین

قدح قدح تیری یادیں، سبو سبو تیرا غم

چار جولائی 2015 ہفتے کے دن اجل کے ہاتھ میں کاتبِ تقدیر نے جو پروانہ دیا تھا اس میں عبداللہ حسین کا نام بھی رقم تھا۔ عبداللہ حسین کے نہ ہونے کی ہونی پر بزمِ ادب سے وابستہ ہر دل سوگوار اور ہر آنکھ اشک بار ہے۔ خون کے سرطان کے عارضے میں مبتلا اس صابر و شاکر ادیب نے سدا قناعت و استغنا کے دامنوں میں اپنے آنسو چھپائے رکھے اور کبھی اپنے غم کا بھید نہ کھولا۔ معاشرتی اور سماجی زندگی کے بہیمانہ نظام کے خلاف بیباک لہجے میں بات کرنے والا ایسا حساس اور باکمال تخلیق کار اب ملکوں ملکوں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ اس روز ڈیفنس کالونی، لاہور کا پورا ماحول اپنے ایک مکین کی دائمی مفارقت کے غم میں سائیں سائیں کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ زندگی کی حقیقی کہانیاں سنانے والا تخلیق کار اپنی زندگی کی کہانی کی آخری سطور رقم نہ کر سکا اور خاموشی سے زینۂ ہستی سے اُتر کر عدم کی بے کراں وادیوں کی جانب سدھار گیا۔ فرشتۂ اجل نے اس تخلیق کار سے قلم چھین لیا جس نے پیہم عذابِ دربہ دری برداشت کرنے والے اور بے بس و لاچار انسانوں کے مصائب و آلام کو اپنے تخلیقی عمل کی اساس بنایا۔ مظلوم انسانیت جو جنگوں کی زخم خوردہ تھی ان کے زخموں پر الفاظ کا مرہم رکھ کر ان زخموں کے اندمال کی صورت تلاش کی۔ اردو فکشن کو عالمی ادب کے پہلو بہ پہلو لانے کی انتھک جدوجہد کو شعار بنانے والا زیرک، فعال اور مستعد ادیب گلزارِ ہست و بُود سے دامن جھاڑ کر رخصت ہو گیا۔ معاشرتی زندگی کے تضادات، ارتعاشات اور حالات و واقعات کا نباض ہماری بزم وفا سے ہمیشہ کے لیے اُٹھ گیا۔ عملی زندگی میں شائستگی، سنجیدگی، خلوص و مروت، وفا و دردمندی، اخلاق و اخلاص اور معصومیت کا ایک پیکر اپنے لاکھوں مداحوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنے ہم زباں رفیقوں سے اس قدر دور اپنی بستی بسانے چلا گیا کہ اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی۔ مصلحت وقت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جبر کے ہر انداز کو مسترد کر کے حریتِ فکر کا علم بلند رکھنے والا جری ادیب اب ہمارے درمیان موجود نہیں، اب دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے۔

برطانیہ کے معروف نشریاتی ادارے بی بی سی نے عبداللہ حسین کی ایک کہانی 'The return journeys' کی اساس پر 'Brothers in trouble' کے نام سے ایک فیچر فلم بنائی۔ برطانیہ کے اسی نشریاتی ادارے نے عبداللہ حسین کے مشہور ناول 'اداس نسلیں' پر بھی ایک دستاویزی فلم تیار کی۔ ہجرت کے مسائل اور مہاجرین کے مصائب و آلام کے موضوع پر عبداللہ حسین کا پہلا انگریزی ناول 'Emigre Journeys' کے نام سے سال 2000 میں لندن سے شائع ہوا۔ سال 2007 میں عبداللہ حسین کی مقبول تصانیف (اداس نسلیں، باگھ، قید، رات، نشیب) پر مشتمل ایک مجموعہ شائع ہوا۔ اس مجموعے کو بھی قارئین ادب نے بہ نظرِ تحسین دیکھا۔ ان کے بیانیہ اسلوب میں جزئیات نگاری اور کردار نگاری میں حقیقت نگاری کو بالعموم بہت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کا احوال بیان کرنا عبداللہ حسین کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ زندگی اپنی اصلیت کے اعتبار سے جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہی تو ہے۔ انسان کے جوہر محنت شاقہ ہی سے کھلتے ہیں اور خانہ فرہاد میں روشنی کی شعاع دراصل شرر تیشہ کی مرہونِ منت ہے۔ عبداللہ حسین نے انسانی زندگی کی صبر آزما جد و جہد کو بہت اہم قرار دیا۔ پیدائش سے لے کر وفات تک انسان خوب سے خوب تر کی جستجو میں مصروف رہتا ہے۔ عملی زندگی میں انسان کو متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جبر کے کئی انداز اس کی راہ میں حائل ہو کر اس کے حوصلے کو پست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عبداللہ حسین نے اس بات پر اصرار کیا کہ جبر کے ہر انداز کو پائے استقامت سے ٹھکراتے ہوئے منزلوں کی جستجو جاری رکھی جائے۔ انتہائی نامساعد حالات میں بھی حوصلے اور امید کی

برطانیہ کے معروف نشریاتی ادارے بی بی سی نے عبداللہ حسین کی ایک کہانی 'The return journeys' کی اساس پر 'Brothers in trouble' کے نام سے ایک فیچر فلم بنائی۔ برطانیہ کے اسی نشریاتی ادارے نے عبداللہ حسین کے مشہور ناول 'اداس نسلیں' پر بھی ایک دستاویزی فلم تیار کی۔ ہجرت کے مسائل اور مہاجرین کے مصائب و آلام کے موضوع پر عبداللہ حسین کا پہلا انگریزی ناول 'Emigre Journeys' کے نام سے سال 2000 میں لندن سے شائع ہوا۔

شمع فروزاں رکھنا دانش مندوں کا شیوہ رہا ہے۔ اپنے ناول 'باگھ' میں انھوں نے مسموم ماحول میں آس اور امید کی کلیوں کے نمو پانے کی کیفیت سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو دراصل گردشِ حالات سے مزاحمت کی ایک عملی صورت ہے۔ عبداللہ حسین کا شمار ان زیرک، فعال، مستعد اور جری تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہوائے جور و ستم میں بھی شمعِ وفا کو فروزاں رکھنے پر اصرار کیا اور تیشۂ حرف سے فصیلِ جبر کو منہدم کرنا اپنا نصب العین بنایا۔ عبداللہ حسین کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں:

اداس نسلیں، باگھ، The weary Generations (اداس نسلیں کا ترجمہ)، قید، رات (ناولٹ)، نشیب، فریب (چھے کہانیاں)، نادار لوگ۔

ادب اور فنون لطیفہ سے عبداللہ حسین کو قلبی لگاؤ اور والہانہ محبت تھی۔ اداس نسلیں کی اشاعت کے موقع پر اس کے سرِ ورق کی تیاری کے لیے انھوں نے دنیا کے مایہ ناز مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا انتخاب کیا، جو ان کے ذوق سلیم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عبداللہ حسین کی ادبی کامرانیوں کے اعتراف میں اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے انھیں کمالِ فن ایوارڈ (پانچ لاکھ روپے) سے نوازا گیا۔ عبداللہ حسین نے تخلیقی تجربوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ انھوں نے ہمیشہ وہی کچھ لکھا جو ان کے دل کی آواز تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جب ایک تخلیق کار پرورشِ لوح و قلم میں مصروف ہوتا ہے تو زندگی کی حقیقی معنویت اور مقصدیت کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں حریتِ فکر اور حریتِ ضمیر کو مشعلِ راہ بنانا لازم ہے۔ ان کے اسلوب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ حق گوئی و بیباکی کو شعار بنایا اور کبھی مصلحت وقت کی پروا نہ کی۔ ایک جری تخلیق کار کے جملہ افعال اور تخلیقی فعالیت کی بوقلمونی کے سوتے اس کے کردار سے پھوٹتے ہیں۔ عبداللہ حسین کے کردار کا اہم پہلو یہ رہا کہ انھوں نے جو لکھا وہ اپنے ذہن و ضمیر کے مطابق لکھا اور خارجی دباؤ کے سامنے سپر انداز ہونے سے ہمیشہ انکار کیا۔ برمحل، حقیقی اور صحیح کردار نگاری کے اعجاز سے عبداللہ حسین نے اپنے اسلوب کو نکھار عطا کیا۔ کئی مقامات پر سخت لہجے اور چبھتے ہوئے تلخ الفاظ کی بھرمار قاری کے ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی لیکن عبداللہ حسین نے الفاظ کو فرغلوں میں لپیٹ کر پیش کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ ہماری معاشرتی زندگی میں مسلسل شکستِ دل کے باعث وہ بے حسی ہے کہ چلتے پھرتے ہوئے مُردوں سے ملاقاتیں روز کا معمول ہے، سماعتیں معدوم، گویائی عنقا اور الفاظ معانی سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ انسان شناسی کی صلاحیت سے محروم ہے اور وہ اپنے وجود کے بارے میں بھی تشکیک میں مبتلا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معاشرتی زندگی بے ہنگم انتشار، خود غرضی اور افراتفری کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ اداس نسلیں کے بعد باگھ کی تخلیق میں عبداللہ حسین نے بارہ سال صرف کیے۔ ان بارہ برسوں میں انھوں نے اپنی زندگی کے مشاہدات، تجربات اور معاشرتی اور سماجی حالات و واقعات کے بارے میں نہایت خلوص اور دردمندی کے ساتھ اپنے تاثرات کو پیرایۂ اظہار عطا کیا ہے۔ اپنے ناول 'باگھ' کو وہ اپنی سب تخلیقات سے زیادہ عزیز خیال کرتے تھے۔ اس کے باوجود اس ناول کو قارئین کی جانب سے وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کی مصنف کو توقع تھی۔ کرنل محمد خان کو بھی اسی نوعیت کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی تصنیف 'بجنگ آمد' کو اردو نثر میں طنز و مزاح کی بہترین کتاب قرار دیا جاتا ہے لیکن ان کی بعد میں

سال 1960 کے اختتام پر عبداللہ حسین برطانیہ پہنچے اور چالیس سال برطانیہ میں قیام کیا۔ انھوں نے ایک میڈیکل ڈاکٹر خاتون سے شادی کی۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ یہ دونوں بچے کامیاب عملی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ چند برس قبل وطن واپس آئے تھے۔ برطانیہ میں اپنے طویل قیام کے دوران میں ایک جہاں گرد سیاح کی حیثیت سے عبداللہ حسین نے دنیا کے جن ممتاز ادیبوں سے ملاقات کی ان میں گیبریل گارسیا مارکیز، گنٹر گراس، ٹی۔ ایس ایلیٹ، ژاں پال سارتر، ڈاکٹر این میری شمل اور رالف رسل کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ملاقاتوں میں عبداللہ حسین کو عالمی ادب کے نئے رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملی۔

لکھی جانے والی کتب جن میں بسلامت روی، بزم آرائیاں اور بدیسی مزاح شامل ہیں قارئین کی اس نوعیت کی والہانہ پذیرائی حاصل نہ کر سکیں جو بجنگ آمد کے حصے میں آئی۔

سال 1960 کے اختتام پر عبداللہ حسین برطانیہ پہنچے اور چالیس سال برطانیہ میں قیام کیا۔ انھوں نے ایک میڈیکل ڈاکٹر خاتون سے شادی کی۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ یہ دونوں بچے کامیاب عملی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ چند برس قبل وطن واپس آئے تھے۔ برطانیہ میں اپنے طویل قیام کے دوران میں ایک جہاں گرد سیاح کی حیثیت سے عبداللہ حسین نے دنیا کے جن ممتاز ادیبوں سے ملاقات کی ان میں گیبریل گارسیا مارکیز، گنٹر گراس، ٹی۔ ایس ایلیٹ، ژاں پال سارتر، ڈاکٹر این میری شمل اور رالف رسل کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ملاقاتوں میں عبداللہ حسین کو عالمی ادب کے نئے رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملی۔ سال 1948 میں ادب کا نوبل انعام پانے والے امریکی ادیب ٹی ایس ایلیٹ (پیدائش: 26-9-1888 وفات: 4-1-1965) سے عبداللہ حسین نے کئی ملاقاتیں کیں اور جدیدیت کے موضوع پر اس کے خیالات معلوم کیے۔ ممتاز فرانسیسی ادیب ژاں پال سارتر (پیدائش: 21-6-1905 وفات: 15-4-1980) سے بھی عبداللہ حسین نے ملاقات کی۔ ژاں پال سارتر کے مابعد الطبیعات، علم بشریات، مذاہبِ عالم اور تخلیقِ ادب کے بارے میں خیالات کی تفہیم میں مدد ملی۔ لندن میں اپنے قیام کے عرصے میں عبداللہ حسین نے جدید اردو نظم کے ممتاز شاعر اور 'ماورا' اور 'ایران میں اجنبی' جیسے اہم شعری مجموعوں کے خالق ن م راشد (راجا نذر محمد راشد، پیدائش: 1-8-1910، وفات: 9-10-1975) سے بھی کئی بار ملاقات کی۔ ممتاز شاعر ن م راشد کی زندگی کا یہ دور ان کے لیے نہایت کٹھن اور بہت صبر آزما تھا، ان کی پہلی بیوی صفیہ کا 1961 میں انتقال ہو گیا تھا۔ اپنی اہلیہ صفیہ کی اچانک وفات کے بعد ن م راشد بہت دل گرفتہ اور مایوس رہنے لگے۔ عبداللہ حسین نے ان ملاقاتوں میں ن م راشد کا غم بانٹنے کی کوشش کی اور انھیں جذباتی صدمے سے نکلنے کے کئی مفید مشورے دیے۔ اپنی تنہائیوں کا مداوا کرنے کے لیے ن م راشد نے 1964 میں ایک اطالوی خاتون شیلا انجلینی (Sheila Angelini) سے عقدِ ثانی کر لیا۔ اس کے بعد بھی ن۔م۔ راشد اور عبداللہ حسین کے باہمی رابطوں اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

عبداللہ حسین نے اگرچہ زندگی بھر ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہوئے پرورشِ لوح و قلم کو شعار بنایا لیکن زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے اپنے اندازِ فکر میں لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایوارڈز قبول کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ سال 2012 میں انھیں اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی جانب سے کمالِ فن ایوارڈ عطا کیا گیا۔ سال 2002 میں عبداللہ حسین کو رائل سوسائٹی آف لٹریچر کی فیلوشپ سے نوازا گیا۔ عبداللہ حسین کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ وہ اپنی ذات میں سمٹے رہے اور کم آمیز رہنے میں سداعافیت محسوس کی۔ اس کے باوجود ان کی یہ کوشش ہوتی کہ معیاری ادبی نشستوں میں اپنی شرکت کو یقینی بنایا جائے۔ لاہور آرٹس کونسل کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی ادبی تقریبات میں شرکت کر کے وہ دلی مسرت محسوس کرتے تھے۔ اردو میں تنقید

کے بارے میں عبداللہ حسین اور کلیم الدین احمد کے خیالات میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ان کے ناول 'اداس نسلیں' کی اشاعت کے بعد اس پر جو تنقیدی تحریریں سامنے آئیں عبداللہ حسین ان سے ناخوش و بیزار تھے۔ان کا خیال تھا کہ 'اداس نسلیں' پر جتنے بھی تنقیدی مضامین تحریر کیے گئے ہیں ان میں سے ایک مضمون بھی لائقِ اعتنا نہیں۔ایک تخلیق کار کی طرف سے تنقیدی مطالعات پر اس نوعیت کے شدت پسندانہ ردِعمل کے باعث بعض اوقات اختلافِ آرا میں ناگوار تلخی کی صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو جاتا۔اردو تنقید کے معیار سے عبداللہ حسین نہ صرف مایوس تھے بلکہ وہ اردو نقادوں کی تنقید سے اپنی تصانیف کو محفوظ رکھنے کے آرزومند بھی تھے۔ان کے خیالات سے یہ تاثر ملتا تھا کہ اردو نقادوں سے غیر جانب دارانہ تجزیاتی مطالعے کی توقع اُٹھ جانے کے بعد وہ ان سے بچنے کے جتن کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب ان کی تصنیف 'ناداروگ' شائع ہوئی تو انھوں نے ادبی نقادوں پر یہ بات واضح کر دی کہ اس کتاب کا تجزیاتی مطالعہ ان کے لیے وقت اور محنت کا کوئی صحیح مصرف نہ ہوگا۔اب یہ قارئین ادب کا کام ہے کہ وہ اس تصنیف کے مطالعے کے بعد اپنی آزادانہ رائے قائم کریں۔

اردو ادب کی تاریخ میں ساٹھ کی دہائی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا،یہی وہ عشرہ ہے جسے اردو فکشن کے عہدِ زریں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس عرصے میں اردو فکشن میں تخلیقی تنوع اور نئے تجربات کے اعجاز سے جمود کا خاتمہ ہوا اور افکار تازہ کی مشعل تھام کر ادیبوں نے جہانِ تازہ تک رسائی کو یقینی بنانے کی مقدور بھر کوشش کی۔قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' اور عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' کو اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھا جاتا ہے۔عبداللہ حسین نے عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں، ہلاکت خیزیوں اور تقسیم ہند کے مسائل کو نہایت خلوص اور دردمندی سے 'اداس نسلیں' کا موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں پنجاب کی دیہی اور شہری معاشرت اور یہاں کی زندگی کے معمولات کی لفظی مرقع نگاری جس حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ہے،اس کے مطالعے سے اُردو زبان و ادب کا قاری چشمِ تصور سے اس زمانے کی اجتماعی زندگی کے تمام حالات، واقعات، ارتعاشات اور نشیب و فراز چشمِ تصور سے دیکھ لیتا ہے۔ایک زیرک تخلیق کار کی حیثیت سے عبداللہ حسین نے الفاظ کے برمحل استعمال سے اپنے ذہن،ضمیر اور روح کے جملہ احساسات و تجربات کو پیرایۂ اظہار عطا کیا ہے۔

تاریخ اور اس کے مسلسل عمل سے عبداللہ حسین کو قلبی لگاؤ تھا۔انھوں نے فرد کی آزادی اور آزادی کے مجموعی احساس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ان کا خیال تھا کہ حریتِ فکر کے معجز نما اثر سے فکر و خیال، ذہن و ذکاوت اور شعور کی جلا کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔یہ تاریخ ہی ہے جو ماضی کے واقعات پر پڑ جانے والی ابلقِ ایام کے سموں کی گرد کو صاف کرتی ہے اور آفاقی صداقتوں کی جانب متوجہ کر کے اوہام کے تارِ عنکبوت صاف کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔تاریخ اور اس کے مسلسل عمل سے اسی دلچسپی کی بنا پر ناول 'باگھ' میں عبداللہ حسین نے 1965 کی پاک بھارت جنگ کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔اپنے ناول 'ناداروگ' میں عبداللہ حسین نے 1971 میں سقوطِ ڈھاکہ کی اساس پر اپنے اسلوب کا قصر تعمیر کیا ہے۔

عملی زندگی میں عبداللہ حسین نے فروغِ علم و ادب میں ہمیشہ گہری دلچسپی لی۔وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کی نئی نسل زندگی کی برق رفتاریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے سلسلۂ

اردو میں تنقید کے بارے میں عبداللہ حسین اور کلیم الدین احمد کے خیالات میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ان کے ناول 'اداس نسلیں' کی اشاعت کے بعد اس پر جو تنقیدی تحریریں سامنے آئیں عبداللہ حسین ان سے ناخوش و بیزار تھے۔ان کا خیال تھا کہ 'اداس نسلیں' پر جتنے بھی تنقیدی مضامین تحریر کیے گئے ہیں ان میں سے ایک مضمون بھی لائقِ اعتنا نہیں۔ایک تخلیق کار کی طرف سے تنقیدی مطالعات پر اس نوعیت کے شدت پسندانہ ردِعمل کے باعث بعض اوقات اختلافِ آرا میں ناگوار تلخی کی صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو جاتا۔اردو تنقید کے معیار سے عبداللہ حسین نہ صرف مایوس تھے بلکہ وہ اردو نقادوں کی تنقید سے اپنی تصانیف کو محفوظ رکھنے کے آرزومند بھی تھے۔ان کے خیالات سے یہ تاثر ملتا تھا کہ اردو نقادوں سے غیر جانب دارانہ تجزیاتی مطالعے کی توقع اُٹھ جانے کے بعد وہ ان سے بچنے کے جتن کرتے تھے۔

روز و شب کو وقت کے تقاضوں کے مطابق اس سانچے میں ڈھالے کہ طلوعِ صبحِ بہاراں کے امکانات کو یقینی بنایا جا سکے۔

بیسویں صدی کی معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز جس حقیقت پسندانہ انداز میں عبداللہ حسین کے اسلوب میں سما گئے ہیں ان کے مطالعے سے تاریخ کے مسلسل عمل کے بارے میں مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے کی مساعی کو تقویت ملتی ہے۔تاریخ سے عبداللہ حسین کی دلچسپی ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔یہ تاریخ ہی ہے جو فرد کو اپنی تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ شمار کرتے وقت ایامِ گزشتہ کی کتاب کی ورق گردانی پر مائل کرتی ہے۔تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے تخلیق کار اپنے ہر عمل کا خود احتساب کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ایسے یگانۂ روزگار ادیبوں کا منفرد اسلوب قارئین کی فکر و نظر کو بھی مہمیز کرتا ہے۔تاریخ اور اس کے مسلسل عمل کی مسحور کن اثر آفرینی جب فکر و خیال اور ذہن و ذکاوت میں رچ بس جاتی ہے تو تخلیق کار جب اشہبِ قلم کی جولانیاں دکھانے کے لیے قلم تھام کر مائل بہ تخلیق ہوتا ہے تو اس کا ہر لفظ گنجینۂ معانی کا طلسم بن جاتا ہے۔یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ عبداللہ حسین کی تحریریں صرف تاریخ کے معتبر حوالوں کی وجہ سے مقبول ہوئیں۔ان کی تصانیف کے مطالعے سے ذہن و شعور کی گتھیاں سلجھانے میں مدد ملتی ہے اور فہم و ادراک کو نئے آفاق تک رسائی ملتی ہے۔عبداللہ حسین نے ہمیشہ تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے تحفظ پر اصرار کیا۔اس کا سبب یہ ہے کہ اقوام اور ملل کے جاہ و جلال اور تخت و کلاہ و تاج کے سب سلسلے سیلِ زماں کے تھپیڑوں میں دریا برد ہو سکتے ہیں لیکن تہذیب انتہائی کٹھن حالات میں بھی اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔تہذیبی اقدار و روایات افراد کو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر تہذیب کو نسلِ نو میں منتقل کرنے میں ایک صدی کی مجرمانہ غفلت کا ارتکاب ہو جائے تو پھر بدقسمتی سے وہ قوم پتھر کے زمانے کے ماحول میں پہنچ جاتی ہے۔عبداللہ حسین نے اپنے منفرد اسلوب میں تہذیب و تمدن کے فروغ اور ارتقا کو اپنا مطمحِ نظر بنایا اور عصری آگہی کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ان کا خیال تھا کہ جہدِ للبقا کے موجودہ دور میں صرف وہی تہذیب و ثقافت اپنا وجود برقرار رکھ سکے گی جو تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں کی تفہیم کی صلاحیت سے متمتع ہو۔اگر ہماری تہذیب و ثقافت میں نئے دور کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی استعداد پیدا ہو جائے تو اس کی بقا اور دوام کا نقش فی الحجر ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ جو تہذیب و تمدن بدلتے ہوئے زمانے کے حالات کے چیلنج کی تفہیم سے عاری رہے اور اس کا جواب دینے کی استعداد سے محروم تھے وہ لوحِ جہاں سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔عبداللہ حسین نے اپنے اسلوب میں تاریخی واقعات اور صداقتوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری سمجھ جاتا ہے کہ زمانہ ماضی کے یہ سب واقعات محض آثارِ قدیمہ نہیں بل کہ یہی تو ہماری میراث ہے جس میں ہمارے اسلاف کی فکر کے بیش بہا خزینے پوشیدہ ہیں۔ان کا مطالعہ اس لیے افادیت کا حامل ہے کہ آنے والی نسلیں ان حقائق کو جاننے کے بعد اپنے لیے ایک واضح دستور العمل مرتب کر سکتی ہیں۔

■

Ghulam Ibn-e-Sultan, Mustafa Abad, Jhang City (Pakistan)

نصیر احمد ناصر

کہانی اور کتنی دور جائے گی

(عبداللہ حسین کے لیے)

عبداللہ حسین اس نزاع، الجھاؤ، ناانصافی، اختلاف، تصادم اور جدال سے بھری دنیا کو چھوڑ کر دائمی حالتِ سکون میں چلے گئے۔ مجھے یہ دکھ بھری خوشی ہے کہ میں نے یہ نظم ان کی زندگی میں لکھی اور انھوں نے یہ نظم پڑھی اور پسند کی۔ لیکن کہانی کو راستہ بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے! یہ نظم مجھے ہمیشہ تاریخ کے ان مناظر میں لے جاتی ہے جہاں سے ہمارے زوال کا آغاز ہوا اور پھر نیوورلڈ آرڈر تک لے آتی ہے۔ کاش ہم دیکھ سکتے!!...

نصیر احمد ناصر (مدیر: رسالہ 'تسطیر' راولپنڈی)

کہانی ہمارے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا راستہ ہے
شام کے ملگجے اندھیرے میں
جب درخت کسی خلائی مخلوق کی طرح دکھائی دیتے ہیں
تو ہم آگے جانے سے ڈرتے ہیں
اور جب بھاگنے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں
تو یوں لگتا ہے
جیسے کاندھے کسی بوجھ تلے دب رہے ہوں
اور اس قنطور نما بوجھ کے پچھل پاؤں
کہیں دُور داستانی زمانوں میں ٹکے ہوئے ہوں
اور ہم آسیب زدہ ارتقائی بوزنے
انسانوں کی طرح منمناتے ہوئے سلامتی کی دعائیں مانگنے
لگتے ہیں

.....

جب ہم کہانی میں نہیں تھے
تو لاکردار تھے
نہ کوئی ہمارا خدا تھا نہ مذہب
نہ ملک نہ شہر نہ گاؤں
نہ گھر نہ دیواریں
نہ قوم نہ قبیلہ
نہ حسب نہ نسب
کہانی نے ہمیں کرداروں اور خداؤں میں بانٹ دیا ہے
اب ہم کاغذی زندگی میں اصل ہونے کی کوشش کرتے ہیں
اور ایک دوسرے کے ساتھ
طفیلیوں کی طرح رہنے پر مجبور ہیں
اور بسا اوقات تو
مصنف کے دیے ہوئے الفاظ اور معانی بھی
کھا جاتے ہیں
اور دائمی التوا بلکہ ابتلا میں مبتلا رہتے ہیں

.....

کہانی کار!
ہمیں کچی بستی کے کرداروں کی طرح
بے آسرا مت چھوڑو
وقت ناوقت کی تیز بارشوں میں
کہانی کی دیواریں گر گئی ہیں
اور گھاس پھوس سے بنی ہوئی چھتیں
لگاتار ٹپکنے لگی ہیں
ہم اپنی حدوں سے تجاوز نہیں کرتے
ہم نے تو کبھی بادلوں پر پاؤں بھی نہیں رکھے
اس کے باوجود ہم جانتے ہیں
ایک دن ہماری کہانی پر بل ڈوزر پھیر دیا جائے گا
ہمارے گھروں کی طرح
پھر ہم کیا کریں گے؟
اپنے جنازے کہاں لے جائیں گے؟
شہروں کی مٹی ہمارے مردے قبول نہیں کرتی

.....

کہانی کار!
ہم نہیں جانتے
لیکن آئن اسٹائن کو پتہ تھا
کہانی پھیلتی جا رہی ہے
کائنات کی طرح
اور ایک دن اچانک اپنے آپ میں سمٹ جائے گی
آخری چرمراہٹ کے بعد
لیکن اب جبکہ وہ مادے کے بدوں
محض ایک بے جسم روح ہے
اسے نہیں معلوم
دیواروں کے آر پار دیکھ لینے سے
زندگی اتنی عریاں ہو گئی ہے
کہ ہماری ہڈیوں کا پگھلا ہوا گودا بھی نظر آنے لگا ہے
اور زمان و مکاں کی ساری اداسی
ہمارے دلوں میں سے گزرتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی ہے
اور ہمارے خواب فرشتوں پر عیاں ہو گئے ہیں
اور وہ حیران ہیں
کہ خوابوں کی دنیا میں انسان اتنا بے بس کیوں ہے
اور روشنی کی رفتار حاصل کر لینے کے باوجود
بھاگ کیوں نہیں سکتا!
ہم ایک بیضوی گھماؤ میں
چلتے چلتے تھک گئے ہیں
کہانی کار ہمیں بتاؤ!
کہانی اور کتنی دُور جائے گی؟
کیا زندگی سے بڑا کوئی بیانیہ بھی ہے
جسے لکھنے کے لیے
ساری دنیا داؤ پر لگی ہوئی ہے؟
اس سے پہلے کہ کسی جنت نواز خودکش دھماکے سے
کہانی کے ٹکڑے اُڑ جائیں
ہمیں کہانی سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر لینا چاہیے!

Naseer Ahmad Nasir, House No 21, Street No 2, Phase 2, Baharia Town, Rawalpindi (Pakistan) Email.: tasteer97@ hotmail.com

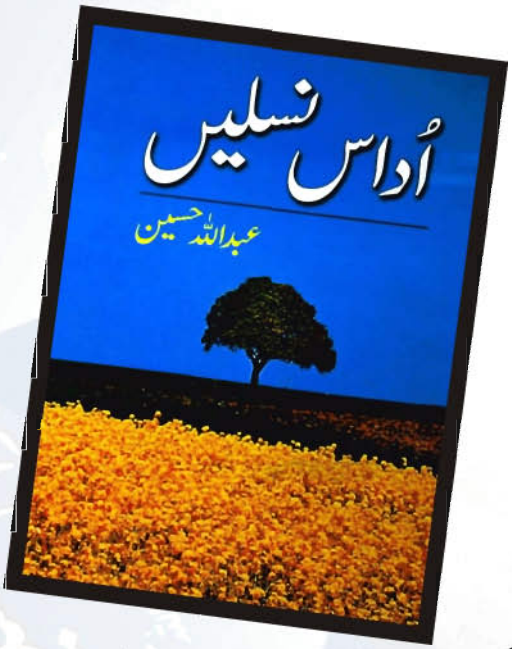

عبداللہ حسین

اُداس نسلیں کا ایک مختصر باب

اس رات قافلے میں پہلی موت واقع ہوئی۔ وہ ایک کمزور سا نوجوان تھا جو نمونیے سے مرا تھا۔ اس کی بیماری کا کسی کو پتا نہ چلا کیونکہ وہ اکیلا سفر کر رہا تھا۔ صبح سویرے گاڑی کا سہارا لے کر چلنے والوں نے اسے گاڑی میں مرا ہوا پایا اور کود کر اوپر چڑھ گئے۔ چند ایک تو بیٹھتے ہی اونگھنے لگے، دو بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لیکن چونکہ گاڑی لاوارث تھی اس پر سوار ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا جنھیں اندر جگہ نہ ملی وہ باہر ڈنڈوں پر بیٹھنے لگے۔ نتیجتاً دونوں طرف کے بانس کے ڈنڈے بوجھ کے نیچے ٹوٹ گئے۔ آخر بیل کھینچنے سے معذور ہو کر رک گئے۔ اب پیچھے رہ جانے کا عام خوف ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور خوفناک جدوجہد کی ابتدا ہوئی، طاقت ور اور کمزور کی ازلی، حیوانی رقابت۔ اس دھکم پیل میں گاڑی کے مالک کی لاش نیچے گر پڑی۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد جب چند زور آوروں نے گاڑی پر قبضہ کر لیا اور بیل دوبارہ چلنے لگے تو وہ اپنے پیچھے آنے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو بظاہر ان سے مخاطب تھے۔ اس قیامت کے شور میں وہ کچھ سن تو نہ سکے لیکن لوگوں کے تشویشناک اشاروں سے انھیں لاش کی غیر موجودگی کا احساس ہو گیا۔ گاڑی رکی، دو آدمی اتر کر گئے، مردے کو کندھوں پر اٹھا کر لائے اور گاڑی میں لاد کر روانہ ہوئے۔

لیکن موت کی خبر آناً فاناً سارے میں پھیل گئی اور ایک جگہ پہنچ کر سارے کا سارا قافلہ یک دم رک گیا۔ بہت سے لوگوں نے آ کر لاش کو گھیر لیا اور اسے ٹھکانے لگانے کی تجویزوں پر غور کرنے لگے۔ اب وہ لوگ، جو گاڑی پر قابض تھے، چوکنے ہوئے اور چالاکی کے ساتھ اتر کر ہجوم میں مل گئے۔ پھر انھیں میں سے دو نے اوپر چڑھ کر مرنے والے کا ایک بڑا سا صندوق خالی کیا اور لاش کو کپڑے میں لپیٹ کر اس میں رکھا۔ پھر نماز جنازہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

تمام کے بعد امام نے بیل گاڑی پر چڑھ کر ایک مختصر لیکن جوشیلی تقریر کے دوران کہا:

''ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ ہم اپنے مُردوں کی حرمت کے پاسبان ہیں۔ آج ہمارے اس گمنام بھائی کو، جس کا نام بھی بعض ضرورتوں کے تحت ہمیں خود ہی ایجاد کرنا پڑا، وہ عظیم الشان جنازہ میسر ہوا ہے جو دنیا میں بڑے بڑے آدمیوں کو نہیں ملتا۔ دس ہزار روحیں... دس ہزار مومن۔''

تقریر کے دوران اور تقریر کے بعد دیر تک لوگ ٹولیوں میں جنازے کے پاس سے گزرتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک حتی الوسع اس اجنبی انسان کا مردہ چہرہ دیکھنے کا خواہش مند تھا جو محض مر کر یکلخت ان سب کے لیے درد مندی، خدا ترسی اور مستقبل کے خوف کی عظیم علامت بن گیا تھا۔ چند ادھیڑ عمر کسان عورتیں اونچی آواز میں بین کرنے لگیں۔ ان پر آج پہلی بار موت کی عالمگیر حیثیت کا انکشاف ہوا تھا اور غیر شعوری طور پر انھوں نے محسوس کیا تھا کہ اس ایک انسان کی موت ان سب کی موت تھی کہ مستقبل کے اندھیرے کی مشترکہ موت میں وہ سب شامل تھے۔

آخر اسے قبر میں اتار کر کم از کم پانچ ہزار افراد نے اپنے اپنے حصے کی مٹی اس پر ڈالی اور ایسی قبر بنائی کہ ان میں سے آج تک کسی نے اتنی بڑی قبر نہ دیکھی تھی۔

''زندگی کی ایک عظیم فورم (Form) ہے۔ یہ جنازہ۔'' لمبے بڈھے نے مٹی پھینکتے ہوئے کہا۔ نعیم نے خاموشی سے اسے دیکھا اور اپنے حصے کی مٹی پھینک کر آگے روانہ ہو گیا۔ میلوں تک انھیں وہ قبر نظر آتی رہی۔

اسی روز قافلے پر پہلی بار حملہ ہوا۔ حملہ آور ہندو اور سکھ تھے جو کلہاڑیوں، تلواروں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ قافلے والے بہت سے مردہ اور زخمی چھوڑ کر آندھی کی طرح بھاگے۔ اب وہ موت سے واقف ہو چکے تھے۔

''تم کیا کہہ رہے تھے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''جنازے کی بات کر رہا تھا'' کہ یہ زندگی کیسی منظم ہے۔ ہنسومت، میں فلسفہ نہیں بگھار رہا۔ اس زندگی سے مراد یہ خصوصی زندگی ہے۔ یہ جس میں قواعد وضوابط ہیں اور ہمسائے کے ساتھ محبت کرنے کے احکام، اور نماز کے اوقات، رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے طریقے، نیکی کے بدلے ثواب اور گناہ کے بدلے عذاب ہے۔ کتنی بڑی تنظیم ہے، تم نے کبھی سوچا ہے؟ میں بھی کیا پوچھ رہا ہوں، ہر کوئی تھوڑا ہی سوچتا ہے۔ پر سنو، میں نے سوچا ہے۔ وہ دیکھو اگلی بیل گاڑی پر ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ میں جب بھی ایسے شخص کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ ابھی چند منٹ میں یہ اپنے ضمیر کا سارا بوجھ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے اطمینان سے بیٹھ جائے گا۔ اس کی زندگی کی ایک مخصوص شکل، ایک Form ہے جس کے مطابق کہ یہ رہتا ہے، اور اس کا Content ہے جو کچھ کہ یہ کرتا ہے اور اس کے نیک و بد ہونے کا علم رکھتا ہے۔ پھر اس کی اجتماعی شکل ہے۔ نماز جنازہ جس کی عظیم Form ہے اور جس کے Content میں تمام انسان شامل ہو جاتے ہیں۔ اس سارے سلسلے میں ایک رکھ رکھاؤ ہے، صاف ستھرا پن ہے، جیسے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر باورچی خانے کو جھاڑا پونچھا جائے، برتنوں کو مانجھ کر قرینے سے رکھا جائے اور فرش کو دھو دھلا کر کھلا چھوڑ دیا جائے۔ اس میں فراغت کا احساس ہے۔ میری بھی کوئی زندگی رہی ہے۔ پریشان خیالی، ابتری، دھاچوکڑی، ایک دم دھاچوکڑی۔ Form کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس زمرے میں کچھ تھا بھی تو مجبوری، محض مجبوری اور لاچاری۔ اور Content؟ ہنہہ، کیا بات کرتے ہو میاں، کبھی کسی چیز کا تعین ہی نہیں

ہو پایا... لیکن اب میں تمھیں سب سے اہم بات بتانے والا ہوں سنو۔ اس کے باوجود ان سب باتوں کے باوجود میں نے کبھی اسے لوگوں کے لیے، ایسی زندگی کے لیے رشک یا حسد محسوس نہیں کیا۔ کبھی احساس کمتری مجھ کو نہیں ہوا۔ ہمیشہ میں نے اس نظام کے لیے اپنے دل میں ایک عجیب سی حقارت محسوس کی ہے، کہ ہم اپنے ضمیر کو زبردستی دھودھا کر نئے گناہوں کے لیے تازہ دم ہو بیٹھتے ہیں، نئی امنگ، نئی حرص کے ساتھ اور نماز جنازہ کے بعد کیا ہوتا ہے؟... تم نے دیکھا ہی ہے۔ شکست اور بے حرمتی ہمیں عین آنکھوں میں آ کر لگتی ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی ہے۔''

''تم کون ہوں؟''

''میں دلی یونیورسٹی میں تاریخ پڑھاتا تھا۔

''اس سے پہلے؟''

''نانا اسٹیل مل میں کام کرتا تھا۔''

''اس سے پہلے؟''

بڈھا گہری نظروں سے نعیم کو دیکھ کر ہنسا۔ آوارہ تھا، کھوج میں تھا، گمشدہ تھا جو بھی سمجھ لو۔''

لیکن نعیم کی آنکھوں کے سامنے صاف طور پر مدتوں پہلے کی ایک دھوئیں سے بھری ہوئی کوٹھری آ گئی جس میں ایک جوشیلا نوجوان بیٹھا ضلع کے سارے انگریز افسران کو بموں سے اڑا دینے کی تجویزوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔

بڈھے نے نعیم کے چہرے پر اچانک پھیلتی ہوئی پرانی آشنائی کی مسکراہٹ کو نہ دیکھا اور پھر بولنے لگا:

اس سے پہلے آئیڈیلز تھے اور آوارگی تھی۔ اگر میں تفصیل سے بیان کروں تو تم کہو گے کہ وہ آوارہ گردی کی زندگی تھی۔ مگر نہیں، وہ محض آوارگی تھی۔ یہ مجھے بہت بعد میں پتا چلا۔ آئیڈیل... اصل اور صحیح آئیڈیل تو مکمل نارمل حالات میں بنتے ہیں۔ ایسے ذہنوں میں جو پرشکم ہوتے ہیں، عظیم اور بے ہوس ہوتے ہیں، جن کے پاس صرف تخیل ہوتا ہے اور بلندی اور مایوسی ہوتی ہے۔ ایسے انسان جن پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا، کوئی ناکامی کوئی زہر نہیں ہوتا، بس زندگی کی روح ہوتی ہے جو جوان اور خوبصورت اور افسردہ ہوتی ہے، جوان کو آس پاس کی گرتی ہوئی، لاچار ہوتی ہوئی دنیا سے صرف مایوس کر دیتی اور انھیں اپنے آپ سے الگ ہو کر اوپر اٹھ کر سوچنے کے قابل بناتی ہے، آرٹسٹ اور شاعر کے پاس اپنے تجربے ہوتے ہیں، آئیڈیلسٹ کے پاس بنی نوع انسان کی ساری تاریخ، سارے تجربے اور سارے دکھ ہوتے ہیں، چنانچہ وہ ان سے بڑا ہوتا ہے۔ ہم اور تم روزمرہ کا حساب رکھنے کے لیے تھے۔ ہمارے پاس کیا تھا؟ غم و غصہ اور آئیڈیلز کی بگڑی ہوئی شکل، گالیاں اور برافروختگی، مصیبتیں اور دباؤ اور نوجوانی اور خفت اور تنگ نظری اور زندگی کا سارا زہر، سب کچھ تھا۔ سنو ایک بات بیچ میں آ گئی ہے۔ آئیڈیل اور سیاست میں فرق ہے۔ سیاست میں ہوس کا مقام بہت اونچا ہے۔ سیاست داں محض اپنی ناک کے آگے سے گزرنے والے نفع و نقصان سے متعلق ہوتا ہے، اس کا ذہن بھدا اور تاریخ سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ آئیڈیل جس شے کی لطیف اور اعلیٰ شکل ہے سیاست میں وہی چیز بھدی اور خام بن کر نمودار ہوتی ہے... جس طرح ہر شے بالآخر بھدی اور خام بن جاتی ہے.. پھر بھی سیاست کی ہر ترکیب چونکہ سوسائٹی کے لیے نفع کی امید دلاتی ہے اس لیے اس کا وجود لوگوں میں گرمی اور زندگی پیدا کرتا ہے۔

ایسے ذہنوں میں جو پرشکم ہوتے ہیں، عظیم اور بے ہوس ہوتے ہیں، جن کے پاس صرف تخیل ہوتا ہے اور بلندی اور مایوسی ہوتی ہے۔ ایسے انسان جن پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا، کوئی ناکامی کوئی زہر نہیں ہوتا، بس زندگی کی روح ہوتی ہے جو جوان اور خوبصورت اور افسردہ ہوتی ہے، جوان کو آس پاس کی گرتی ہوئی، لاچار ہوتی ہوئی دنیا سے صرف مایوس کر دیتی اور انھیں اپنے آپ سے الگ ہو کر اوپر اٹھ کر سوچنے کے قابل بناتی ہے، آرٹسٹ اور شاعر کے پاس اپنے تجربے ہوتے ہیں، آئیڈیلسٹ کے پاس بنی نوع انسان کی ساری تاریخ، سارے تجربے اور سارے دکھ ہوتے ہیں، چنانچہ وہ ان سے بڑا ہوتا ہے۔

ہمارے پاس نہ آئیڈیل تھے نہ سیاست، صرف بگڑی ہوئی زندگیاں تھیں اور زہریلے دماغ، جس کا نتیجہ اس بگڑی ہوئی تاریخ میں ظاہر ہوا ہے، یہ سب...'' اس نے چاروں طرف ہاتھ پھیلایا۔ ''تم تو دیکھ ہی رہے ہو۔ یہ تاریخ کی کون سی شکل ہے؟ یہ وہ نسل ہے جو ایک ملک کی تاریخ میں عرصے عرصے کے بعد پیدا ہوتی رہتی ہے، جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا، کوئی خیالات کوئی نصب العین نہیں ہوتا جو پیدائش کے دن سے اداس ہوتی ہے اور اِدھر سے اُدھر سفر کرتی رہتی ہے۔ ہم ہندوستان کی اس بدقسمت نسل کے بیٹے ہیں...''

تھوڑی دیر کے بعد جب اس کا پہلا جوش ختم ہو گیا تو وہ دھیمے، اداس لہجے میں اپنے متعلق بتانے لگا:

''میں نے یونیورسٹی میں تاریخ پڑھی۔ لیکن میں اس دنیا میں رہتا تھا جہاں آپ یا تعلقہ دار تھے یا کچھ بھی نہ تھے۔ جو لوگ اعلیٰ دماغ ہوتے تھے سرکار کی ملازمت میں چلے جاتے تھے اور حکومت برطانیہ انھیں اس طور تربیت دیتی تھی کہ ان کی تمام ذہانت، تمام اچھوتا پن ختم ہو جاتا تھا۔ وہ نہ تو تعلقہ دار بن سکتے تھے نہ آرٹسٹ، محض سرکاری افسر بن کر رہ جاتے تھے۔ نہ سرکار نہ رعایا محض معمولی کارندے یہ عجیب مضحکہ خیز طبقہ تھا۔ یہ ان کا خاتمہ تھا۔ آئیڈیل کہاں سے آتے؟ دوسری طرف ہماری دنیا تھی۔ اس میں مشقت کرتے ہوئے مزارعے کرتے اور چھوٹے چھوٹے خودغرض، خوشامدی اور پیٹو اہلکار تھے۔ قرض تھے اور سود لینے والے مہاجن تھے اور جائدادوں کی قرقیاں تھیں، اور اس سب کے اوپر ان خداؤں کے ساتھ گونگی، کتوں کی سی وفاداری تھی۔ یہاں آئیڈیل بن ہی نہ سکتے تھے، یہاں صرف گری ہوئی زندگی تھی اور بے بس برافروختگی تھی، جیسے کتے بھونکتے ہیں۔ تاریخ کی پڑھائی سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ محض کنفیوژن پیدا ہوا خوفناک کنفیوژن۔ اگر میں سرکاری ملازمت کرتا تو آج تک اپنی تعلیم کا قرض اتارتا رہتا۔ چنانچہ میں بھاگ گیا۔ لیکن وہ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ سمجھتے ہو، ہم تم ہم عمر ہیں، ایک دوسرے کو سب کچھ بتا سکتے ہیں، تم ضرور سمجھ جاؤ گے۔ وہ زمانہ تھا جب اس سب کچھ کے باوجود آدمی اپنے خیالات کے ساتھ نوجوانی کی اولین محبت کرتا ہے، جس کے ختم ہونے کا غم انسان عمر بھر ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے جس سے دل خالی ہو جاتے ہیں اور دماغ ناکارہ۔ اس وقت معمولی سے معمولی اور بیکار چیزوں میں نصب العین نظر آتا ہے اور انتہائی بے خیالی سے ہم زندگی کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے...''

''پھر؟ پھر تم بھی...''

''نہیں۔ میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں اس کے بعد کارندہ نہیں بنا، مگر میں نے وہ کیا جو مجھ کو کرنا چاہیے تھا، جو ہر کسی کو کرنا چاہیے تھا۔ میں محنت کر کے روزی کمانے لگا۔ یہ تاریخ کا وہ زمانہ ہے جس میں میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑا کام جو میں کر سکتا ہوں وہ خاموشی اور دیانت داری کے ساتھ رہنے کا ہے۔ یہ سب سے قدرتی طریقہ ہے جو انسان اختیار کر سکتا ہے کیونکہ دیانت داری اور شرافت کے ساتھ مسلسل دکھ سہتا ہوا انسان ہی دنیا کی واحد حقیقت ہے۔ میں نے کافی آرام کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے اب میں بارہ گھنٹے تک چل سکتا ہوں۔ تم میری جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ آؤ آؤ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں کہہ رہا تھا، اوہ... میں بار بار دہرا رہا ہوں، لیکن یہی دنیا کی واحد حقیقت ہے۔ سن رہے ہو، تم شاید سن بھی نہیں رہے، کیا فائدہ...''

ماخذ: اردوفوٹوڈاٹ کام، kutubistan.blogspot.in

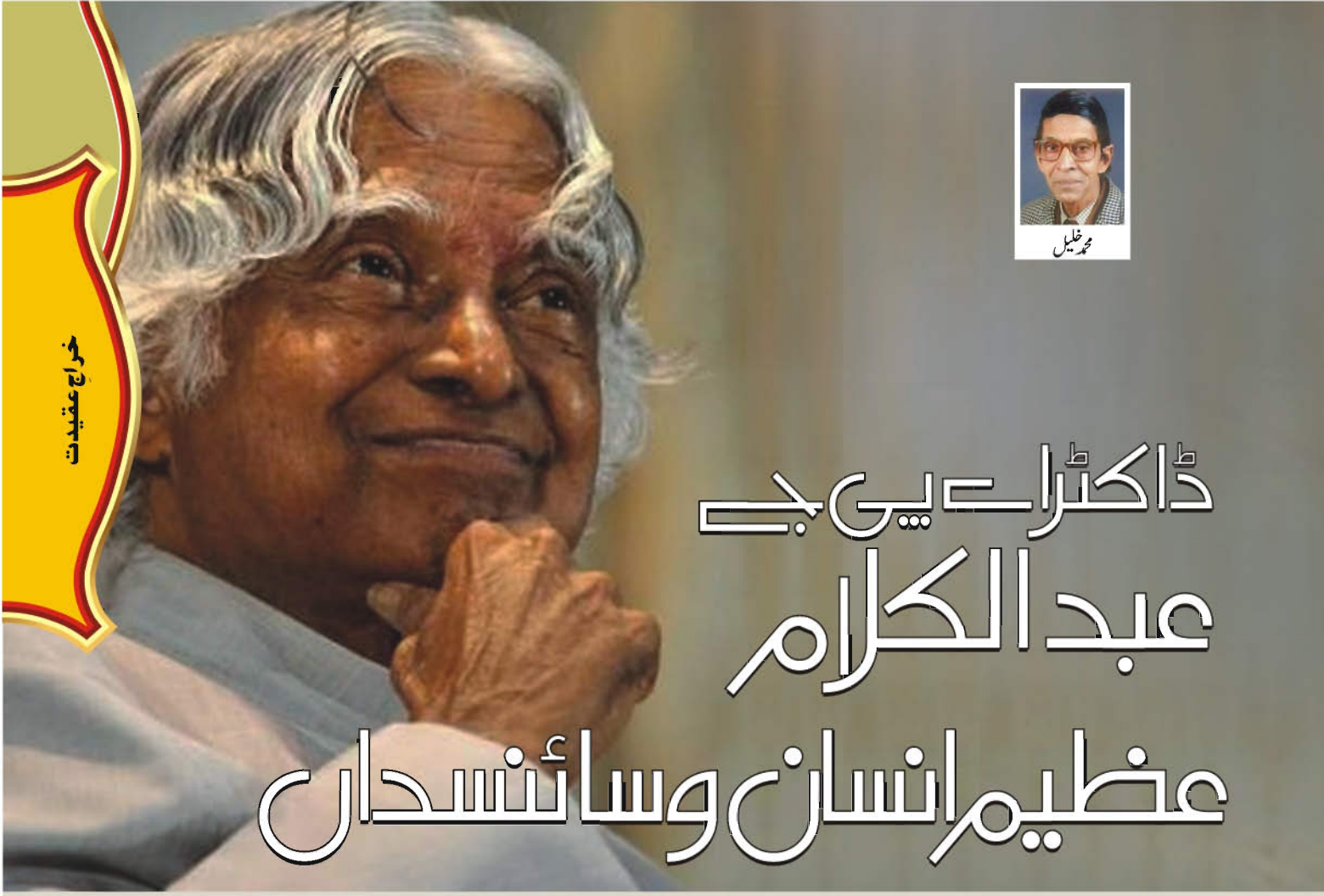

محمد خلیل

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام
عظیم انسان و سائنسداں

27 جولائی 2015 کی شام آئی آئی ایم شیلانگ میں ایک لکچر (خطبہ) دینے کے دوران قلب کی حرکت بند ہوجانے سے ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر سے سارے ملک میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر کلام اس شام تقریباً ساڑھے چھ بجے لکچر کے دوران گرنے کے بعد نازک حالت میں بیتھنی اسپتال کے آئی سی یو کے وارڈ میں داخل کیے گئے۔ اُس کے دو گھنٹے سے کچھ زائد وقت کے بعد ان کے انتقال کی تصدیق کی گئی۔ اُس شام تقریباً چھ بجے سے کچھ پہلے وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ پہنچے تھے۔ وہاں انھوں نے کچھ دیر آرام کیا اور تقریباً ساڑھے چھ بجے اپنا لکچر شروع کیا۔ آئی آئی ایم شیلانگ کے ڈائرکٹر پروفیسر ڈے نے بتایا کہ اس کے پانچ منٹ بعد ہی ڈاکٹر کلام خطبے کے دوران گر پڑے۔ انھوں نے آخری ٹوئٹ کیا تھا ”زندگی جینے کے قابل سیارے پر آئی آئی ایم میں کلاس لینے کے لیے شیلانگ جارہا ہوں۔“

اے پی جے عبدالکلام 15 اکتوبر 1931 کو جنوبی ہندوستان کی ریاست تامل ناڈو کے ساحلی قصبے رامیشورم میں پیدا ہوئے۔ پشتے سے ملاح ان کے والد زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ یہ مچھواروں کو کرائے پر کشتیاں دیا کرتے تھے۔ پانچ بھائی اور پانچ بہنوں والے خاندان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آمدنی کم پڑجاتی تھی۔ اس لیے کلام کو اخبار فروخت کرنے کا کام بھی کرنا پڑا۔ جب ان کی عمر آٹھ سال کی تھی وہ صبح چار بجے اٹھ جاتے تھے اور غسل کے بعد ریاضی کی تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ اس قدر صبح نہانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے ریاضی کے استاد ان بچوں کو مفت تعلیم دیتے تھے جو نہا کر آئے ہوں۔ وہاں سے واپسی پر وہ فجر کی نماز ادا کرتے تھے اور اس کے بعد تقریباً آٹھ بجے وہ رامیشورم کے ریلوے اسٹیشن و بس اسٹینڈ پر اخبار فروخت کرنے کا کام کرتے تھے۔

’ایرواسپیس ٹکنالوجی‘ کے میدان میں دلچسپی کا سہرا وہ اپنے پانچویں درجہ کے ٹیچر سبرامنیم ایر کے سر باندھتے ہیں کیونکہ ایک مرتبہ ان کے ٹیچر نے کلاس میں پوچھا کہ چڑیاں کیسے اُڑتی ہیں۔ تو کسی بچے نے اس کا صحیح جواب نہیں دیا۔ اگلے دن ایّر صاحب اپنے کلاس کے سب بچوں کو سمندر کے کنارے لے گئے۔ وہاں اُس وقت کئی پرندے اڑ رہے تھے ان میں کچھ ایسے پرندے بھی تھے جو سمندر کے کنارے اُتر رہے تھے۔ ایّر نے بچوں کو پرندوں کی ساخت اور جسمانی بناوٹ کے بارے میں تفصیل سے سمجھایا۔ ٹیچر کی بتائی ہوئی باتیں کلام کی سمجھ میں آگئیں۔ وہ معلومات اُن کے ذہن میں اِس قدر بیٹھ گئی کہ وہ خود کو سمندر کا پرندہ تصور کرنے لگے۔ انھوں نے فضائیہ میں جانے کا ارادہ کیا جس کے لیے انھوں نے آگے چل کر علم طبیعیات (فزکس) کا مطالعہ کیا اور مدراس انجینئرنگ کالج کے ’آئیروناٹیکل انجینئرنگ‘ کی تعلیم حاصل کی۔ اُن کے خاندان کے لوگ اُنھیں آزاد کے نام سے پکارتے تھے۔ شاید اُن کو ہندوستان کی آزادی میں سرگرم کردار ادا کرنے والے قائد مولانا ابوالکلام آزاد میں ایک مثالی شخص نظر آیا اور شاید اسی سلسلے سے وہ کلام کو آزاد کہتے تھے۔ اپنی عمر کے شروع کے زمانے میں وہ تین لوگوں سے بے حد متاثر تھے جنھوں نے ان کی عملی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ان میں ان کے والد زین العابدین تھے۔ انھوں نے اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے والد کا دن صبح چار بجے سے شروع ہوجاتا تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنی نماز سے فارغ ہوتے پھر کوئی دوسرا کام کرتے تھے۔ وہ کلام کو مشکل مسائل تامل زبان میں سمجھاتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں والد کی بتائی ہوئی باتوں پر چلنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”ان کی سچائیوں کو جو میرے والد نے مجھے اس وقت بتائی تھیں آج میں محسوس کرتا ہوں اور سمجھ گیا ہوں کہ ایک خدائی طاقت ہے جو ہمیں الجھن، پریشانی، فکر اور ناکامی سے باہر لاتی ہے اور حقیقت اور سچائی کی جانب لے جانے کے لیے ہمیں راہ دکھاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان اپنے جذبات مادّی بندشوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ پھر وہ آزادی، مسرت، ذہنی سکون کے راستے پر چل پڑتا ہے۔“ کلام اپنی زندگی میں دوسرے

شخص جلال الدین سے متاثر ہوئے جوان کے دوست اور عمر میں ان سے کافی بڑے تھے۔ یہ ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُس زمانے میں رامیشورم جزیرے میں وہ واحد شخص تھے جو انگریزی لکھ سکتے تھے۔ وہ کلام کو پابندی سے تعلیم سے جڑی ہوئی شخصیات کی سوانح، عصری ادب، سائنسی ایجادیں اور طبی سائنس (میڈیکل سائنس) کے کارہائے نمایاں کے بارے میں تفصیل سے بتاتے رہتے تھے۔ یہی نہیں ان کی مدد سے کلام کو معیاری اور معلوماتی کتابیں مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا جن کو اس زمانے میں حاصل کرنا ایک مشکل کام تھا۔ جلال الدین صاحب نے انھیں علاقے کے کتب خانے سے کتابیں حاصل کرنے اور مطالعہ کرنے کے شوق کو مہمیز کیا۔ کلام کی زندگی میں تیسرے شخص جنھوں نے انھیں متاثر کیا۔ وہ ان کے بچپن کے دوست و چچیرے بھائی شمس الدین تھے۔ رامیشورم کے علاقے میں ان کی اخبار فروخت کرنے کی واحد ایجنسی تھی۔ ایجنسی جو اسٹیشن پر تھی اس سے کلام کی دل چسپی صرف اخبار تقسیم کرنے تک ہی محدود نہیں تھی۔ بلکہ اس کے ذریعے انھیں ساری دنیا کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ بالخصوص اس وقت آزادی کی تحریک اور دوسری جنگِ عظیم کا بڑا چرچا تھا اس سے بدلتے حالات کا انھیں کافی اندازہ ہوا۔ اس سے ان کے اندر ایک یکسوئی پیدا ہوئی جو ان کی زندگی میں کامیابی کی ضامن ثابت ہوئی۔

کلام کے والد ان کو کلکٹر بنانے کے خواہش مند تھے۔ جبکہ کلام ایئر فورس میں پائلٹ بننا چاہتے تھے۔ لیکن حالات کی تبدیلی کے مدنظر وہ راکٹ انجینئر بن گئے۔ جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھ رہے تھے تو انھوں نے اخبار میں دوسری جنگِ عظیم کے مشہور بم برسانے والے جہاز 'اسپٹ فائر' کے بارے میں پڑھا اس کم عمری میں اس کا ان پر بڑا اثر پڑا ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے۔

کلام کے اندر سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں اہم کارکردگی کی خواہش بچپن سے ہی ایک کرن (چنگاری) کی طرح مسلسل موجود تھی۔ بعد میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ اپنی منزل کی جانب بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ بی ایس سی میں داخلے کے بعد بھی وہ اپنے کو نہ روک سکے اور مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں داخلے کے خواہش مند ہوگئے۔ وہ داخلے کے امتحان میں کامیاب رہے اور ان کا داخلہ ہوگیا۔ لیکن ایک بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ داخلے کی ایک ہزار کی فیس کیسے ادا کریں اس وقت ایک ہزار کی رقم معمولی نہ تھی۔ ان کی بڑی بہن زہرہ صاحبہ نے اپنے ہاتھ کی سونے کی چوڑیاں اُتار کر گروی رکھ کر مدد کی اور کلام کی فیس جمع ہوگئی۔ انھوں نے ایک فیصلہ لیا کہ وہ اتنی محنت سے پڑھیں گے کہ انھیں وظیفہ ملنے لگے اور اُس رقم سے وہ بہن کی چوڑیاں چھڑا لیں گے۔ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی مدراس میں انھیں ایسے استادوں سے مدد ملی جن کا انھوں نے بڑی عقیدت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان سے ایئروڈ ٹنامکس اور ہوا کی رفتار کی جانکاری حاصل ہوئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے دل سے فزکس کا خوف جاتا رہا اور حسابی فزکس میں دلچسپی لینے لگے۔ اُس کے مطالعے کے بعد فلوئیڈ ڈائنیمکس کے علم میں ان کی جانکاری بڑھی جوان کی آئندہ کی سائنسی کوششوں میں بے حد مدگار ثابت ہوئی۔ وقت کے ساتھ جہازوں کے پرزے، انجن، اڑان بھرنے کے طریقے اور اس کے متعلق کئی دوسری تکنیکس اب ان کے لیے غیر جانکاری کی نہ تھی۔ مدراس کی تعلیم پوری کرنے کے بعد انھوں نے بنگلور کے ایروناٹکس لمیٹڈ سے اپنا رشتہ قائم کرلیا۔ وہاں انھوں نے سائنسی انجنوں کی پیچیدگیاں پوری طرح سمجھیں اس سے ان کے غور و فکر میں کافی اضافہ ہوا۔

یہ ذکر یہاں باعثِ دلچسپی ہوگا کہ کلام نے 1958 میں اپنی شروع زندگی میں نوکری دو سو پچاس روپے ماہانہ پر بحیثیت سینئر سائنٹفک اسسٹنٹ (ایس ٹی اے) کے طور پر شروع کی تھی جہاں وہ جلد ہی ترقی کر کے ڈی آر ڈی او میں سینئر سائنسداں

عبدالکلام: ایک نظر گزرے ہوئے برسوں پر

1931 ابوالفاخر (اَوُر پاکر) زین العابدین عبدالکلام کی پیدائش 15 اکتوبر کو تامل ناڈو کے رامیشورم جزیرے کے گاؤں دھنش کوڈی میں ہوئی۔

1950 ترچی کے سینٹ جوزف کالج میں داخلہ لیا اور سائنس میں گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی۔

1954 مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (ایم آئی ٹی) میں انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے داخلہ لیا۔

1958 ڈی ٹی ڈی اینڈ پی (اپر) میں بطور سینئر سائنٹفک اسسٹنٹ تقرری ہوئی اور اسی سال ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (ڈی آر ڈی او) میں سینئر سائنس داں بنے۔

1963 ہندوستان کا سب سے پہلا راکٹ 'نائک-اپاچے' اُڑایا۔

1967 ٹی ای آر ایل ایم کی مدد سے روہنی-75 راکٹ چھوڑا گیا۔

1968 انڈین راکٹ سوسائٹی قائم کی۔

1972 آر اے ٹی او (راٹو) انجن کے سلسلے والے سکھوئی 16 جیٹ جہازوں کا کامیاب تجربہ۔

1976 کلام کے والد زین العابدین کا 102 سال کی عمر میں انتقال، ان کے والد کے گزرنے کے کچھ عرصے بعد والدہ کا بھی انتقال۔

1980 ہندوستان کے سٹیلائٹ کو اڑانے والا پہلا راکٹ ایس ایل وی 3 کی کامیاب اڑان۔

1981 پدم بھوشن انعام سے نوازا گیا۔

1981 سٹیلائٹ کو اڑانے والا 'ایس ایل وی-3' کی کامیاب اڑان۔

1982 ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ لیبارٹری میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

1983 آئی جی ایچ ڈی پالی کی اڑان۔

1984 پہلے مقامی زمین سے زمین تک مار کرنے والے پرتھوی میزائل کا تجربہ۔

1988 پرتھوی میزائل کا دوسرا تجربہ۔

1990 پدم وی بھوشن انعام سے نوازا گیا۔

1990 جادھپور یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری دی گئی۔

1991 آئی آئی ٹی، ممبئی کی طرف سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری پیش کی گئی۔

1992 مرکزی وزیر دفاع کے سائنسی مشیر مقرر ہوئے

1997 صدر جمہوریہ نے اعلیٰ ترین شہری اعزاز 'بھارت رتن' سے نوازا۔

1998 پوکھران-II ایٹمی تجربے کامیابی کے ساتھ کیے۔

2002 صدرِ جمہوریہ کے عہدے کے لیے منتخب ہوئے۔ 25 جولائی 2002 کو حلف لیا اور 25 جولائی 2007 تک اس عہدے کی ذمے داری سنبھالی۔

2007 یونیورسٹی آف wolverhampton برطانیہ نے ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔

2008- آکلینڈ یونیورسٹی، رائل سوسائٹی، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے ملک و بیرون ملک کے اہم اداروں سے اعزازی 2012 ڈگریاں دی گئیں۔

بنے۔ وہ دہلی میں شہری اڑان کے تکنیکی مرکز کے ڈیولپمنٹ آف ٹیکنیکل ڈائرکٹوریٹ اینڈ پروڈکشن (ڈی ٹی ڈی اینڈ پی) میں کام کرنے لگے۔ یہاں ان کی ذمے داری 'سپرسونک جہاز' کو تیار کرنے کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کانپور میں ٹریننگ حاصل کی جس سے ان کو بڑا فائدہ ہوا۔ اس کے بعد ان کا تقرر ایروناٹیکل ڈیولپمنٹ اسٹیبلشمنٹ (اے ڈی ای) میں ہوگیا۔ وہاں مشین کو تجرباتی اڑان بھرنے کے لیے تیار کرنے میں ان کی ٹیم سرگرم رہی۔ تیار شدہ جہاز کا نام نندی رکھا گیا۔ نندی سے اگنی تک کلام سخت محنت و جدوجہد سے گزرے۔ نندی کو کلام نے خود چلایا تھا۔ وہ پچاس میلی میٹر کی اونچی ہوائی گدی پر 550 کلوگرام وزن کا ہاور کرافٹ چلانے میں کامیاب رہے جو اس وقت کے لحاظ سے ایک بڑی کامیابی تھی۔ نندی جہاز میں اُس وقت پروفیسر ایم جی کے مینین بھی سوار تھے۔ کلام کو کچھ عرصے بعد 'ساؤنڈنگ راکٹ لانچنگ تکنیک' سیکھنے کے لیے امریکہ کے محکمہ نیشنل ایروناٹیکل اسپیس ایڈمنسٹریشن (ناسا) بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وہ اس کامیابی سے بے حد خوش تھے۔ ناسا کی ایک ساؤنڈنگ پروگرام میں جہاں انھیں ایک پینٹنگ دیکھنے کا موقع ملا، جس میں کالے رنگ کے فوجی، راکٹوں سے لڑتے ہوئے دکھائے گئے تھے، دریافت کرنے پر انھیں معلوم ہوا کہ ٹیپو سلطان کے سپاہی اُس تصویر میں اس وقت کے راکٹوں کا استعمال کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ اس سے کلام کو خوشی ہوئی کہ ناسا نے ٹیپو سلطان کے راکٹ کے علم کی عزت افزائی کی۔

ہندوستان واپس آنے پر کلام راکٹ اُڑانے کے منصوبے سے جڑ گئے۔ راکٹ کی تیاری اُس سے جڑے تجربات کو ترتیب دینے و تحفظی کاموں کو دیکھنے کی ان کی ذمے داری تھی۔ شروع کی تحقیقی کوششوں سے دو ہندوستانی راکٹوں کی ابتدا ہوئی یعنی روہنی اور میٹکا سے۔ پہلا ہندوستانی راکٹ روہنی 75 چھوڑا گیا۔ پروفیسر سارا بھائی ہندوستانی خلائی تحقیق کی تنظیم میں راکٹ اور سٹیلائٹ بنانے اور انھیں خلا میں چھوڑنے کی صلاحیت حاصل کرنے میں سبھی کی رہنمائی کی۔ انھوں نے 'سری ہری کوٹا' جزیرے کو راکٹ چھوڑنے کے لیے مرکز کا انتخاب کیا۔ پھر ہندوستانی خلائی ریسرچ تنظیم یعنی اسرو کا قیام عمل میں آیا۔ اور کلام کو ایس ایل وی منصوبے کی ذمے داری دی گئی۔ اسی دوران 30 دسمبر 1971 کو رات میں سارا بھائی کا انتقال ہوگیا۔ تریوندرم کے ہوائی اڈّے پر جب ان کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی تو کلام سکتے میں آگئے وہ ان کو ہندوستانی خلائی سائنس کا عظیم سائنسداں اور اپنا گرو مانتے تھے۔ وہ ہر صبح تقریباً دو گھنٹے ٹہلتے تھے۔ اُسی دوران پورے دن کے کام منصوبہ بنا لیتے تھے۔ 18 جولائی 1980 کی صبح آٹھ بج کر تین منٹ پر راکٹ ایس ایل وی تھری پر سوار ہندوستان کا پہلا روہنی سیٹی لائٹ فضا میں چھوڑا گیا لیکن وہ سمندر میں جا گرا۔

وہ ایس ایل وی تھری کی کامیابی کا سہرا پروفیسر وکرم سارا بھائی، ڈاکٹر ستیش دھون اور ڈاکٹر بھرم پرکاش کی رہنمائی اور اپنے ساتھ کام کرنے والے سیکڑوں ساتھیوں کو دیتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایس ایل وی 3 کی حاصل ہوئی کامیابی کے بعد ہندوستان میں راکٹوں، سیٹی لائٹوں کا پروگرام تیزی سے آگے چل پڑا۔ فروری 1982 میں کلام کو ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ لیبارٹری کا ڈائرکٹر بنایا گیا۔ جہاں انھوں نے 'گائیڈیڈ میزائل ڈیولپمنٹ' پروگرام بنایا جس میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر کلام نے 'کام' کرنے کو زندگی کی کامیابی کے لیے شاہ کلید سمجھا۔ اسی لیے انھوں نے وصیت کی کہ میرے مرنے پہ

چھٹی کے بجائے ایک دن مزید کام کیا جائے۔

ڈاکٹر کلام کا ایک خواب یہ تھا کہ ہندوستان راکٹ اور میزائل ٹکنالوجی میں خود کفیل ہوجائے۔ وہ دو دہائی سے زائد عرصے تک اپنی تحقیقی کوششوں سے کئی طرح کے میزائل بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ سطح سے سطح پر مار کرنے والے پرتھوی میزائل، ترشول، آکاش، ناگ اور آخر میں اگنی کو داغنے میں کامیاب ہوئے۔ مثال کے طور پر پرتھوی سطح سے سطح پر مار کرنے والے کی صلاحیت 150 سے 250 کلومیٹر ہے جبکہ اس کے 'وار ہیڈ' کا وزن ایک ہزار کلوگرام ہے جس پر لاگت تقریباً تین کروڑ ہے جبکہ اس کے کئی بار تجربے کیے گئے۔ ہوا میں مار کرنے والا 'آکاش' میزائل کے مار کرنے کی صلاحیت 25 کلومیٹر ہے۔ اس کے بھی کئی تجربے کیے گئے ہیں اس کی لاگت ایک کروڑ بتائی گئی ہے۔ 'ترشول' جو ہوا میں مار کرنے والا ہے۔ یہ پانچ کلومیٹر تک نشانہ لگا سکتا ہے اس کے بھی کئی تجربے کیے گئے اس کی لاگت 45 لاکھ روپے بتائی گئی ہے۔ 1989 میں ایک شاندار تجربہ ہوا امید کے مطابق وہی ہوا دوسرے دن صبح 7 بج کر دس منٹ پر اگنی میزائل گھڑگھڑاتا ہوا اٹھا اور چھ سو سکنڈ کی شاندار اڑان سے اُس نے ملکی لوگوں کے دلوں کو جیت لیا تھا۔ اگنی میں دو مرحلوں والے راکٹ سلسلے کا استعمال ہوا ہے۔ اس میں ری انٹری ٹکنالوجی ہندوستان میں پہلی بار استعمال میں لائی گئی۔ ایس ایل وی 3 میں جس طرح کا راکٹ موٹر استعمال میں لایا گیا تھا ویسا ہی اگنی میں کیا گیا تھا۔ اگنی کے اندر کا درجۂ حرارت چالیس ڈگری سیلسیس رہتا ہے۔ جبکہ باہر کی سطح کا درجۂ حرارت 25 ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ اندر لگا کمپیوٹر نشانے تک پہنچانے کے لیے صحیح سمت کی طرف جانے کی ہدایت دیتا ہے۔ فضا میں داخل ہوتے وقت اس کی رفتار بہ مقابل آواز کی رفتار سے بارہ گنا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اس کے لیے خاص قسم کے مادّوں کے کمپاؤنڈ تیار کیے گئے تھے۔ اس کی تیاری میں آر ڈی او کے ساتھ کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سی ایس آئی آر) کی چار تجربہ گاہوں نے مل کر یہ تحقیقی کام تقریباً اٹھارہ مہینوں میں مکمل کیا تھا۔ اطلاع کے مطابق 'اگنی' کی تیاری میں تقریباً پانچ سو سائنس داں اس کام میں مصروف رہے۔ بقول ماہرین (درمیانی دوری کا) 'اگنی' میزائل دو ہزار پانچ سے کلومیٹر تک پہنچ کر نشانے پر وار کرسکتا ہے۔ اس وار ہیڈ کا وزن تقریباً ایک ٹن ہے۔ اس کے بھی کئی تجربے کیے گئے۔ اطلاع کے مطابق ایک اگنی میزائل کی لاگت تقریباً آٹھ کروڑ روپے ہے۔ پوکھران II کا ایٹمی تجربہ بھی انھوں نے کامیابی کے ساتھ کیا۔ 2002 میں وہ ہندوستان کے صدر جمہوریہ کے عہدے کے لیے منتخب ہوئے۔

وہ چھوٹے قد کے ایک بڑے انسان تھے۔ وہ ایک شفیق استاد کے طور پر زندگی کے آخری لمحوں تک سرگرم رہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی نئی نسل کے لیے وقف کردی۔ پہلے ایک عظیم سائنس داں پھر عوامی صدر جمہوریہ کے طور پر مقبولیت کے عروج پر رہے۔ انھوں نے بچوں کی ذہن سازی کا بیڑا اٹھایا۔ یہاں تک کہ آخری برسوں میں وہ ملک کے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں جانا اور اپنے خطبے کے ذریعے وہ بچوں اور نئی نسل کو بہت کچھ سکھاتے رہے۔ مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچوں سے بہت زیادہ محبت اور نئی نسل کو کچھ کر گزرنے کے لیے راغب کرنے کی ان کی مہم نے سب کو متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کے سائنسی کارہائے نمایاں کے لیے سرکار نے 1981 میں پدم بھوشن 1990 میں پدم وی بھوشن اور 1997 میں انھیں بھارت رتن سے سرفراز کیا۔ انھوں نے صدارتی محل کے دروازے ہر خاص و عام کے لیے کھول دیے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جس کے مطالعے سے ان کی گراں قدر خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔

■

Mohammad Khalil, Ex Scientist, H 51, Dr Iqbal Lane, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi - 110025, Mob.: 9643026911

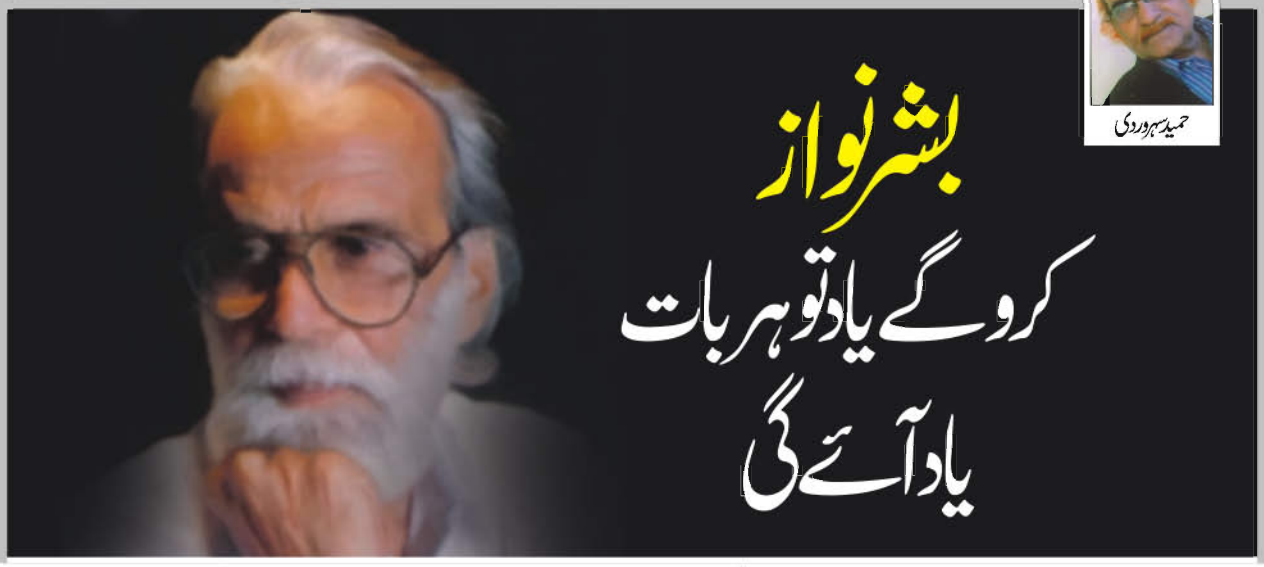

بشر نواز

کروگے یاد تو ہر بات یاد آئے گی

حمید سہروردی

بشر نواز صاحب کی موت کی خبر سن کر گہرا صدمہ ہوا۔ کیونکہ ان سے میرے روابط اور مراسم 1970 سے تھے۔ ان کی موت سے مجھے اپنے ایک بزرگ دوست اور رہبر سے محروم ہونے کا شدید احساس ہو رہا ہے۔ بشر نواز دلنواز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہر ایک سے بڑی خنداں پیشانی سے ملتے تھے۔ ہر ایک سے حال احوال پوچھتے تھے، وہ خوش خلقی اور حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔

بشر بھائی کی موت کی خبر سن کر جہاں صدمہ جانکاہ کا احساس ہوا وہیں ان کے ساتھ گزرے ہوئے شب و روز کی یادوں کا ایک سلسلہ عود کر آیا۔ یہ 1970 کی بات ہے کہ میں پروفیسر صادق کے ایما پر مراٹھواڑہ یونیورسٹی بغرض ایم اے اردو میں داخلے کے لیے اورنگ آباد چلا آیا۔ اورنگ آباد کے نام کے ساتھ بہت سارے ادبا و شعرا سکندر علی وجد، یعقوب عثمانی، قاضی سلیم اور بشر نواز کے نام میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ ان سے ملاقات کی خوشی بھی ہوئی۔ جب میں پروفیسر صادق کے مکان پر پہنچا تو ان کے مکان پر جوگندر پال، قاضی سلیم اور بشر نواز محو گفتگو تھے۔ ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان سبھی نے گرم جوشی اور خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

قاضی سلیم اور جوگندر پال صاحبان سے ہفتہ عشرہ میں ملاقات ہوا کرتی تھی۔ البتہ بشر نواز صاحب سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ بشر صاحب کو اردو ادب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ کسی نہ کسی ادبی موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ ان کی گفتگو کا محور و مرکز ادبی مسائل اور ادبی ماحول ہوتا۔ وہ قدیم اور جدید شاعری کے رویے، زبان و بیان کی خوبیوں اور نزاکتوں پر گفتگو، بغیر کسی وقفہ کے کرتے رہتے۔ میں انھیں خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ ادبی مسائل اور ماحول پر ہونے والی گفتگو سے استفادہ کیا جائے۔ ویسے بھی، میری حیثیت ایک طالب علم کی تھی۔ میں نے ان سے ادبی رموز و نکات سے استفادہ کیا ہے۔ بشر صاحب اصناف سخن، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور جدید نظم پر بھی بحث کرتے اور میر، غالب، سودا، انیس اور جوش، فراق اور فیض احمد فیض کی شاعری پر خوب ڈوب کر بحث کرتے۔ ویسے بھی بشر صاحب ہر موضوع پر، ادب کے علاوہ بے تکان بولتے رہتے تھے، کبھی کبھی، میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ ہم کلاس روم میں ہیں اور بشر صاحب کا لکچر سن رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بشر صاحب بغیر کسی ذہنی تحفظ کے ہر تحریک، دبستان اور رجحان پر بھی خوب خوب بولتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کی خارجیت اور جدیدیت کی داخلیت کو واضح انداز میں بیان کرتے چلے جاتے۔ اگر ہم کوئی سوال کرتے وہ تشفی بخش جواب بھی دیتے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بشر صاحب کسی کالج کے استاد تو نہیں رہے۔ حسن اتفاق یہ ہے کہ چند سال قبل، شعبۂ اردو، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں اعزازی استاد کے فرائض بھی بہ حسن خوبی انجام دے چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ادب کے استاد بھی تھے اور دانشورانہ فکر کے مالک بھی تھے۔ ان کی گفتگو کسی قسم کی پابندی قبول نہیں کرتی تھی۔ بشر نواز زندگی میں پیدا ہونے والے تجربوں کے قائل تھے مگر ادب میں برپا بے ہنگم تجربوں اور کرتب بازی سے انھیں اتفاق نہیں تھا۔ وہ ترقی پسند ادب کو ہی سماجی و سیاسی موضوعات کا امانت دار نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ جدید ادب میں، سماجی و سیاسی، تہذیبی و معاشرتی موضوعات پر لکھی جانے والی تخلیقات پر پروپیگنڈے کے بجائے، اس میں پائے جانے والے طنز کی طرف بھی اشارہ کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ ادب کے موضوعات کو واضح انداز میں تشریح کرتے تھے۔ وہ جدید ادب کے حامی تھے۔ اس سلسلے میں کسی ذہنی تحفظ و تعصب کے بجائے مثبت رویوں اور فکر کے حامل تھے۔ البتہ غیر ضروری ابہام، جو ایک سطح پر جا کر اشکال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس سے وہ اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ تخلیق نہ لسانی توڑ پھوڑ کا مطالبہ کرتی ہے اور نہ ہی وہ پیچیدہ اور گنجلک ہو، تو پھر فنکار، کیوں اپنی تخلیق کو پیچیدہ اور گنجلک بنا کر پیش کرتا ہے۔ انھوں نے اپنی تنقیدی کتاب 'نیا ادب نئے مسائل' میں تفصیلی بحث کی ہے۔ جو ان کی سوچ و فکر کا آئینہ دار ہے۔

بشر نواز غزل یا نظم بغیر کسی تخلیقی ارج (تقاضے) کے نہیں لکھتے تھے۔ برخلاف اس کے انھوں نے ہجو یہ نظمیں برجستہ اور برملا سیکڑوں اشعار پر مشتمل نظمیں، چند ہی گھنٹوں میں لکھتے تھے۔ بشر نواز ادب کے آدمی تھے۔ زندگی بھر ادب کی قدروں اور نظریوں کی پاسداری اور آبیاری میں بسر کی۔ وہ ایک ادب نواز اور ادب دوست کی شناخت رکھتے تھے۔ نئے لکھنے والوں کے ساتھ وہ بڑے خلوص سے ملتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اگر انھیں نئے لکھنے والوں میں کوئی خامی نظر آتی تو اس کی طرف توجہ دلاتے اور اس کی اصلاح بھی کرتے تھے۔

بشر نواز ہمہ وقتی ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ مگر ان کے حلقۂ احباب میں مختلف المزاج افراد و اشخاص بھی تھے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ مل کر خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے تھے اور وہ بھی کبھی حکمت اور مصلحت سے کام لینے کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں مراٹھی زبان کے قلمکار بھی شامل تھے جو ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور انھیں اپنے ادبی پروگرام میں بڑی عزت کے ساتھ مدعو کرتے تھے۔ بشر صاحب بحیثیت ایک فلمی نغمہ نگار اور ٹی وی اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے بھی اردو اور مراٹھی عوام میں مشہور تھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مشہور زمانہ ٹی وی سیریل 'امیر خسرو' اسکرپٹ رائٹر کے خوب نام کمایا۔ ان کے فلمی گانے بھی کافی مشہور ہوئے تھے۔

میرے اورنگ آباد کے قیام کے ابتدائی دنوں میں ان کی غزل اکثر لوگ گنگناتے تھے۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

جب چھائی گھٹا، لہرائی دھنک اک حسن مکمل یاد آیا
ان ہاتھوں کی مہندی یاد آئی ان آنکھوں کا کاجل یاد آیا

بشر نواز کے سرمایے میں نیا ادب اور نئے مسائل 1976 کے علاوہ دو شعری مجموعے محفوظ ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ 'رائیگاں' 1972 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ دوسرا شعری مجموعہ 'جنبی سمندر' 1997 میں شائع ہوا۔ اس میں نظمیں، غزلیں، ہائیکو اور ایک عدد غنائیہ شامل ہے۔ بشر صاحب پر ویجویل سنٹر اورنگ آباد نے ایک ڈاکیومنٹری فلم بھی تیار کی۔ جو ان کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالتی ہے۔ انھیں مختلف اداروں نے انعامات اور اعزازات سے نوازا ہے۔ حکومت مہاراشٹرا نے ان کے ادبی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے 'پلوتو ساں' اعزاز سے سرفراز کیا تھا۔

بشر بھائی سے میرے برادرانہ مراسم تھے۔ میں اورنگ آباد میں نیا تھا۔ شہر کے جغرافیہ اور یہاں کے ادبا و شعرا کے اتا پتہ سے واقف نہیں تھا۔ میں اپنی کلاسس اٹینڈ کر کے کمرے پر چلا آتا۔ تھوڑی دیر کے بعد بشر بھائی کی آمد ہوتی، میری خواہش پر، مجھے اپنے ساتھ لے کر شہر کے مہمان ادبا و شعرا سے ملاقات کی غرض سے چلے جاتے۔ سب سے پہلے اورنگ آباد کے معروف و مقبول استاد اور شاعر حضرت محمد یعقوب عثمانی صاحب اور ان کے اکلوتے صاحب زادے ڈاکٹر محمد یوسف عثمانی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یعقوب عثمانی کے بارے میں بشر صاحب صرف کہتے ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنے پہلے مجموعہ کلام پر شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جناب یعقوب عثمانی جن کی رہنمائی میں میرے ادبی سفر کا آغاز ہوا'' عثمانی صاحب کے خاندان سے، بشر نواز صاحب کے گھریلو مراسم رہے ہیں۔ ان کے توسط سے ہی سکندر علی صاحب، ڈاکٹر متین شاکر، پرنسپل مظہر محی الدین، میر ہاشم کے علاوہ کئی دوسرے ادبا و شعرا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

سکندر علی وجد صاحب، بشر بھائی سے بڑی محبت سے، ان کی خاطر تواضع کرتے تھے۔ بشر بھائی بھی ان سے احترام سے ملتے تھے۔ جوگندر پال، قاضی سلیم، بشر نواز اور دیگر احباب نے مراٹھواڑہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر آر پی ناتھ سے ملاقات کر کے، یونیورسٹی کے شعبۂ اشاعت کی جانب سے 'نئے کلاسیک' کی اشاعت کا بندوبست کر لیا تھا۔ یہ زمانے کی بات ہے جب جدیدیت عروج پر تھی۔ 'نئے کلاسیک' کے نام سے ایک اہم انتھالوجی ترتیب دی گئی تھی۔ اس میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کے نمائندہ قلمکار کی منتخب تخلیقات شائع کی تھیں۔ شاعری کا حصہ قاضی سلیم اور بشر نواز نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں بشر نواز کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ نثری حصے کی ذمے داری جناب جوگندر پال کو سونپی گئی تھی۔

بشر بھائی، مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح چاہتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ میری دل جوئی اور حوصلہ افزائی کی۔ کمار پاشی ہر سال، سال بھر کی شاعری کا انتخاب شائع کرتے تھے۔ کسی سال کے انتخاب میں میری ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ بشر بھائی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ حمید، اب تم بھی شاعر ہو گئے ہو۔ ہم تمھیں افسانہ نگار سمجھتے تھے۔

مجھے ایم اے سالِ آخر میں یونیورسٹی کی فیس ادا کرنا تھی۔ ان دنوں میری حالت خستہ تھی۔ میں فیس ادا کرنے سے مجبور تھا۔ اس سلسلے میں پہلے قاضی سلیم صاحب مجھے اپنے ساتھ یونیورسٹی لے گئے۔ وہاں انھوں نے اسسٹنٹ رجسٹرار سے بات کی کہ فیس معاف کر دی جائے۔ قاضی سلیم صاحب کو اسسٹنٹ رجسٹرار کی طرف سے مثبت جواب ملا۔ جب بشر نواز صاحب کو معلوم ہوا تو، انھوں نے وائس چانسلر پروفیسر آر پی ناتھ کے دولت خانے پر، مجھے ساتھ لے کر گئے۔ پروفیسر ناتھ سے، بشر بھائی کے خوشگوار مراسم تھے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بشر بھائی نے ناتھ صاحب سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ''یہ حمید سہروردی ایم اے اردو کے طالب علم ہیں۔ حمید سہروردی نئی نسل کے تازہ کار افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔'' تعارف کے بعد، انھوں نے ناتھ کی خدمت میں مدعا بیان کیا۔ ناتھ صاحب نے مسکراتے ہوئے، مجھ سے کہا کہ آپ کل میرے آفس میں آیئے۔ دوسرے دن میں VC آفس میں ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے میرا نام اور شعبے کا نام لکھ لیا اور میری فیس کا مسئلہ حل ہو گیا۔

میری ان سے آخری ملاقات 2013 میں احمد نگر کالج، احمد نگر میں 'ولی: شخصیت اور فن' سیمینار میں ہوئی تھی۔ مجھے اختتامی اجلاس میں صدارتی ذمے داریاں سونپ دی گئی تھیں۔ میں نے صدارتی تقریر میں ولی کی شاعری پر چند باتیں کہیں۔ اجلاس کے اختتام کے بعد، مجھے اپنے گلے لگایا اور صدارتی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے مبارکباد دی اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔ افسوس کہ میں اپنے مخلص بزرگ دوست سے محروم ہو گیا۔ اللہ ان سے خیر کا معاملہ کرے۔ آمین!

بشر نواز کا ادبی سرمایہ، اردو ادب کا گراں قدر اثاثہ ہے۔ بشر نواز ایک تخلیقی فن کار تھے۔ ان کی شاعری میں روایت کی پاسداری بھی ہے اور جدیدیت کی آبیاری بھی۔ انھوں نے خواب اور حقیقت اور اس کے متعلقات کو کئی زاویوں سے پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں معنی کی تہہ داری بھی ہے اور فکر کی جولانی بھی۔ وہ ماضی اور حال کے معاملات سے غزل اور نظم کی صورت گری بھی کرتے ہیں۔

ہر آدمی خواب دیکھتا ہے اور بھول جاتا ہے۔ فنکار کا خواب نیند اور موت کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ وہ حقیقت میں خواب کی تعبیریں تلاش کرنے میں سرگرداں اور سرگرم عمل رہتا ہے۔ بشر نواز کی شاعری میں خواب کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے اور وہ خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے آرزومند رہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

یہی چہرہ، یہی آنکھیں، یہی رنگت نکلے!
جب کوئی خواب تراشوں، تیری صورت نکلے!

اسی امید پہ خوابوں سے سجالی نیندیں
کبھی ممکن ہے کوئی خواب حقیقت نکلے

خواب اپنے ہوئے دنیا کے حوالے کتنے
کھو گئے ان ہی اندھیروں میں اجالے کتنے

خواہش تھی کوئی خواب مجسم بھی دیکھتے
قوسِ قزح کو چھو کے کبھی ہم بھی دیکھتے

بھٹکے ہوئے خوابوں کو ڈھونڈوں تو کہاں ڈھونڈوں
رستے تو کئی دن سے سونے ہیں مرے دل کے

دیوار سی حائل ہے کوئی روح و بدن میں
خوابوں میں وہ موجود ہے پہلو سے جدا ہے

ٹوٹے یہ کن اجالوں میں خوابوں کے سلسلے
سب آسرے کے، نام پہ بے آسرے ہوئے

ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

مجھے خواب اپنا عزیز تھا/سو میں نیند سے نہ جگا کبھی
مجھے نیند اپنی عزیز ہے/کہ میں سرزمین پہ خواب کی
کوئی پھول ایسا کھلا سکوں/کہ جو مشک بن کے مہک سکے
کوئی دیپ ایسا جلا سکوں/جو ستارہ بن کے دمک سکے

مرا خواب اب بھی ہے نیند میں/مری نیند اب بھی ہے منتظر
کہ میں وہ کرشمہ دکھا سکوں/کہیں پھول کوئی کھلا سکوں
کہیں دیپ کوئی جلا سکوں (نارسا)

بشر نواز کی شاعرانہ فکر میں رومانی احساسات و جذبات کا بڑا دخل ہے۔ ان کی تخلیقی لفظیات میں ایک خوشگوار آہنگ ہر جگہ محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سامع اور قاری پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے۔ زبان کی سلاست اور روانی شگفتگی اور شائستگی، رومانی احساسات اور فکری احتجاج کی لے، ان کے شعری ڈکشن کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔

بشر نواز باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی یاد مدتوں آتی رہے گی۔ ان کے ساتھ گزرا ہوا، ہر لمحہ، ہر پل یاد آتا رہے گا۔ کن کن باتوں کو یاد کریں۔ بقول بشر بھائی:

کرو گے یاد تو ہر بات یاد آئے گی

Prof. Hameed Suharwardy, 'Saiban' Zubair Colony, Hagarga Cross, Ring Road, Gulbarga - 585104 (K.S)

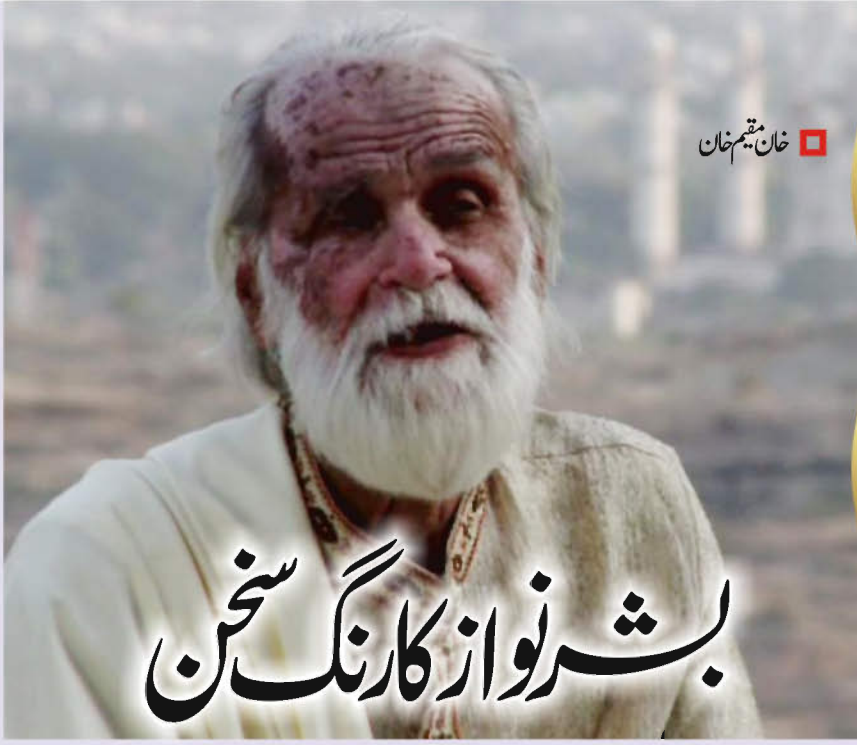

بشر نواز کا رنگِ سخن

خان مقیم خان

ریاستِ مہاراشٹر کا شہر اورنگ آباد تاریخی، تہذیبی اور ادبی وراثتوں کا امین ہے۔ یہ شہر پہلے کھڑکی تھا، پھر فتح نگر ہوا بعد میں اورنگ آباد۔ شہر کے اطراف و جوانب میں واقع دولت آباد، خُلد آباد، پیٹھن اِس کے تاریخی اور تہذیبی حوالے ہیں۔ مشہورِ زمانہ اجنتا اور ایلورہ کے غار سنگتراشی اور مُصوّری کے بے مثال نمونے ہیں۔ خُلد آباد اولیائے کرام کی سرزمین ہے، یہ زمین روحانی سیرابی، سرشاری اور صوفیانہ فیضان و عرفان کا سرچشمہ ہے۔ یہاں جیّد بزرگانِ دین کی مزار ہیں۔ عظیم الشان مُغلیہ سلطنت کے صوفی منش مگر پُرجلال اورنگ زیب اسی زمین میں آرام فرما ہیں۔ دولت آباد کے ناقابلِ تسخیر قلعے کی فصیلوں میں کئی کہانیاں زندہ ہیں، تاج محل کا عکس بی بی کا مقبرہ، زوال پذیر مغلیہ سلطنت کے فنِ تعمیر کی آخری نشانی ہے۔ اِس شہر کا اپنا ایک مزاج ہے۔ تہذیب و تمدن، زبان و بیان، شعر و ادب کے حوالے سے یہ خود ایک دبستان ہے۔ فصیلِ بند اس شہر میں 52 دروازے ہیں۔ ہر دروازے کا ایک نام اور ایک تاریخ ہے۔ اِن ہی میں سے ایک دروازے کا نام مکّئی دروازہ ہے، جس سے لگ کر کھام ندی بہا کرتی تھی جو اب سوکھ گئی ہے۔ مکّئی دروازے سے مُتصل جو محلہ ہے وہ گھاٹی کہلاتا ہے۔ اسی محلّے میں مُنشی امین الدین کی مسجد کے سامنے لکڑی کی چھت کا قدیم وضع کا ایک مکان تھا جو دیوڑھی کہلاتا تھا، اس دیوڑھی میں ایک پٹھان خاندان آباد تھا، جس کے سربراہ سرفراز خان تھے۔ اُن کے اِکلوتے بیٹے کا نام امیر نواز خان تھا۔ امیر نواز خان کی جملہ 9 اولادیں تھیں، سات بیٹے اور دو بیٹیاں۔ دو بیٹے کمسنی میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ اِن ہی امیر نواز خان کے گھر اگست 1935 کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام بشارت نواز خان رکھا گیا۔ یہی لڑکا بعد میں بشارت نواز سے بشر نواز ہوا۔ دادا، سرفراز خان گو کہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن آج سے تقریباً سو سال قبل اُنھوں نے اپنے بیٹے امیر نواز خان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھجوایا اور اُن کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے 50 روپے ماہانہ بھی بھیجتے رہے۔ گریجویشن کے بعد امیر نواز خان وطن لوٹے تو ناظرِ تعلیمات مُقرر ہوئے، لیکن جلد ہی متواتر تبادلوں سے تنگ آ کر ملٹی پرپز اسکول میں ٹیچر ہو گئے اسی ملٹی پرپز اسکول سے اُن کے دوسرے بیٹے بشارت نواز خان یعنی بشر نواز نے 1952 میں میٹرک پاس کیا لیکن دادا مرحوم کے احترام میں اِس سے آگے نہیں پڑھا۔

اُس زمانے میں 60۔70 ہزار کی آبادی والے اِس شہر کی فضا ادبی ذہن سازی کے لیے بڑی ساز گار تھی۔ یعقوب عثمانی، انور معظم، وحید اختر، صدق جائیسی، قاضی سلیم کی صحبتیں، ولی محمد خان صاحب کی بزرگانہ اور مُشفقانہ رفاقتیں، مشاعروں، ادبی مباحثوں، مذاکروں، محفلوں اور مجلسوں میں شرکتوں نے ہی بشارت نواز خان کو بشر نواز کیا۔

کسرتی جسم، درمیانہ قد، گوری رنگت، چمکدار آنکھیں، آنکھوں سے جھلکتی ذہانت اور چہرے سے ٹپکتی متانت کسی بھی محفل یا مجلس میں 17۔18 سال کے اِس خوبرو نوجوان کی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔ 1954 میں شہر میں منعقدہ کُل ہند مشاعرے میں اِس نوجوان نے جو غزل پڑھی تھی اس کا ایک شعر ہے:

یہ اہتمام ِ چراغاں بجا سہی لیکن
سحر تو ہو نہیں سکتی دیا جلانے سے

اس مشاعرے میں ساحر، مجروح، جاں نثار اختر، عزیز قیسی، شاذ تمکنت، وحید اختر اور قاضی سلیم بھی موجود تھے اور شاید اسی مشاعرے سے بشر نواز کے شعری سفر کا آغاز بھی ہوا تھا۔ غزل کی روایتی کلاسیکی زبان، لہجے، تجربے اور اسلوب نے بشر نواز کو جلد ہی اپنے ہمعصروں میں ممتاز بنا دیا۔ جواں عمری میں کہی گئی اُن کی یہ غزل سامعین پیرانہ سالی میں بھی اُن سے سُنانے کی فرمائش کرتے اور بشر نواز بھی اسے بڑے شوق سے سُناتے۔ اِس غزل کے چند شعر یہ ہیں:

جب چھائی گھٹا، لہرائی دھنک، اک حسنِ مکمل یاد آیا
اُن ہاتھوں کی مہندی یاد آئی اُن آنکھوں کا کاجل یاد آیا
سو طرح سے خود کو بہلا کر ہم جس کو بھلائے بیٹھے تھے
کل رات اچانک جانے کیوں وہ ہم کو مسلسل یاد آیا
صحرا ہو کہ گلشن ہو کوئی بستی ہو کہ بن پھر جی نہ لگا
جب نین رسیلے، روپ سجیلا تن وہ کومل یاد آیا

جس بستی میں بشر نواز نے آنکھیں کھولیں اور سنِ شعور کو پہنچے وہ بستی اپنے دامن میں فنونِ لطیفہ، شعر و نغمہ، ادب و ثقافت کے ساتھ ہی ملک عنبر کی تعمیر کردہ جامع مسجد، بی بی کا مقبرہ، پن چکی، محلوں، تاریخی دروازوں اور فصیلوں کے جلال اور باغات اور تالابوں کے جمال کو سمیٹے ہوئے تھی۔ جا بہ جا بکھرے قدرتی مناظر نے بشر نواز کے احساسِ جمال کو نکھارا۔ اُن کی شاعری کا ابتدائی دور اسی جمالیات کا پرتو ہے اور یہی جمالیات اُن کا تخلیقی مزاج بھی ہے۔ چند شعر دیکھیے:

پھر یوں ہوا کہ کانپتے ہونٹوں کے لمس سے
دونوں پہ جیسے آگ کا بادل برس گیا
کیوں سانس ہوئی جاتی ہے کچھ اور بھی گہری
کیوں ٹوٹ چکے بند قبا تم بھی تو دیکھو
ایسے پہلو میں سما جاؤ کہ جیسے دل ہو
چین ملتا ہے کہاں موج کو ساحل کے سوا
چھیڑا ذرا صبا نے تو گلنا ر ہو گئے
غنچے بھی مہ جمالوں کے رُخسار ہو گئے
جب سے کسی کے عارض و لب سے بزمِ شعر سجائی ہے
ہر سو اپنے، رنگِ سخن کے طرز ادا کے چرچے ہیں

لیکن جلد ہی اُن کے اس رنگِ سخن اور رنگِ جمال پر زندگی کے تلخ تجربات، مشاہدات، محسوسات اور رشتوں کے جھوٹے تقدس کا غبار چھانے لگا اور شاید اسی سبب بعد کے دور کی ان کی شاعری زیادہ تہہ دار اور گہری ہوتی گئی۔ بشر نواز کا دور نئی تبدیلیوں کا دور تھا، نئے تجربوں اور مشاہدوں کا دور تھا، ترقی پسند تحریک کے شور و غل کا دور تھا۔

بشر نواز کا پہلا مجموعہ کلام 'رائیگاں' جنوری 1982 میں اور دوسرا اور آخری شعری مجموعہ 'اجنبی سمندر' 1997 میں شائع ہوا۔ 'رائیگاں' کی نظموں اور بیشتر غزلوں میں بشر نواز کے تبدیل شدہ لہجے کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے:

بدل رہی ہے نئی صورتیں نئے قالب
ہر ایک چوٹ ہر ایک ضرب سرخ آہن کو
پیامِ مرگ بھی ہے مژدۂ حیات بھی ہے
یہ بستیاں ہیں کہ ہیں کارگاہِ شور جہاں
ہر ایک آہ ہر اک قہقہہ مشینوں کی
گرجتی گونجتی چیخوں میں ہو گیا ہے گُم
کوئی تو مجھ کو سنبھالے کوئی تو بات کرے

آنے والے مصنفوں کے نام/ایک رقعہ لکھیں
اور یوں لکھیں/ہم تو اپنے دور کی بے رنگیوں بدعہدیوں اور
نفرتوں/مُردہ تفصیلات کی زندہ کہانی اپنے خوں سے لکھ گئے
ہم کیا کریں گر اپنا خون/کالے بدبودار قاتل زہر ہی کی لہر تھا
اور یہ لکھیں ہمارے دور میں/سات رنگوں کی دھنک
کالے کمبل اوڑھتی تھی/اُجلے اُجلے چاولوں میں سنگریزوں کی
بڑی بہتات تھی/اور ہمارے پیرہن/آگ سے کترے گئے
تھے/اور جوتھا کھال کے اندر پگھل کر بہہ گیا تھا/اور لکھیں یہ بھی
کہ ہم تو اپنا حصہ پا چکے/اب تمھارے واسطے
سات رنگوں کی برہنہ قوس ہے/اس کو اپنے طور پر
جب کبھی ترتیب دینا/خون کے اک رنگ کو چھوڑ دینا اُن کے نام
جن کی رگ رگ کالے بدبودار قاتل زہر سے بیزار تھی/پھر بھی
اسے ڈھونے پہ جو مجبور تھے/جن کو اپنے جسم میں
جیتے لہو کی سُرخ دھار/دیکھنے کا عمر بھر ارماں رہا
اور جو اپنے دور کی بے رنگیوں بدعہدیوں اور نفرتوں... مردہ
تفصیلات کی زندہ گواہی دیتے دیتے سو گئے

بشر نواز نے 1976 میں شائع اپنی تنقیدی کتاب 'نیا ادب نئے مسائل' میں لکھا ہے:

''پے بہ پے نئی دریافتوں نے اشیا کی مستقل حیثیت کو مشکوک بنا دیا آسمانی اور خارجی سہارے ہٹ جانے کی وجہ سے آج کا انسان خود اپنی ذات ہی میں گم ہو کر اور از سر نو اپنی در یافت کر کے تسکین پانا چاہتا ہے۔'' اس طرح دور بینی اور داخلیت آج کے ذہن کا اساسی رویہ قرار پاتا ہے''

انفرادی، معاشرتی تہذیبی، سیاسی اور ذہنی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کر کے انھیں نظم کرنے یا غزل کے پیرائے میں ڈھالنے کے تخلیقی عمل کے باوجود بشر نواز اپنی کلاسیکی شعری روایات سے خود کو الگ نہیں کر سکے۔ جن سماجی اور سیاسی حالات میں ان کی ذہنی نشو ونما ہوئی اس کے نتیجے میں ان کی شاعری میں معنی ومفہوم کی نئی راہیں پیدا ہوئیں اور ان کی شاعری کو نئی جہتیں عطا ہوئی۔ اس نئے شعری رویے کے چند اشعار دیکھیے:

بے سمت منزلوں کا سفر در میان ہے
رستوں کے سب نشان اڑا لے گئی ہوا
ہر چہرہ مصلحت کی نقابوں میں کھو گیا
مل بیٹھیں کس کے ساتھ کوئی آشنا تو ہو
رنگ نقلی ہی سہی پھر بھی کھُرچیے مت اسے
کیا ضروری ہے کہ ہر یک شے کو پرکھا کیجیے
پیار کے بندھن خون کے رشتے ٹوٹ گئے خوابوں کی طرح
جاگتی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کیا کیا کاروبار ہوئے
مدت سے پھر رہا ہوں میں اپنی تلاش میں
ہر لمحہ لڑ رہا ہوں خود اپنے خلاف جنگ

بشر نواز کو اپنے عہد کی زمینی حقیقتوں کا احساس اور ادراک تھا ان کا یہی احساس اور ادراک خوش آہنگ لفظوں میں ڈھل کر ان کے اظہار کا ذریعہ بنتا رہا۔ معتبر رسائل اور جرائد میں چھپتا رہا۔

زندگی صرف ادب نہیں ہے اور نہ ہی ادب زندگی ہے زندگی کے ساتھ وابستہ کچھ اور بھی رشتے ہیں۔ ان رشتوں کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ اپنے قلندرانہ مزاج کے باوجود بشر نواز ان رشتوں کی پاسداری کرتے رہے۔ گھریلو امور سے کبھی غافل نہیں رہے۔ بیٹے بیٹیوں کو پڑھایا لکھایا، ان کی شادیاں کیں البتہ ان معاملات میں ان کی اہلیہ مرحومہ چاند سلطانہ کا کردار اہم اور عملی رہا۔ یہ صرف گھر کے سربراہ کی حیثیت سے مشوروں کی حد تک اپنا کردار نبھاتے رہے۔ معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ اپنی سماجی ذمے داریوں سے بھی واقف تھے۔ عملی سیاست سے ان کی وابستگی صرف مقامی بلدیہ کے الیکشن تک ہی رہی۔ سوشلسٹ نظریے سے وابستہ بشر نواز نے 21 سال کی عمر میں بلدیہ کا پہلا انتخاب لڑا اور اپنے حریف کانگریس امیدوار کو ہرایا۔ وہ متواتر دو مرتبہ بلدیہ کے کونسلر منتخب ہوئے، بشر نواز نے عمر بھر مستقل کوئی کام نہیں کیا شاید ان کا قلندرانہ مزاج ملازمت کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنی مالی مجبوریوں کے باوجود انھوں نے ہر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا اور یوں اپنی غیرت وحمیت کو بچائے رکھا۔ بشر نواز نے چند فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔ 1966 میں اُس وقت کے موسیقار ایس این ترپاٹھی نے فلم 'شنکر خان' کے لیے ان سے گیت لکھوائے تھے۔ دارا سنگھ اس فلم کے ہیرو تھے لیکن نہ فلم چلی اور نہ ہی گیت ہٹ ہوئے۔ 1978 میں وہ دوبارہ ممبئی گئے۔ اپنے بڑے بھائی سعادت نواز خان کے گھر ان کا قیام رہا۔ فلم انڈسٹری میں پھر سے قسمت آزمائی کی لیکن شاید فلم انڈسٹری کا مزاج انھیں پسند نہیں آیا یا پھر انڈسٹری کو ان کا مزاج، بہر حال اپنی انا سمیٹے واپس ہو گئے۔

مشہور کہانی کار اور ہدایت کار سرگر سرحدی نے دوستانہ مراسم کی بنا پر اپنی فلم 'بازار' میں بشر نواز سے ایک گیت لکھوایا جسے بھوپیندر نے گایا یہ گیت بہت مقبول ہوا:

کرو گے یاد تو ہر بات یاد آئے گی
نگاہ دور تلک جا کے لوٹ آئے گی

اس فلم کے علاوہ بھی چند اور فلموں کے لیے انھوں نے گیت لکھے لیکن فلمی دنیا انھیں راس نہ آئی۔ بشر نواز نے ٹی وی سیریلس کے لیے بھی لکھا اور نگ آباد میں 19 ستمبر 1976 سے آل انڈیا ریڈیو کی نشریات کا آغاز ہوا۔ اس ریڈیو اسٹیشن سے روزانہ آدھے گھنٹے کا اردو پروگرام 'سب رنگ' نشر ہوتا ہے۔ بشر نواز نے سب رنگ کے لیے بے شمار ڈرامے، فیچرس اور خاکے لکھے۔ ریڈیو کے لیے لکھنا ایک فن ہے، اس فن کی بڑی نزاکتیں ہیں۔ بشر نواز اس میدان کے بھی بڑے قلمکار ٹھہرے۔ ان کے دو منظوم فیچرس 'لوٹے ساون راجہ' اور 'خواب خواب زندگی' ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے براڈ کاسٹ ہوئے۔

لکھنا، پڑھنا، پڑھنا، لکھنا بشر نواز کا مشغلہ اور مصروفیت تھی۔ اچھا اور برا جو کچھ دستیاب ہو جاتا پڑھتے رہتے یہی وجہ تھی کہ کلاسیکی ادب سے ہمعصر ادب، فنون لطیفہ سے اصناف سخن اور اصناف ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ دوسری زبانوں کا ادب بھی پڑھتے رہتے تھے۔ مشاعروں میں بلائے جاتے اور احترام کے ساتھ سنے جاتے تھے۔ البتہ مشاعروں کی تہذیب وادب کے ختم ہو جانے پر رنجیدہ اور شاعروں کے پیشہ ور ہو جانے پر خفا رہتے تھے۔ محض اخلاقی دباؤ اور مالی مجبوریوں کے سبب وہ ان مشاعروں میں شرکت کرتے۔ بشر نواز علاقے کی ہر ادبی محفل کی ضرورت اور ان محفلوں کی کامیابی کی ضمانت تھے۔ بشر نواز کی علمیت، قابلیت، صلاحیت اور شہرت کی بنا پر ہی اورنگ آباد کی ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی نے دو برسوں کی میعاد کے لیے انھیں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا Adjunct Professor مقرر کیا تھا۔ یہ تقرر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا جو یونیورسٹی کے لیے باعث افتخار تھا بشر نواز مہاراشٹر اردو اکادمی کے رُکن رہے۔ انھیں غالب ایوارڈ عطا کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی انھیں متعدد سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا۔ تاہم ان کا سب سے بڑا اعزاز اور انعام یہی تھا کہ وہ لوگوں میں بے انتہا معروف اور مقبول تھے۔ چھوٹے، بڑے سب ہی انھیں بشر بھائی یا 'ماموں' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اپنے ملنے والوں سے انھوں نے کبھی کوئی فاصلہ نہیں رکھا ہر ایک سے والہانہ ملتے اور مشفقانہ برتاؤ کرتے۔

9 جولائی 2015 مقدس ماہ رمضان کی 21 ویں شب، طاق رات، اس مقدس مہینے کی فضیلتوں اور برکتوں سے ہر روح شاداور سرشار۔ بشر نواز رات کے کسی پہر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ بچوں نے سحری کھائی نماز فجر ادا کی ایک بچے نے انھیں جگانے کے لیے کمرے پر دستک دی۔ خلاف معمول دروازہ نہ کھلنے پر کھڑکی سے اندر جھانکا آوازیں لگائی، جواب نہ ملنے پر بچے کھڑکی کے ذریعے کمرے میں داخل ہوئے کمرے میں بشر نواز سو رہے تھے۔ لیکن سانسیں نہیں چل رہی تھیں۔ چہرے پر معمول کی بشاشت اور اطمنان تھا لیکن جسم سے روح کا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ زندگی کے ساتھ وابستہ رشتوں کو جس طرح انھوں نے نبھایا اُس طرح جسم کے ساتھ روح کے رشتے کو برقرار نہ رکھ سکے۔ جمعرات نماز عصر کے بعد شہر کی جامع مسجد میں سیکڑوں لوگوں نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ افطار اور مغرب کی نماز سے شہر کے قبل پنج کنواں قبرستان میں سراج اورنگ آبادی کی مزار سے قریب انہیں سپرد لحد کر دیا گیا۔ جس میں کئی صوفی شاعر اور شاعر صوفی دفن ہیں۔

Khan Muqeem Khan, Ex News Reader, All India Radio, Aurangabad (MS)

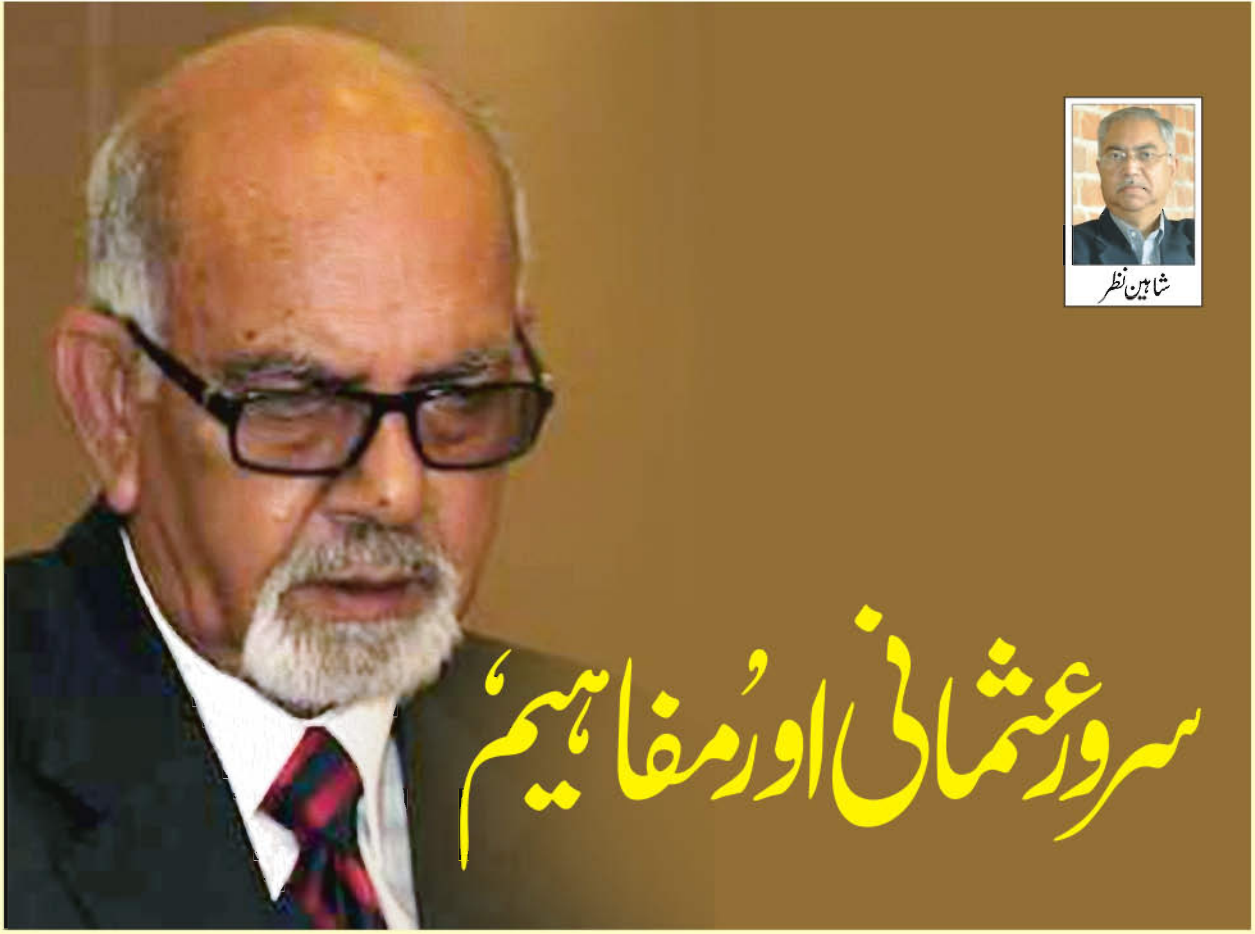

شاہین نظر

سرورِ عثمانی اور ’مفاہیم‘

وہ ادبی رسالے جو اپنے مدیر کی وفات کے ساتھ بند ہو جایا کرتے ہیں لگتا ہے ان کی فہرست میں پچھلے دنوں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس رسالے کا نام ہے ’مفاہیم‘ جس کے مدیر سرور عثمانی کا 26 جون 2015 مطابق 8 رمضان المبارک 1436ھ بروز جمعہ مختصر علالت کے بعد رانچی، صوبہ جھارکھنڈ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 69 سال کی تھی۔

سرور عثمانی نے یہ رسالہ 1978 میں گیا، صوبہ بہار، سے جاری کیا تھا جہاں کے وہ اصلاً رہنے والے تھے۔ چند سال جاری رہ کر اور دو خاص نمبر نکال کر یہ رسالہ 1982/83 میں بند ہو گیا تھا۔ اس وقت تک یہ ادبی دنیا میں اپنی منفرد پہچان بنا چکا تھا اور اس وقت ہندو پاک کے تمام اہم لکھنے والے بشمول راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غیاث احمد گدی، رشید امجد، وزیر آغا، شمس الرحمن فاروقی وغیرہ اس میں چھپا کرتے تھے۔ رسالے کی اشاعت میں اس توقف کی وجہ سرور عثمانی کا گیا سے تبادلہ تھا۔ وہ یونین بینک آف انڈیا میں ملازمت کرتے تھے۔

’مفاہیم‘ کا دور ثانی 2013 میں شروع ہوا جب سرور عثمانی نے تیس سال کے وقفے سے اسے دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بار یہ رسالہ رانچی سے شائع ہوا جہاں وہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بس گئے تھے۔ اس بار انھوں نے ادبی دنیا کو دو خاص نمبر دیے جس میں ایک بار پھر بہت سارے ادیبوں کی تخلیقات جمع کی گئیں۔ چنانچہ دوسرے نمبر پر جو کہ ’مفاہیم‘ کا آخری شمارہ ہے جن ادیبوں کی تحریریں شامل ہیں ان میں گوپی چند نارنگ، رشید امجد، ستیہ پال آنند، شاہین، ساقی فاروقی، کرشن کمار طور، ظہیر صدیقی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

سرور عثمانی ادب کے صحافی ہونے کے علاوہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ یہ شوق انھیں وراثت میں ملا تھا۔ گیا شہر سے بارہ کلومیٹر شمال میں ایک گاؤں پیر بیگھہ ہے جہاں پانی پت سے شاہ جلال کے خاندان کے ایک بزرگ شاہ ماہ رو آ کر آباد ہوئے اور تبلیغ دین کا کام کیا۔ سرور عثمانی اسی خاندان کے فرد تھے۔ رشد و ہدایت، علم و ادب کی خدمت اور دینی و سماجی معاملات میں عوامی قیادت اس خاندان کا خاصہ رہا ہے۔ سرور عثمانی نے اپنے لیے علم و ادب سے وابستگی کی راہ اختیار کی۔ ان کے والد قیوم اثر کی شہرت مقامی طور پر ایک سماجی کارکن اور ٹریڈ یونین لیڈر کے بطور تھی۔ شاعری انھوں نے جوانی میں ہی ترک کر دی تھی مگر شعر و ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے گھر پہ جہاں سیاسی اور سماجی شخصیتیں جمع ہوتی تھیں وہیں ادبی نشستوں کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔

> **’مفاہیم‘ کا دور ثانی 2013 میں شروع ہوا جب سرور عثمانی نے تیس سال کے وقفے سے اسے دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بار یہ رسالہ رانچی سے شائع ہوا جہاں وہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بس گئے تھے۔ اس بار انھوں نے ادبی دنیا کو دو خاص نمبر دیے جس میں ایک بار پھر بہت سارے ادیبوں کی تخلیقات جمع کی گئیں۔ چنانچہ دوسرے نمبر پر جو کہ ’مفاہیم‘ کا آخری شمارہ ہے جن ادیبوں کی تحریریں شامل ہیں ان میں گوپی چند نارنگ، رشید امجد، ستیہ پال آنند، شاہین، ساقی فاروقی، کرشن کمار طور، ظہیر صدیقی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔**

سرور عثمانی نے پی ایچ ڈی کا مقالہ حضرت باقر علی باقر پیر بیگھوی پر لکھا تھا جو ایک طرف غالب کے شاگرد تھے تو دوسری طرف ان کے دادا شاہ عبدالعزیز آزاد پیر بیگھوی کے استاد آزاد، اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور اپنے وقت کے مشہور رسالہ ’ندیم‘ کی ادارت سے وابستہ تھے۔ سرور عثمانی کا اصل نام سرور جاوید تھا۔ انھوں نے اپنا قلمی نام اپنے چچا قیصر عثمان سے متاثر ہو کر رکھا تھا۔ خود قیصر عثمان کا اصل نام سید عبدالحی تھا جو کہ ساحر اور مجروح وغیرہ کے ہم عصروں میں تھے۔ مگر انھوں نے نغمہ نگاری کے بجائے خود کو فلم پروڈکشن تک محدود رکھا۔

سرور عثمانی کا کوئی مجموعۂ کلام منظر عام پر نہیں آ سکا۔ انھوں نے اپنی غزلوں کا انتخاب ’جانم‘ اور نظموں کا ’رفتہ رفتہ‘ کے نام سے ترتیب دیا جن کے لیے علی الترتیب بہار اردو اکادمی اور فخر الدین علی احمد اکادمی سے گرانٹ بھی منظور ہو گیا۔ اثر پبلی کیشنز کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ چلاتے تھے جس کے

غزل

درمیاں اک فاصلہ رہ جائے گا
سوچنے کو اور کیا رہ جائے گا
عین ممکن ہے وہ معشوق جہاں
سات پردوں میں چھپا رہ جائے گا
دربہ در ہوتے رہیں گے عمر بھر
ہجرتوں کا سلسلہ رہ جائے گا
مقبرے بنتے رہیں گے خواب کے
نام زندہ عشق کا رہ جائے گا
حشرت تک رہ جائے گی یادِ حسین
اور لب پر کربلا رہ جائے گا
واقعی اک دن قیامت آئے گی
اور پھر تنہا خدا رہ جائے گا

ماتمی رقص

سنو آسماں کے فرشتو!
تمھیں اک عذابِ مسلسل سے دو چار ہونا پڑے گا
فلک کے مکیں بھی پریشان ہوں گے
خدا کالے سورج کو روتا ہوا دیکھ کر حکم دے گا

یہ منظر مرے سامنے سے ہٹا دو
میں اظہار کے نت نئے حوصلوں سے نوازا کروں گا
کہ میں حشر تک حکمرانی کا دعویٰ بہت پہلے ہی کر چکا ہوں
یہ ارض و سما دسترس میں مری
رقص کرتے رہیں گے
تو میں روشنی کی کمیں گاہ میں
روز و شب کی تہی دستیاں قید کرتا رہوں گا
کہ اب بوڑھے برگد کی سوکھی ہوئی پتیاں
ماتمی رقص کرنے لگی ہیں.....!

تحت 'مفاہیم' چھپتا تھا اور دیگر کتابیں بھی۔ مگر خود اپنی کتابیں نہیں چھپوا سکے جس کی وجہ غالباً اُن کی یہ سوچ تھی کہ جلدی کیا ہے پھر کبھی چھپوالیں گے۔

'مفاہیم' کا پہلا شمارہ 'ا ب' کے نام سے شائع ہوا تھا مگر اتفاق سے ہی نام سے رجسٹریشن نہیں مل سکا اس لیے اگلا شمارہ 'مفاہیم' کے نام سے نکلا۔ اس کے پہلے مدیر تاج انور تھے جن کے پاس کلام حیدری کے مورچہ اور آہنگ میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ مگر وہ سال بھر سے زیادہ مفاہیم کے ساتھ نہیں رہ سکے اور سرور عثمانی نے خود اس کی کمان سنبھالی۔ چونکہ بینک میں ملازمت کرتے تھے اس لیے اپنی بیگم افسری جبیں (انتقال 1996) کا نام بحیثیت مدیر دینے لگے۔ 1980 میں 'جدید اردو کہانی نمبر' ترتیب دیا جس کی ادبی دنیا میں زبردست پذیرائی ہوئی۔ راجندر سنگھ بیدی نے اس کے بارے میں لکھا ''مفاہیم بہت عمدہ نکلا ہے۔ اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔'' وزیر آغا نے لکھا ''میں سمجھتا تھا کہ مفاہیم کا کوئی عام سا افسانہ نمبر ہوگا مگر یہ تو چیزے دیگر نکلا۔'' مظہر امام نے لکھا ''آپ نے اتنا وقیع، جاندار اور خوبصورت نمبر شائع کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے... تقریباً پچاس افسانہ نگاروں کی تازہ تخلیقات حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔'' محمود واجد نے لکھا ''کراچی میں اسے خلافِ توقع کہا جارہا ہے۔ یہاں بڑی مشکلوں سے تعریف کے بول نکلتے ہیں مگر میں جن اہل الرائے کا حوالہ دے رہا ہوں ان کی باتوں میں وزن ہوتا ہے۔ کم از کم نمبر مواد کے اعتبار سے گراں قدر ہے۔''

مفاہیم غالباً پہلا ادبی رسالہ ہوگا جو کہ تیس سال بعد دوبارہ منظرِ عام پر آیا۔ اس عرصے میں نہ صرف یہ کہ سرور عثمانی نے رسالہ شائع نہیں کیا بلکہ اپنی تخلیقات بھی رسالوں میں نہیں بھیجی۔ ہاں کراچی سے شائع ہونے والے رسالہ آئندہ میں ان کی تخلیقات نظر آئیں وہ بھی اس وجہ سے کہ اس کے مدیر محمود واجد کا تعلق بھی پیر بگھ سے تھا اور وہ رشتے میں ان کے چچا ہوتے تھے۔ ایک سال وہ ہندوستان آئے تو ان کی تخلیقات اپنے ساتھ لیتے گئے اور 'آئندہ' میں کافی دنوں تک شائع کرتے رہے۔ اس کے علاوہ کلکتہ کے روزنامہ آبشار میں کافی دنوں تک ان کے قطعات چھپتے رہے۔ یہ کام بھی انھوں نے اپنے ایک بزرگ کے حکم کی تعمیل میں کیا۔

2013 میں جب 'مفاہیم' کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو انھیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سارے پرانے ادیب فوت ہو چکے تھے اور نئے لکھنے والوں سے وہ رابطے میں نہیں تھے یا ان سے رشتہ بس واجبی سا تھا۔ بہر حال ایک سال کی جاں فشانی کے بعد جولائی 2014 میں وہ چار سو صفحات کا ایک کتابی سلسلہ شائع کر سکے۔ خیر سے اسے پسند کیا گیا اور ان کی حوصلہ افزائی ہوئی جس کے بعد دسمبر 2014 میں 'مفاہیم' کا ایک اور شمارہ اس بار پانچ سو صفحات کا منظرِ عام پر آیا۔ انتقال سے پہلے وہ ناول نمبر ترتیب دے رہے تھے۔ کافی مواد جمع کر چکے تھے مگر زندگی نے انھیں مزید کام کرنے کی مہلت نہیں دی۔ ان کے جانے کے بعد اب 'مفاہیم' کا جاری رہنا ممکن نہیں۔ اس مضمون کو اس کے بند ہونے کا اعلان سمجھا جائے۔ ان کی دوسری بیوی رانچی میں رہتی ہیں اور ایک اسکول چلاتی ہیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ سب کے سب اللہ کے فضل سے خوش حال ہیں اور چار الگ الگ ملکوں میں مقیم ہیں۔ ان میں سے کسی کا بھی میدان کار ادب نہیں۔ مفاہیم کی ادارت میں انھوں نے اپنے تینوں چھوٹے بھائیوں بشمول راقم الحروف کو رکھا ہوا تھا۔ ہم تینوں بھی الگ الگ شہروں میں رہتے ہیں۔ گو زبان و ادب سے ہمیں گہرا لگاؤ ہے مگر وہ جنون ہم کہاں سے لائیں جو بھائی جان کا خاصہ تھا۔

مفاہیم کی تشکیل نو پر جس قسم کے تاثرات آئے انھیں پڑھ کر اس کے بند ہونے کا ہمیں خاص طور پر افسوس ہے۔ راولپنڈی سے رشید امجد لکھتے ہیں ''مفاہیم ملا۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ایک زمانہ تھا مفاہیم کا انتظار رہتا تھا۔ پرچہ آتا تو اسے شام کو شالیمار (پنڈل کافی ہاؤس) لے جاتا، بس پھر پرچہ کئی دن ہاتھ نہ آتا۔ اس کے خاص نمبر تو آج بھی حوالے کے طور پر زندہ ہیں۔''

دہلی سے گوپی چند نارنگ نے لکھا ''مفاہیم ادب نمبر 2014 بہت خوب ہے۔ اللہ آپ کا حوصلہ بلند رکھے۔ تبصرہ کی فکر نہ کریں، جو بھی چیز پسند آئے شائع کریں۔''

دہلی سے ہی مظفر حنفی نے لکھا ''آپ سے ایسی ہی شاندار واپسی کی توقع تھی۔''

امریکہ سے ستیہ پال آنند نے لکھا ''نظموں کے حوالے سے آپ کے نام نامی سے میری واقفیت بہت پرانی ہے۔ اس شمارے میں بھی تین بہت خوبصورت نظمیں ہیں جن کی امیجری دل کو موہ لیتی ہے۔ اس لحاظ سے آپ تصویری مفاہیم کے شاعر ہیں کہ باصرہ منظرنامے کو الفاظ کا جامہ پہنچا کر اسے معانی سے بھر دیتے ہیں۔''

کناڈا سے شاہین نے لکھا ''مفاہیم کی سادگی، حسن اور ادارت نے کئی ادبی گوشے منور کر رکھے ہیں جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے... آپ کی شاعری پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ آپ ان نکتہ سنج شاعروں میں ہیں جو محسوسات اور تجربات کی مختلف سطحوں کا ادراک رکھتے ہیں اور انھیں اپنی دروں بینی سے صیقل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ آپ کی شاعری مجھے حیران کر گئی یہ بات میں مسرت آگیں خلوص کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔''

Shaheen Nazar, Adjunct Faculty, Department of Mass Communication, Sharda University, Knowledge Park, Greater Noida - 201306

تمام احباب اور ملّی اداروں کا

بے حد شکریہ

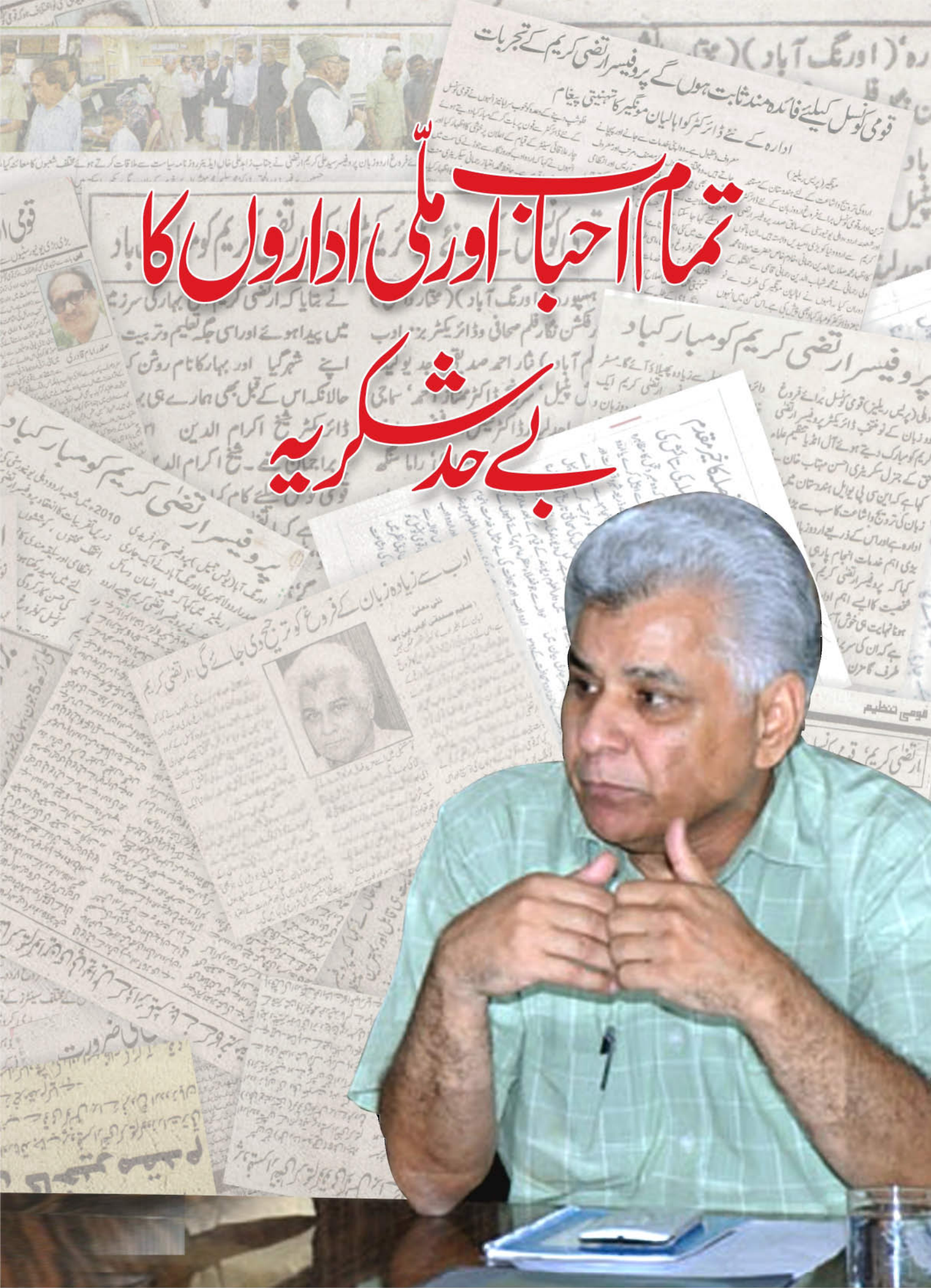

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو مبارکباد

ادارہ سیاست کی خدمات اور سرگرمیاں قابل تقلید

قومی کونسل کیلئے انتہائی مفید ثابت ہوں گے پروفیسر ارتضیٰ کریم کے تجربات: صلاح الدین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نئے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم

ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کو شمس الرحمن فاروقی نے مبارکباد پیش کی

ارتضیٰ کریم کے ڈائرکٹر منتخب ہونے کے بعد اردو کا علمی و ادبی حلقہ پرامید

ارتضیٰ کریم کی تقرری کو تنظیم علماء حق نے سراہا

ادب سے زیادہ زبان کے فروغ کو ترجیح دی جائے گی: ارتضیٰ کریم

اردو کونسل کے مختلف مراکز کے قیام پر عمل درآمد شروع

ارتضیٰ کریم کو علی گڑھ برادری کی مبارکباد

قومی کونسل کیلئے فائدہ مند ثابت ہوں گے پروفیسر ارتضیٰ کریم کے تجربات

پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ڈائریکٹر منتخب ہو جانے پر ادبی حلقہ میں خوشی کی لہر

صحافت کے حوالہ سے قومی کونسل کے فیصلہ کا خیر مقدم

فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر بننے پر مبارک باد

این سی پی یو ایل کے نئے ڈائریکٹر کو مبارکباد

قومی کونسل کے نئے ڈائریکٹر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کو مبارک باد

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو این سی پی یو ایل کا ڈائریکٹر بنائے جانے سے نئے عہد کا آغاز

ڈاکٹر ارتضا کریم کو این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر بنانے کے کا خیر مقدم

میں اردو کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کروں گا: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں نئے ڈائرکٹر کا استقبالیہ

پروفیسر ارتضیٰ کریم کے کونسل کا ڈائریکٹر بننے پر اردو حلقوں میں خوشی کی لہر

زبان کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں: ڈاکٹر ولی

ارتضیٰ کریم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نئے ڈائرکٹر

قومی اردو کونسل کو نئے ویژن کی ضرورت

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی نامزدگی کا خیر مقدم

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پروفیسر سید علی کریم ارتضیٰ نے جناب زاہد علی خان ایڈیٹر روزنامہ سیاست سے ملاقات کرتے ہوئے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔ تصویر میں پدم شری جناب مجتبیٰ حسین، پروفیسر زاہد الحق، ڈاکٹر محمد سلیم، محمد بشیر الدین خرم کے علاوہ دیگر دیکھے جاسکتے ہیں۔

تبصرہ وتعارف

اقتصادیات برائے عوام

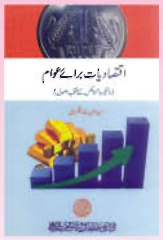

مصنف: سید اطہر رضا بلگرامی

صفحات: 142 قیمت: 70، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر نشاں زیدی، بی 63، ڈی ایل ایف کالونی صاحب آباد، ضلع غازی آباد

'اقتصادیات برائے عوام' سید اطہر رضا بلگرامی کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے زیادہ تر مضامین سہ ماہی رسالہ 'نئی کتاب' میں شائع ہو چکے ہیں۔ مصنف نے بڑے سلیقہ سے مائکرو اکنامکس کے اصولوں سے اردو کے قارئین کو روشناس کرانے کی سعی کی ہے۔ اور یہ ذہن نشین کرایا ہے کہ اقتصادیات کے اصول عوام کی زندگی سے کتنے قریب ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''ایک مضمون جس کے تمام اصول انسان کی روزمرہ زندگی سے جڑے ہوں، جن کو جانے انجانے وہ برتتا رہتا ہو اور تا عمر اس کی زندگی کی تمام تر سرگرمیوں کا احاطہ کیے رہتا ہو، وہ کتابوں میں اتنا دقیق اتنا اجنبی کیوں بنا رہے۔ کیوں نہ اس کو عوام کا آئینہ بنا دیا جائے۔''

اسی مقصد کے تحت مصنف نے ان مضامین کو آسان زبان میں تحریر کیا ہے۔ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو مضامین 'اکنامکس: تعارف برائے عوام' اور 'اکنامکس: آئینہ زندگی' میں مصنف نے قاری کو اقتصادیات سے متعارف کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس کی اہمیت پر تفصیل سے بات چیت کی ہے۔ دوسرے مضمون میں مصنف نے بڑے مؤثر انداز میں بزرگوں کی مخالفت کے باوجود اقتصادیات مضمون پڑھنے کا قصہ بیان کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا ہے کہ کس طرح سے ان کے استاد نے اس خشک موضوع کو بیان کی چاشنی سے تر کر کے کلاس میں پیش کیا جس سے اقتصادیات کے تئیں ان کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اس پورے مضمون میں مصنف نے اپنے استاد کی تقریر کے ذریعہ اقتصادیات کی ضرورت کو سمجھایا ہے۔ 'اقتصادیات کا نظریۂ قدر' مضمون کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی زندگی میں کسی شے کی قدر و قیمت کیوں بڑھتی ہے اور کس وجہ سے کم ہو جاتی ہے اور اپنی بات کو مصنف نے بڑے عمدہ انداز میں ثابت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''پیاس میں پانی کے ہر گھونٹ کے ساتھ اور بھوک میں ہر نوالے کے ساتھ احساس تسکین بڑھتا جائے گا۔ اس لیے ہر اگلے گھونٹ یا ہر اگلی روٹی یا اگلے نوالے میں قوت تسکین گرتی جائے گی۔'' اس کے علاوہ ڈائیگرامس کے ذریعہ بھی اپنی بات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ صارف دو اشیا کے درمیان کیسے اور کیوں بے نیاز ہے اس کو دو چیزوں کے درمیان فرق کیوں نظر نہیں آتا اس کا ذکر مصنف نے چوتھے مضمون 'اقتصادیات میں صارفین کے خط بے نیازی کا تصور' میں بخوبی کیا ہے۔ 'تنظیم پیداوار: پیداوار اور پیداواری عمل' میں جہاں تنظیم پیداوار کی ابتدا، پیداوار کی تعریف، پیداوار کے عمل، پیداوار کے عوامل، ان کے باہمی ربط اور ان کی نوعیتوں کا ذکر کیا ہے وہیں چھٹے مضمون میں پیداوار کے عمل سے متعلق اصولوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے بازاروں کی نوعیتوں سے جڑے اصولوں کی تشریح وتنقید پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ آخری باب تقسیم کے اصولوں پر مشتمل ہے، جس میں مصنف نے رینٹ، سود، اجرت اور منافع سے متعلق نظریہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اقتصادیات کے موضوع پر اردو کے قارئین کے لیے یہ ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے مائکرو اکنامکس کے اصول کو تکنیکی الفاظ کے استعمال کے بجائے بیانیہ انداز میں اور آسان پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مصنف نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی ہے کہ روایتی درسی کتابوں کے انداز تشریح سے جہاں تک ممکن ہو سکے بچا جائے اور موضوعات کے مواد کو کلاس روم سے نکال کر عوام کی ذہنی سطحوں تک لے آیا جائے۔ ان تمام ابواب میں ضمنی تفصیلات سے گریز کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے، لیکن اطہر رضا بلگرامی اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ امید ہے کہ اردو کے قارئین اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

ٹی وی نیوز و پروڈکشن فن اور طریقہ کار

مصنف: سمیع الرحمٰن

صفحات: 217، قیمت: 93 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ملنے کا پتہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

مبصر: نوشاد منظر، ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی نے اپنے قیام کے بعد اردو ادب کے متنوع موضوعات پر کافی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ اسی اشاعتی سلسلے کی ایک اہم کڑی سمیع الرحمٰن کی کتاب 'ٹی وی نیوز و پروڈکشن، فن اور طریقہ کار' ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'ٹی وی نیوز و پروڈکشن، فن اور طریقہ کار' کو مصنف نے آٹھ ابواب میں منقسم کیا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف کا مقدمہ اور آخر میں کتابیات بھی شامل ہیں۔ کتاب کا پہلا باب 'ٹیلی ویژن نیوز: ایک تعارف' ہے۔ موجودہ دور میں الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ ٹی وی نیوز کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ناظرین خبر کے ساتھ موقعہ واردات کی ویڈیو بھی دیکھ سکتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سارے واقعات آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہوں۔ مصنف نے نیوز ریڈنگ اور اس میدان میں کام کرنے والوں کی تحریر میں مہارت کو اہمیت دی ہے ان کا خیال ہے کہ تحریر

دلچسپ اور جملوں کی ساخت میں موزونیت کے ساتھ زبان وتحریر میں سلاست اور صحیح محاوروں کا استعمال ہونا چاہیے۔مصنف نے رپورٹر اور نیوز ریڈر کے لیے تعلیم، تجسس اور قوت مشاہدہ، ٹکنالوجی اور تکنیکی مہارت، دباؤ میں اپنے اوپر قابو رکھنا، کسی بھی بات کو انا کے مسئلہ نہ بننے دینا وغیرہ کو ضروری قرار دیا ہے۔

کتاب 'ٹی وی نیوز و پروڈکشن، فن اور طریقہ کار' کے دوسرے حصے میں مصنف نے ہندوستان میں ٹی وی کی ابتدا کی تاریخ، توسیع وغیرہ کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہندستان میں ٹی وی کی ابتدا 15 ستمبر 1959 کو بقول مصنف یونیسکو کے ذریعے چلائے جارہے ایک پروجیکٹ کے تحت ہوئی۔اس وقت اس کا نام دوردرشن تھا (آج بھی اس کا نام دردرشن ہی ہے) شروع میں دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ دہلی اور اس اس کے 24 کلی میٹر کے دائرہ تک محدود تھا۔مصنف نے ہندستان کے تمام نیوز چینلوں کی فہرست بھی دی ہے۔

کتاب کا تیسرا باب 'ٹی وی نیوز روم' ہے۔مصنف سمیع الرحمٰن نے پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے فرق کو بیان کیا ہے۔مصنف نے نیوز چینل سے منسلک لوگوں کے کام اور ان کی ذمہ داریوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

'ٹی وی نیوز و پروڈکشن، فن اور طریقہ کار' کا چوتھا باب 'ٹیلی ویژن نیوز اسٹوری کا طریقۂ کار' ہے۔ مصنف نے خبر کے لیے چھ نکات کو اہم بتایا ہے یعنی کیا، کہاں، کب، کون، کیوں اور کیسے۔صحافی کے لیے یہ چھ نکات بہت ضروری ہیں انہیں نکات کی بنیاد پر کوئی خبر اہم یا غیر اہم ہوجاتی ہے اور ساری خبریں انہی نکات کے اردگرد گھومتی رہتی ہیں۔

کتاب کا پانچواں باب 'ٹی وی نیوز اسٹوری فارمیٹ: بنیادی باتیں' ہے۔کتاب کے اس حصے میں مصنف نے نیوز ریڈر، وائس اوور، لائیو شاٹ، اسکرپٹ نگاری، ویڈیو ایڈیٹنگ، موضوع پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔مصنف کا خیال ہے کہ ٹی وی رائٹنگ مطالعہ اور غور وفکر سے زیادہ ٹریننگ اور ریاض پر مبنی ہوتا ہے۔

کتاب کا چھٹا باب 'ٹی وی اسکرپٹ کے نمونے' ہے۔کسی بھی اچھی خبر کی پیش کش کے لیے سب سے اہم اس کا اسکرپٹ ہوتا ہے۔مصنف نے اس باب میں قاری کی رہنمائی کے لیے اسکرپٹ کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں تاکہ صحافت کے نوواردان کے لیے آسانی ہو۔

کتاب کا ساتواں اور آٹھواں باب بالترتیب 'ٹی وی پروگرام پروڈکشن خاکہ'، 'ٹی وی پروگرام پروڈکشن۔طریقۂ کار' ہیں۔ ہر خبر کے پیچھے بہت سے لوگوں کی محنت لگن اور ان کی مہارت کارفرما ہوتی ہے۔ پروڈکشن ٹیم میں کئی لوگ ہوتے ہیں جن کا کام خبر کو اچھے اور کامیاب طریقے سے نشر کرنا ہوتا ہے۔خبر موصول ہونے سے لے کر نشر تک جن لوگوں کی محنت کام کرتی ہے اسے پروڈکشن ٹیم کہا جاتا ہے جس میں ڈائریکٹر، انجینئر، کیمرہ مین، ایڈیٹر وغیرہ ہوتے ہیں۔مصنف نے ان دونوں ابواب میں ٹی وی پروگرام میں پروڈکشن کی اہمیت اور اس کے طریقۂ کار کو پیش کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'ٹی وی نیوز و پروڈکشن، فن اور طریقہ کار' صحافت بالخصوص برقی صحافت کے میدان میں قدم رکھنے والے نوواردان اور طالب علموں کے لیے بہت معاون و مددگار ثابت ہوگی۔مصنف سمیع الرحمٰن نے بہت محنت، لگن اور باریک بینی سے تمام عناصر کو پیش کیا ہے۔کتاب کی طباعت اچھی ہے، قومی کونسل کی دوسری کتابوں کی طرح اس اہم کتاب کی قیمت کافی مناسب ہے۔

میری یادیں

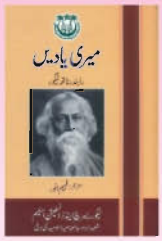

مصنف: رابندر ناتھ ٹیگور

صفحات: 212، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر ریحان حسن

شعبہ اردو، فارسی، گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر، پنجاب

رابندر ناتھ ٹیگور کا شمار ہمارے ان دانشورانِ علم وادب میں ہوتا ہے جو بیک وقت شاعر، ناول نگار، کہانی کار، ڈرامہ نگار، موسیقار، مصور اور ماہر تعلیم تھے۔ظاہر ہے کہ ایسے مختلف النوع جہات سے وابستہ شخصیت کے زندگی کے اسرار ورموز، فکر وفلسفہ اور فن کے ارتقائی سفر سے واقفیت حاصل کرنا فطرت انسانی کا تقاضہ ہے۔اس ناگزیر ضرورت کے پیش نظر خود ٹیگور نے جیون شریتی (میری یادیں) لکھ کر ''گرو دیو'' ہونے کا ثبوت پیش کیا۔

زیر تبصرہ خودنوشت سوانح حیات بنگلہ زبان میں ''جیون شیریتی'' کے نام سے شائع ہوچکی تھی لیکن اردو داں طبقہ کے لیے رابندر ناتھ ٹیگور کی سوانح سے بخوبی فیضیاب ہونا مشکل تھا لہٰذا ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے تحت وزارت ثقافت حکومت ہند کے تعاون سے شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے اکابرین پروفیسر طلعت احمد، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر ندیم احمد نے اردو میں ترجمہ کی ضرورت سمجھتے ہوئے جیون شریتی کے ترجمہ کی ذمہ داری جناب فہیم انور کے سپرد کی، اس کو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے خصوصاً نظموں کے تراجم میں جس صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے اصل زبان کی اصل ساخت سے حتی الامکان چھیڑ چھاڑ سے بچنے کی کوشش کی ہے اس فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان میں ''میری یادیں'' کو ایک مثالی ترجمہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے بالخصوص اسلوب بیان کی سلاست وروانی نے اس ترجمہ کو خاصہ کی چیز بنا دیا ہے۔

'میری یادیں' میں بلند خیالات اور لطیف جذبات کی کارفرمائی جا بجا نظر آتی ہے۔ خودنوشت سوانح کے مطالعہ سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ٹیگور کو کمسنی ہی سے شاعری کی جانب رغبت تھی درحقیقت یہ جھکاؤ خانگی ماحول اور تربیت کے اثر کی بدولت تھا۔ان کے تخلیقی جوہر پاروں میں معاشی اور تعلیمی نظریہ، سماجی تفکر، وطن کا تصور اور سیاسی فکر ان کی انسانیت دوستی کی گواہ ہیں۔یہی سبب تھا کہ وہ جہاں بھی گئے وہاں کی تہذیب وثقافت کو سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔اس موقعے پر والدین، احباب، اساتذہ ملازموں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔مناظر فطرت کی عکاسی خصوصاً ہمالیائی خطوں کی مناظر نگاری میں رابندر ناتھ ٹیگور نے جو ہر کمال دکھایا ہے۔'میری یادیں' میں ٹیگور نے خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کی بھی نشاندہی کی۔

خودنوشت سوانح میں شری کنٹھ بابو کی سادہ لوحی اور ان کے طرز زندگی کی تصاویر اس انداز سے پیش کی گئی ہے کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے نیز شری کنٹھ سے اپنے اور گھر والوں کے تعلق خاطر کو بحسن وخوبی پیش کیا گیا ہے۔اپنے والد کے ساتھ گذرے ہوئے واقعات کو بیان کرنے میں رابندر ناتھ ٹیگور نے قدرت بیان کا ثبوت پیش کیا ہے۔امرتسر کے ایک ماہ قیام کے دوران گرودوارہ کی من موہنی تصویر اور ڈلہوزی کی سیر وسیاحت کے بیان میں ادبی شان وشوکت نظر آتی ہے۔ادبی، تہذیبی، ثقافتی مسائل کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس سوانح سے نہ جانے کتنے زبانوں کے ادبا سے واقفیت

اور بنگلہ، انگریزی، نیز سنسکرت کے کلاسکی ادب سے بھی شناسائی ہوتی ہے۔ اس خودنوشت سوانح میں ٹیگور نے زندگی کی مختلف پرتیں کھولی ہیں۔

ادبی تخلیقات کے متعلق جابجا تنقیدی مباحث بھی ملتے ہیں جن سے ٹیگور کے تنقیدی افکار کے ارتقاء کا ہمیں اندازہ ہوتا ہے۔ بچوں کی فطرت اور عورت کی خصلت کی جانب بھی اشارے کنائے ملتے ہیں۔ لندن کے قیام کے دوران عوام کی ایمانداری، تہذیب و ثقافت، حسن سلوک پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے بنگلہ زبان کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ نیز بنگالی ادب کی اہمیت و وقعیت کا گن گان بھی ہے۔

رابندرناتھ ٹیگور کی اس سوانح میں کتابوں کی اشاعت اور ان کی تخلیقی صلاحیت کے ساتھ تخلیقات کے ظہور کے اسباب و علل کے متعلق مسائل کا بھی ذکر ہے 'میری یادیں' سے سبق آموز باتوں کے ساتھ ساتھ زندگی میں دشواریوں اور پریشانیوں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ گیت اور سنگیت سے متعلق نئے نئے انکشافات بھی ہیں۔ آخری صفحہ پر ٹیگور کا خاندانی شجرہ بھی درج ہے۔ کتابت کی غلطیاں ملتی ہیں لیکن یہ غلطیاں آٹے میں نمک کے برابر ہیں مختصر یہ کہ رابندرناتھ ٹیگور کی تخلیقات کو سمجھنے میں یہ سوانح بہت حد تک ممد و معاون ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے شعبہ اردو جامعہ اسلامیہ بھی لائق مبارک باد ہے کہ جس نے یہ نایاب تحفہ اردو شائقین کے سپرد کیا۔

مقالاتِ پروفیسر نجیب اشرف ندوی

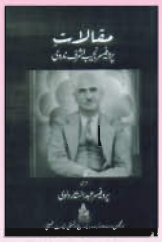

مرتبہ: پروفیسر عبدالستار دلوی
صفحات: 352، قیمت: 400 روپے
ناشر: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی
مبصر: خلیق الزماں نصرت

پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا نام بمبئی کے قابل قدر اساتذہ میں ہوتا ہے وہ بہار کے رہنے والے تھے۔ جنھوں نے یہاں کے اردو والوں کو اردو زبان برتنے کا طریقہ بتایا۔ فلاں لفظ اردو میں کیسے ادا کیا جاتا ہے، اردو محاورے کا استعمال کہاں کیسے ہوتا ہے۔ ان سے لوگ باتوں باتوں میں سیکھتے تھے۔ نجیب اشرف ندوی نے جس تحقیق اور موشگافی سے اپنا نثری کام کیا ہے وہ اردو زبان میں زندہ جاوید رہے گا۔ تحقیقی مضامین اور تنقیدی مضامین میں جس سوچ، فکر و جستجو اور لگن کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید بھی ہے۔

اپنے مقالے 'بمبئی میں اردو' میں نجیب اشرف صاحب لکھتے ہیں:

''عروس البلاد جہاں اپنی گوناگوں دلچسپیوں، اپنی انگنت دلکشیوں، اپنی بے شمار کششوں اور اپنی لاتعداد دل فریبیوں کے لیے مرکز عالم رہا ہے، وہاں ہر عہد کے حوصلہ مند اپنی قسمت آزمانے اور اپنے دامنِ امید کو گوہر مراد سے بھرنے کے لیے اس کے آستانے پر جبہ سائی کرتے رہے ہیں۔''

بڑی خوشی ہوئی جب ان کے ہزاروں شاگردوں میں سے ایک ہونہار شاگرد پروفیسر عبدالستار دلوی جو خود بھی اپنے استاد کی طرح مشہور ہیں، نے ان کے مقالوں کو ایک کتابی شکل دے کر شاگرد رشید ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ کتاب کی شروعات مرتب کے ایک چھوٹے سے مقدمے سے شروع ہوتی ہے۔ دلوی صاحب نجیب اشرف صاحب کے بہت قریب رہے ہیں۔ انھیں ایک مبسوط مقدمہ لکھنا چاہیے تھا تاکہ نجیب اشرف صاحب سے آج کی نسل زیادہ سے زیادہ واقف ہو سکے۔ ہوسکتا ہے کہ دلوی صاحب قارئین اور نجیب اشرف صاحب کے درمیان نہ آنا چاہتے ہوں۔

اس کتاب میں 'بمبئی میں اردو' ہم جیسے قلمکاروں کے لیے کافی کارآمد ہے۔ ہر مضمون ایک گہری تحقیق کا ہے۔ ظاہر ہے اردو کو اس کا بھرپور فائدہ ملے گا۔ ساتھ ہی اس کے پڑھنے والوں کو بھی اس تبصرے میں ان سبھی باتوں کو بتانا ناممکن ہے۔ پھر بھی چند باتیں بتا دیتا ہوں۔ ابتدا میں اردو کی آبیاری میں میمن، بوہرہ، کوکنی، پارسی سبھوں کا ہاتھ ہے۔ یہی لوگ بمبئی کے قدیمی لوگ ہیں۔ ان تمام فرقوں نے اردو کو اپنی مادری زبان سمجھ کر اپنے بچوں کو اردو میڈیم سے پڑھانا شروع کیا۔ نجیب اشرف نے تاریخ کے مطالعہ کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اردو ادب میں ان باتوں کو شامل کرنا وسیع مطالعہ کرنے والوں کا کام ہے۔

دوسرے مقالوں میں میر کی کہانی خود ان کی تصانیف کی زبانی ہے۔ یہ تحقیقی مطالعہ ہے۔ میر کے اشعار اور مختلف تذکروں سے یہ مضمون مکمل کیا گیا ہے۔ جس باریک بینی سے چھان بین کی ہے وہ ایک مثال ہے۔ 'حیات اقبال' کافی وقیع مقالہ ہے جس سے اقبال کے کئی ایسے گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے جو ابھی تک لوگوں کی نظر سے اوجھل تھے۔

کتب خانہ خدا بخش، پٹنہ میں اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ بے شمار مخطوطات ہیں۔ اس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جو ادب پر کام کرنے والوں کے لیے کارگر ہے۔ اسی طرح انڈیا آفس کی لائبریری کے ذخائر کی معلومات دی گئی ہے۔ نجیب اشرف کے کئی لیکچرز کو بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اردو والوں کی بدقسمتی ہے کہ وسائل کے نہ ہونے کی وجہ سے تقریر اور خطبات کو لوگ محفوظ نہیں کرتے۔ تقریروں کو محفوظ نہ رکھنے کی کمی اردو والوں میں زیادہ ہے۔ آج تو بہ آسانی ٹیپ استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ دلوی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی محنت اور کوششوں کے بعد نجیب اشرف صاحب کے تمام مقالات کو یکجا کر کے کتابی شکل دی ہے، ورنہ ان میں سے کچھ تو زمانے کی بے حسی کے شکار ہو جاتے۔

اس کتاب کو عبدالستار دلوی صاحب نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی کے تعاون سے شائع کیا ہے۔ جہاں وہ خود بھی اعزازی ڈائریکٹر ہیں۔ مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ آئندہ بھی وہ ایسی مفید کتابیں اردو والوں کی نذر کریں گے۔ امید ہے یہ کتاب پڑھنے والوں میں کافی مقبول ہوگی۔ لائبریریوں اور جامعہ میں ایسی کتابیں رکھی جاسکتی ہیں۔

سید ظفر ہاشمی ایک نابغہ

مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
صفحات: 148، قیمت: 200 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر محمد تنویر، روم نمبر 212
کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

سید ظفر ہاشمی معاصر عہد کے اہم تخلیق کاروں میں ہیں۔ کتاب 'سید ظفر ہاشمی ایک نابغہ' کے مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ہمت کی داد دینی ہوگی کہ انھوں نے ہاشمی صاحب کے منع کرنے پر بھی ان کی شخصیت اور ادبی خدمات وغیرہ پر لکھے گئے مختلف مضامین کو ترتیب دینے میں تاخیر نہیں کی۔ مرتب نے اپنی گفتنی میں ہاشمی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے ان کی تعلیم اور تعلیمی اداروں کی بھی جانکاری دی ہے۔ ان کے اس تعارفی خاکے سے کتاب کا ہر قاری ایک ہی نگاہ میں ہاشمی صاحب کو پہچان سکتا ہے۔

'سید ظفر ہاشمی ایک نابغہ' کے مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب ہیں۔ یہ کتاب اکتیس منتخب مضامین پر مشتمل ہے جن میں تین منظوم ہیں۔ یہ تمام مضامین ہاشمی صاحب کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے ہیں۔ مضامین لکھنے والوں میں زیادہ تر وہ حضرات شامل ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں ہاشمی صاحب سے وابستہ ہیں۔ اسی

وابستگی نے ہاشمی صاحب پر مضامین لکھنے کے لیے مجبور کیا ہوگا۔ ان چند مضامین کے ذریعے ہاشمی صاحب کی شخصیت اور ان کی اردو زبان سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ہاشمی صاحب ایک ساتھ ناول نگار، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، ایڈیٹر اور صحافی وغیرہ ہیں

کتاب میں شامل سبھی مضامین ہاشمی صاحب کی اب تک کی ادبی خدمات کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ہاشمی صاحب کو سمجھنے کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ ان مضامین میں کوئی ہاشمی صاحب پر تاثرات، کسی نے ان کی خاکہ نگاری، ناول نگاری، افسانہ نگاری، طنز و مزاح اور مدیر تو کسی نے ادبی خدمات کا تعارف کرایا ہے۔ علاوہ اس کے بعض مضامین ان کے افسانوی مجموعہ 'جب ایسا ہو' پر تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو کسی نے ان کی صحافت پر بحث کی ہے۔ اسی طرح کسی نے 'گلکا' پر تو کسی نے 'گلبن' پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ہاشمی صاحب کی ادبی خدمات کو مرکز بنایا ہے تو کسی نے انھیں نبض شناس کہا ہے۔

ترتیب دیے گئے مضامین میں تین منظوم ہیں۔ مرتب نے گفتنی کے بعد سب سے پہلے 'سید ظفر ہاشمی اور جب ایسا ہو' کے عنوان سے لکھی گئی نظم کو جگہ دی ہے۔ اپنے رنگ و آہنگ اور فکر و فن کے اعتبار سے یہ نظم بہت اہم ہے۔ شاعر نے نظم کے ایک ایک مصرعے میں ہاشمی صاحب کی تخلیقات کے عنوان کو اس انداز سے پرویا ہے کہ وہ اسی کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ہاشمی صاحب کے ادبی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک معلوماتی خاکہ پیش کیا ہے۔ دوسری نظم ہاشمی صاحب کے نام کی توشیح ہے۔ اس میں لفظ کے پہلے حرف سے مصرعے یا فقرے بنائے جاتے ہیں۔ شاعر نے ہاشمی صاحب کے نام کی توشیح لکھنے میں اسی فن کا سہارا لیا اور مصرعوں کو ترتیب سے سجا کر ایک خوبصورت نثری نظم لکھ ڈالی۔

کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مرتب نے بعض ایسے معلوماتی مضامین کو جگہ دی ہے کہ جس سے ہاشمی صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلو روشن ہوگئے ہیں۔

غیر منقسم بہار میں اردو کے غیر مسلم شعراء اور ان کی خدمات (۱۹۸۰ء تک)

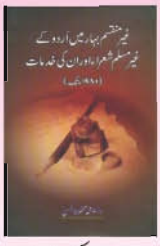

مصنف: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن

صفحات: 312، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: جاوید اختر، ریسرچ اسکالر

شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب 'غیر منقسم بہار میں اردو کے غیر مسلم شعراء اور ان کی خدمات (1980 تک)' کے مصنف پروفیسر محمد محفوظ الحسن کا نام ادبی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپ 15 سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ جنھیں ادبی حلقوں میں پزیرائی مل چکی ہے۔ یہ تصنیف بہت ہی اہم موضوع پر ان کی جامع تحقیق ہے۔

مصنف نے پیش لفظ بہ عنوان 'اعتراف' میں اردو زبان و ادب کے فروغ و اشاعت میں غیر مسلم ادباء کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ غیر مسلموں کا نام اگر اردو ادب کی فہرست سے خارج کر دیا جائے تو اردو ادب 'بونا' ہو جائے گا۔

صاحبِ کتاب نے اسے تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ بابِ اوّل بہ عنوان 'غیر منقسم بہار میں اردو شاعری' ہے۔ اس باب کے دو ضمنی ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ (الف) بہار میں اردو شاعری کا عمومی تعارفی جائزہ، 1980 تک، (ب) غیر منقسم بہار میں اردو کے چند غیر مسلم مربیان ادب۔

'بہار میں اردو شاعری کا عمومی تعارفی جائزہ' میں بعض کئی نامور شعرا کا تعارف، ادبی خدمات اور غیر مسلم ادبا و شعرا کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی حمدیہ، نعتیہ شاعری اور ساتھ میں بیدل کی ایجاد کردہ ریختہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کئی اقتباس اختر اورینوی کے بطور مثال لیے گئے ہیں، جس سے مصنف کی گفتگو مزید مدلل و جامع ہوگئی ہے۔ ضمنی باب (ب) 'اردو کے چند غیر مسلم مربیان ادب' کے تحت مصنف نے بہار میں اردو زبان و ادب کے ان چند ہندو محسنین کا ذکر کیا ہے، جن کے بغیر اردو شعر و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی کا اقتباس، ان کی تصنیف 'شعرالہند' سے لیا گیا ہے۔ اس اقتباس میں شعرائے عظیم آباد اور مرشد آباد کے اردو شعرا کا بیان درج ہے۔ مصنف نے مذکورہ اقتباس کی مدد سے بہار میں اردو شاعری اور شعراء کا اعتراف کیا ہے۔ اس طرح موزون، مہاراجہ رام نرائن، مہاراجہ شتاب رائے، کلیان سنگھ عاشق جیسے شاعروں کے احوال پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

بابِ دوم کے تحت تین ضمنی ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ (الف) عہدِ قدیم کے شعرا۔ حیات، نمونہ کلام، (ب) دورِ وسطیٰ کے شعرا۔ حیات، نمونہ کلام، (ج) دورِ جدید کے شعرا۔ حیات، نمونہ کلام۔

بابِ دوم کے تحت غیر منقسم بہار میں اردو کے غیر مسلم شعرا اور ان کی خدمات (1980 تک) کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسے تین ادوار میں منقسم کیا گیا ہے۔ عہدِ قدیم، دورِ وسطیٰ اور دورِ جدید کے حوالے سے ان غیر مسلم شعرا کی حیات و خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بابِ سوم کے تحت 'غیر منقسم بہار کے غیر مسلم شعرا اور مشترکہ کلچر کی نمائندگی' ہے۔ چند غیر مسلم نامور شعراء کی شاعری کے حوالے سے بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح ان غیر مسلم ادباء و شعراء نے 'مشترکہ کلچر' کی نمائندگی کی ہے۔

ان ابواب کے اختتام کے بعد 'پس نوشت' کے تحت ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن نے واضح کیا ہے کہ غیر منقسم بہار سے مراد بہار اور جھارکھنڈ کے ادبا و شعرا ہیں۔ اس کالم کے تحت 4 اہم نوٹ بھی لکھے گئے ہیں۔ اخیر میں کتابیات بھی درج ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب ایک مکمل دستاویز ہے۔

سات سُروں کی میٹھی ہلچل

مصنف: غیاث انجم

صفحات: 160، قیمت: 150 روپے

ناشر: گلستان پبلی کیشنز، کلکتہ- 700073

مبصر: ڈاکٹر مجاہد اسلام (مجاہد پیامی)، معرفت اقبال احمد

کمرہ نمبر: 10 مکان نمبر: H- 77/11، شحاب مسجد روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

غیاث انجم اہلِ دماغ، زمانہ شناس اور ذہنِ جدید کے شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش بہار کے اس زرخیز علاقے میں 10 جنوری 1950 کو ہوئی ہے جہاں سے اپنے عہد کے دو مشہور شاعر بنام شفق رضوی عماد پوری اور علامہ قوس حمزہ پوری تعلق رکھتے ہیں۔ شفق عماد پوری منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاگرد اور ضلع اورنگ آباد کے باشندہ تھے۔

اورنگ آباد اور گیا دونوں اضلاع دبستانِ عظیم آباد کے زمرے میں آتے ہیں اور اس علاقے کے شعرا میں دبستانِ عظیم آباد کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً خیال کی سادگی و داخلیت۔ اسی دبستان کی خوبیاں انجم کی شاعری میں پھول پھل رہی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب 'سات سُروں کی میٹھی ہل چل' انجم کا اولین مجموعۂ کلام ہے۔ جس میں تقریباً 139 غزلیں اور چند متفرق اشعار ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کا نام ایک شعر کے مصرعِ ثانی پر رکھا ہے۔ وہ شعر ملاحظہ ہو:

تو بولے تو خوشبو پھیلے چاروں اور
سات سُروں کی میٹھی ہل چل تیرے نام

اس شعر میں لفظ 'اور' ہندی کا لفظ ہے جس کے معنی سمت کے ہیں۔ اس مجموعہ میں شاعر حمد سے اپنے کلام کا آغاز کرتا ہے۔ حمد کے بعد شاعر نعتیہ کلام پیش کرتا ہے پھر اس کے بعد اپنی غزل کا سلسلہ شروع کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی شگفتگی، رمز و ایما اور سوز و گداز ملتے ہیں۔ فکری اعتبار سے ان کی شاعری میں عصرِ حاضر کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی شاعری کا انداز انقلابی ہے۔ ان کی غزلوں میں حقیقی تجربات و مشاہدات کا عکس ملتا ہے۔ حقیقت پسندی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مصیبت میں نہیں کوئی بھی اپنا ضرورت ہو تو رشتہ بولتا ہے
اداسی کا عجب عالم ہے انجم ہمارا گھر ہی اب صحرا ہوا ہے

ان کے کلام میں سیاسی اشعار بھی ملتے ہیں۔ مثلاً:

قیادت ہے ان ہی کی، جن سے اب تک
ہماری قوم کو دھوکا ہوا ہے

اور اب انقلابی شعر ملاحظہ ہو:

قوم پہ آئے جب بھی کوئی آفت انجم
سر ہتھیلی پہ لیے گھر سے نکل جائیں گے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انجم کے یہاں شاعری کی خصوصیات ملتی ہیں۔ جو انھیں اردو شاعری میں انفرادیت عطا کرسکتی ہے۔

ادبی نگینے

مصنف: ڈاکٹر محمد عبدالعزیز سہیل
صفحات: 143 قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی
مبصر: عبدالرّب شعبۂ اُردو مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد

اُردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اس سے جڑنے والوں نے نوجوانوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ 'ادبی نگینے' جواں سال محقق محمد عبدالعزیز کی پہلی کاوش ہے اور ایسا کہا جاتا ہے کی پہلی کاوش کبھی بھی لاثانی نہیں ہوتی لیکن فاضل مصنف نے اِس تصنیف میں اپنی بہترین ادبی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ اِس کتاب کو مصنف نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا حصہ مختلف ادبی شخصیات اور اُن کے فکر وفن پر مشتمل ہے۔ اس حصّہ میں گیارہ مضامین شامل کیے گئے ہیں جن میں قلی قطب شاہ، سرسیّد احمد خاں، الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، اور میر عثمان علی خاں جیسی مقتدر ہستیوں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ اس حصّہ میں آصف جاہی عہد اور حیدرآبادی تہذیب وثقافت کو اپنی تحریروں کا موضوع بنانے والی خاتون ڈاکٹر شیلا راج کی ادبی خدمات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ مصنف نے افسانہ نگار اقبال متین اور منفرد شاعر تنویر واحدی پر خامہ فرسائی کرکے دکن کی اِن دو نامور شخصیات کو اپنے مضامین کے ذریعے نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصّہ تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر مشتمل ہے جس میں چھ مضامین شامل ہیں۔ اس حصّہ میں اُردو میں صحافت کی ابتداء، جدوجہد آزادی میں اُردو زبان و ادب نیز انسان کی ذہنی نشوونما میں مادری زبان کا حصہ شامل ہے۔ اس حصہ میں مصنف نے تحقیق اور اُصول تحقیق سے بھی بحث کی ہے جس کے مطالعہ سے مصنف کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ حصّہ سوم تین معلوماتی مضامین پر مشتمل ہے جس کا پہلا مضمون 'تعلیم طلباء اور سماجی خدمت' دوسرا مضمون 'دورِ حاضر کے چیلنجز اور مسلم نوجوان' اور تیسرا مضمون 'منصوبہ بندی اور مقصد کا حصول' ہے۔ مضامین نہ صرف معلوماتی اور اصلاحی ہیں بلکہ وضاحتی انداز لیے ہوئے ہیں۔ اِن مضامین میں مصنف نے اسلام اور سیرت رسولؐ کو رول ماڈل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے شخصیت کے ارتقاء (Personality Development) میں مدد ملتی ہے۔ انگریزی زبان کے بالمقابل اُردو میں اس طرح کی کتابوں کی کمی دکھائی دیتی ہے۔

مختصراً مصنف نے منفرد اور متنوع الجہات موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہیں اپنی تصنیف میں یکجا کردیا ہے۔ مصنف کا اندازِ بیان عام فہم اور دلکش ہے جس میں ابہام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ موصوف جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں نہایت مربوط انداز میں اپنے خیالات کو پیش کردیتے ہیں۔ مصنف کی ابتدائی کاوش سے قطعِ نظر مختلف اور متضاد موضوعات کو یکجا کرنے کی وجہ سے کتاب کے مطالعہ سے قاری کی تشفی نہیں ہوتی۔ مصنف کو ادبی، تنقیدی یا معلوماتی مضامین میں سے کسی ایک نوع کے مضامین کو یکجا کرنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر شیلا راج پر تحریر کردہ مضامین کے علاوہ دیگر مضامین اور اُن کے عنوانات کافی فرسودہ ہیں اِن عنوانات پر اُردو پر کئی کتابیں تحریر کی جاچکی ہیں۔ اِن مضامین کی وجہ سے اُردو ادب کے سرمایہ میں کوئی گراں بہاں اضافہ نہیں ہوسکا شاید مصنف نے نصابی ضرورت کی تکمیل کے لیے اور طلباء کے معیار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عام فہم انداز میں اپنے مضامین تحریر کیے۔

کتاب کی طباعت دیدہ زیب ہے اور جلی حروف میں ٹائپ شدہ تحریر کے ساتھ ساتھ تزئین وآرائش کے اقدامات نے کتاب کے حسن کو نکھار دیا ہے۔ میں مصنف کو اس ابتدائی کاوش پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ مستقبل میں مصنف مزید بہترین تخلیقات سے ادب کے دامن کو وسیع کریں گے۔

تفہیم و تحسین

مصنف: ڈاکٹر نور فاطمہ
صفحات: 200، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر معید الرحمٰن، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

'تفہیم و تحسین' ایک ایسے قاری کے مطالعہ کا ثمرہ ہے جو ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ادب کا مطالعہ کرتا ہے۔ ادبی ذوق کی تسکین کے لیے کیا ہوا مطالعہ بصیرت افروز ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تنقیدی نظریات کے انبار نے اس عہد میں قاری کے ادبی ذوق کو فروغ دینے اور اس کی تربیت کرنے کے مواقع کو مسدود کردیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ یہ فارمولائی قرأت کی حد بندیوں سے ماورا ہے۔ یہ کتاب مصنف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کتاب کو مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصہ کے مضامین ان شعراء سے متعلق ہیں جن کے کلام نے مصنف کو اپنی فنی ہنرمندی اور موضوعاتی پیشکش کے سبب متاثر کیا۔ ان میں منیر نیازی، پروین شاکر، نظیر اکبرآبادی اور مجاز جیسے شعراء ہیں۔ شاعری سے دلچسپی مصنف کے ذوق سلیم کی دلیل ہے۔ یہ وہ شعراء ہیں جو اپنے شعری اسلوب کی دبازت اور انفرادیت کی بنا پر اردو شاعری کی تاریخ کے سنگ میل ہیں۔ منیر نیازی کے طرزِ اظہار کی تہہ داری نے مصنف کو متاثر کیا ہے۔ پیشِ نظر کتاب میں محض اپنے ذوق اور تاثرات کے بیان پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اپنی آرا کو دلائل سے مستحکم بھی کیا گیا ہے۔ پروین شاکر کی نظموں کو موضوع بناتے ہوئے اس کی انفرادیت کو نشان زد کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ پروین شاکر کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنی خلاقانہ ہنرمندی سے روزمرہ کی چیزوں میں ایک نئی معنویت پیدا کردی

ہے۔ گلاب، جنگل، خواب، بارش جیسے الفاظ کو وسیع وعریض تناظر میں برت کر علامتوں کی نئی فضا خلق کی گئی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی جزئیات نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان حرکی پیکروں پر تفصیلی گفتگو ملتی ہے جو جزئیات نگاری کے سبب وجود میں آئے ہیں۔ مصنف نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ کلامِ نظیر میں صرف بصری پیکر کی فراوانی نہیں ہے بلکہ لمسی وصوتی امیجز (Images) بھی بکثرت ہیں۔ مجاز کی رومانیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مجاز کی انفرادیت کو اس کے رومانوی انداز میں دیکھنے کی جستجو کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کلیشے کو توڑنے کی کوشش کی ہے کہ مجاز کے اشعار میں ترقی پسند فکر حاوی ہے۔ اس کی رومانیت پسندی کو حسن وعشق فطرت پرستی اور نظریہ کی آزادی سے عبارت بتایا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ اقبال کے فکر وفن کے مختلف پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس ضمن میں سات مضامین ہیں۔ اقبال کی فکر، فلسفہ اور فنی اسلوب عرصہ سے ناقدین کی دلچسپی کا محور رہا ہے۔ فکرِ اقبال کی مشرقی ومغربی فلسفیوں کے گہرے اثرات رہے ہیں۔ مصنف نے فکر اقبال کے اہم سرچشموں کے حوالے سے ان مشرقی ومغربی مفکرین کو موضوع بنایا ہے جن سے اقبال نے استفادہ کیا ہے۔ مشرقی فلسفیوں کے ذیل میں ابن عربی، رومی اور مغربی مفکرین کے ضمن میں نطشے، برگساں اور کارل مارکس کے نام بیان کیے گئے ہیں۔ مصنف کا یہ خیال ہے کہ مذکورہ فلسفیوں سے فکری استفادہ کرتے ہوئے اقبال نے ان کے تمام تصورات بعینہ قبول نہیں کر لیے بلکہ ان پر ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے اور ان کی نظریاتی خامیوں کی طرف توجہ بھی دلائی ہے۔ اقبال کے تصور زمان کی تشریح تفصیل سے کی گئی ہے۔ اقبال کے تصورِ وقت کو قرآن وحدیث سے مستفاد قرار دیا گیا ہے۔ مصنف کی رائے یہ ہے کہ اقبال نے مغربی تصورِ وقت کے مدمقابل اسلامی تصورِ وقت کو پیش کیا ہے۔

مغربی تہذیب پر اقبال کی تنقید کو متعدد مثالوں کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ مغرب کی حد درجہ مادیت پرستی، اور مذہب بیزاری نے اقبال کو تہذیبِ مغرب پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے لیے آمادہ کیا۔ کلام اقبال میں پیکر تراشی پر تفصیلی گفتگو ملتی ہے۔ پیکر تراشی کے تصور کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ اقبال کی ایک غزل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ شعری مفہوم کے بیان کے ساتھ ساتھ شعری محاسن کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ امیجری، قول محال، اور استعاراتی نظام کی نشاندہی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تجزیہ بہت محنت سے کیا گیا ہے۔ اس سے مصنف کی شعر فہمی کی صلاحیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ اقبال کی شعری زبان پر تعقید لفظی محاورہ، تلفظ اور تانیث پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں مصنف نے مختلف حوالوں سے ان کے دفاع کی کوشش کی ہے۔ ان لسانی غلطیوں کو عظیم فن کار کے اس اقدام سے تعبیر کیا ہے جو زبان کے مروج سانچے کو توڑتا مروڑتا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ فکشن تنقید پر مشتمل ہے۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں تشبیہ واستعارہ کی معنویت پر اچھوتا مضمون ہے۔ یہ مضمون منٹو کے افسانوں کا اسلوبیاتی مطالعہ ہے۔ مصنف کا یہ کہنا درست ہے کہ افسانوں میں استعارہ کے بجائے تشبیہ کا استعمال فنی اعتبار سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ منٹو کا افسانوی بیان تشبیہ کے استعمال سے کتنا پرقوت ہو جاتا ہے، اس مضمون کے مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سریندر پرکاش کے افسانہ بازگوئی کی تفہیم کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مضمون افسانہ نگاری کی فکر کے ساتھ ان کے فن کو سمجھنے سے عبارت ہے۔

تفہیم وتحسین نور فاطمہ کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ مصنفہ نے اس کتاب میں جس سلیقے سے مطالعات پیش کیے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ طرزِ اظہار استدلالی اور واضح ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ مصنفہ نے اصطلاحات میں گفتگو کرنے سے گریز کیا ہے۔ بیان میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے ان کے خوش آئند مستقبل کی امید کی جا سکتی ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

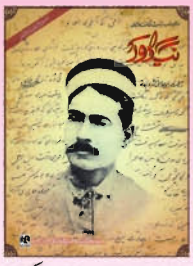

ماهنامه نیا دور

خصوصی شمارہ: منشی دوارکا پرشاد اُفق نمبر (جلد 68، شمارہ 6)

مدیر: ڈاکٹر وضاحت حُسین رضوی

قیمت: 50 (پچاس) روپے، صفحات:

ناشر: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

مبصّر: ڈاکٹر شریف احمد قریشی

ڈاکٹر وضاحت حُسین رضوی کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ نیا دَور، لکھنؤ کے خصوصی شماروں کی طرح منشی دوارکا پرشاد اُفق نمبر بھی دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ مطالعہ کی سہولت کے پیشِ نظر اس شمارہ کو پانچ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصّہ اداریہ اور اُتّر پردیش کی عظیم سیاسی ہستیوں اور اعلیٰ افسران کے پیغامات کے لیے وقف ہے۔ دوسرے حصّہ میں شخصیت و جہات کے عنوان سے بیس مضامین کی شمولیت ہے۔ ڈاکٹر کومل بھٹنا گر، ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں اور ڈاکٹر اسرار الحق قریشی نے اپنے مضامین کے ذریعہ اُفق لکھنوی کی شخصیت وسیرت اور سوانحی کوائف کے ساتھ اُن کی ادبی وعلمی خدمات کو منظرِ عام پر لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ گوپی ناتھ امن، حسن عبّاس فطرت، عابد سہیل، ڈاکٹر شارب ردولوی، احمد ابراہیم علوی، پروفیسر فضلِ امام اور رباب رشیدی وغیرہ نے اُفق کی شخصیت اور اُن کے فن کی مختلف جہات کو اپنے اپنے طور پر نمایاں کر کے اُنہیں اپنے عہد کا عظیم فنکار ثابت کیا ہے۔

تیسرے حصّہ کا عنوان 'آثار وافکار' ہے جو ستّرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس حصّہ میں متعدد قلم کاروں نے حضرتِ اُفق کے فکر وفن کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کی مختلف نگارشات کے ساتھ اُن کے فن پاروں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ پروفیسر مجاور حُسین رضوی نے اُفق کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر عبّاس رضا نیّر کے مطابق مسدّسِ اُفق نے جہدِ آزادی کے لیے قوم وملّت کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر عابد حُسین حیدری کا مضمون 'رامائن یک قافیہ: ایک جائزہ' نہایت اہم مضمون ہے۔ اُنہوں نے متعدد مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ 'رامائن یک قافیہ' نہ صرف اُردو ادب کا بہترین شاہکار ہے بلکہ ہندوستانی تہذیب کا آئینہ دار بھی ہے۔ ڈاکٹر ریحان حسن نے اُفق کی مثنوی 'سوانح عمری گرو گوبند سنگھ' کا خوب صورت پیرایہ میں تعارف کرایا ہے۔ محمد یاسر انصاری نے اُفق کی غزلوں میں احتجاجی رنگ، ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی نے اُفق کے یہاں حُسینیت اور ڈاکٹر شبیہ صغریٰ نے اُفق کی شاعری میں عزائیہ عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ نازیہ عرشی اور ضرغام الدّین نے اُفق کی مثنوی نگاری کی خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر محمد نسیم الدّین ندوی نے اُفق کی نثر نگاری اور محمد راشد خاں ندوی نے اُفق کی ڈرامہ نگاری کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کا مضمون 'نیرنگِ فرنگ پر ایک نظر' منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اُن کے نزدیک اُفق کے ناول 'نیرنگِ فرنگ' میں ناول جیسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ اُسے روزنامچہ یا تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

'صحافی وصحافت' کے عنوان سے چوتھے حصّہ میں اُفق کی صحافت سے متعلّق پانچ قلم کاروں نے اپنے مضامین سپردِ قلم کیے ہیں جن کے نام سلمان علی خاں، محمد وصی اللہ حُسینی، ڈاکٹر محمد اظہر انصاری، فرخ ہاشم اور غفران نسیم ہیں۔ اسی حصّہ میں انجم اصغر کے مضمون 'دوارکا پرشاد اُفق مشاہیرِ ادب کی نگاہ میں' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ پانچویں اور آخری حصّہ میں اُفق لکھنوی کی شخصیت وفن کے تعلّق سے فاطمہ وصیہ جائسی، سنجے مسرا شوق، خورشید ظفر بلوری، ڈاکٹر محمود کاکوروی اور اُفق کے منتخب منظوم کلام کو شامل کیا گیا ہے۔

اُفق لکھنوی نمبر میں اجے کمار سنگھ، خالدہ خاتون، محمد یاسر انصاری، نازیہ عرشی،

فرخ ہاشم وغیرہ ریسرچ اسکالرس کے مضامین بھی نہ صرف قابلِ قدر ہیں بلکہ محنت وعرق ریزی کے غماز بھی ہیں۔

رسالہ کے سرِ ورق کو اُفق کی تصویر اور اُن کے آخری الفاظ کی تحریر سے مزیّن کیا گیا ہے جو نہایت پُر وقار اور جاذبِ نظر ہے۔ سرِ ورق کی پُشت پر اُفق اور اُن کی زوجہ مہتاب کنور کی تصاویر کے علاوہ اُن کے اہل وعیال کی تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں۔ رسالہ کے آخری صفحہ کی پُشت اور اندرونی صفحات پر کئی جگہ اُفق کی تصانیف کے عکس کی اشاعت سے اس شمارہ کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ صفحہ 57 پر لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو اور صفحہ 77 پر الٰہ آباد کے حمیدیہ ڈگری کالج میں منعقدہ اُفق لکھنوی سے متعلق سیمیناروں کے مختلف مناظر کی رنگین تصاویر سے رسالہ کی زینت ودلکشی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خاص نمبر اُفق لکھنوی کی نگارشات اور فن پاروں کی تفہیم میں ایک سنگ میل کی حیثیت کا حامل ہے۔

پورے رسالہ کے مطالعہ کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وضاحت حُسین رضوی اور اُن کے معاونین نے کتنی محنت وجستجو کی ہوگی۔ اُنھوں نے اُردو ادب کے ایک اہم فنکار اُفق لکھنوی کی شخصیت اور فکر وفن سے متعلق مفید، کارآمد اور معلوماتی مضامین یکجا کر کے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اتنے خوب صورت اور اہم شمارہ کو منظرِ عام پر لانے کے لیے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اُتر پردیش، ڈائریکٹر آشوتوش رنجن اور ایڈیٹوریل بورڈ کے اراکین مبارک باد کے مستحق ہیں۔

فکر انقلاب (اشاعت خصوصی بیادِ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن)

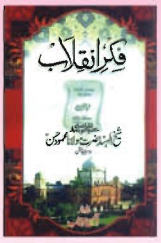

ایڈیٹر: احسن ماہتاب

جلد: 2، شمارہ: 44 (مارچ یکم تا 15 مارچ 2015)

صفحات: 780، قیمت: 400 روپے

ناشر: 25/Q الصمد، روڈ بلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: سید لطیف حسین ادیب، 73 پھول والان بریلی 243003

مشمولات کے زیرِ عنوان سب سے پہلے اداریہ 'حسن تفکر' ہے جس میں ایڈیٹر نے اس خصوصی شمارے کے مقصدِ اشاعت کے متعلق تحریر کیا کہ ''وہ افراد جو براہ راست دینی اداروں یا مدارس سے وابستہ نہیں ہیں مگر تحریک آزادی سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں اُن تک حضرت شیخ الہند کا پیغام پہنچایا جائے اور برادران وطن کو بھی احساس دلایا جائے کہ ملک کی آزادی کے لیے جان نثار کرنے والوں کی فہرست میں ان علما کا بھی نام ہے جنھیں فرقہ پرست تاریخ فراموش کر چکی ہے۔ موصوف نے مزید تحریر کیا ''حضرت شیخ الہند پر یہ کام صرف اردو یا عربی میں نہیں بلکہ دنیا کی تمام زبانوں میں ہونا چاہیے۔'' (ص 10) اداریہ کے بعد مشاہیر عالم کے پیغامات شائع ہوئے ہیں۔ (ص 11 تا 44) اس کے بعد بابِ شیخ الہند کا آغاز ہوتا ہے جو 72 مضامین کو محیط ہے۔ ان مضامین کی فراہمی میں مدیر کی ریاضت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی تاہم ان مضامین کی مختلف عنوانات کے ضمن میں تقسیم اور ترتیب لابدی تھی جس سے تکرار معلومات اور ضخامت سے چھٹکارا مل جاتا۔ بعض مقالات میں ماخذ ومراجع کے اہتمام کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمود الحسن کی پیدائش بریلی میں 1851 کو ہوئی تھی۔ آپ کے والد ڈپٹی انسپکٹر مولانا ذوالفقار علی (م 1904) کا تعلق دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان سے تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ابتدائی تعلیم اُس عہد کے مقتدر علما سے حاصل کی جن میں ممتاز ترین مولانا قاسم نانوتوی (م 1880) تھے۔ اس وقت دارالعلوم دیوبند جس کی تاسیس 30 مئی 1866 کو ہوئی تھی دینی سیاسی اور جہادی تربیت کا مرکز تھا۔ حضرت شیخ الہند مدرسہ دیوبند سے 1873 میں فارغ التحصیل ہوئے اور ترقی کر کے 1887 میں مدرس اوّل مقرر ہوئے۔ شیخ الحدیث کی مسند بھی سنبھالی۔ تقریباً 33 سال یہ خدمت انجام دی۔ آپ کو حضرت قاسم نانوتوی نے بیعت وخلافت سے نوازا تھا۔ بعد کو فریضہ حج کی ادائیگی کے موقعے پر حضرت امداد اللہ مہاجر مکی (م 18 اکتوبر 1899) کے دستِ حق پر بھی بیعت کی۔

حضرت شیخ الہند نے درس وتدریس اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے علاوہ جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ان میں ترجمہ قرآن کریم، ادلّہ کاملہ، ایضاح الادلہ، احسن القریٰ، جہد المقل، الابواب والتراجم، کلیات شیخ الہند، تصحیح ابوداؤد، حاشیہ مختصر المعانی شامل ہیں۔

حضرت شیخ الہند اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوصف عربی فارسی اور اردو میں شعر گوئی کی مہارت رکھتے تھے۔ ان کا کلیات تو پیش نظر نہیں ہے۔ ان کے اردو کلام کے اقتباسات سے جو قصائد ومراثی وغیرہ پر مشتمل ہے، ان کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت شیخ الہند کی سیاسی زندگی کا آغاز حضرت قاسم نانوتوی کے زیرِ سایہ ہوا۔ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکاری حکمت عملی کے مطابق عیسائیت کی تبلیغ اور مسلمانوں کو تعلیمی وسیاسی پستی کی طرف ڈھکیلا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت پہلے سے ہی کمزور تھی۔ ان کے اوقاف اور مدارس تباہ ہو چکے تھے۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مولانا قاسم نانوتوی نے جگہ جگہ مدارس قائم کیے۔ 30 مئی 1866 کو دیوبند کا مدرسہ قائم ہوا۔ اسی سال چھ ماہ بعد مظاہر العلوم سہارن پور اور 1878 میں مدرسہ شاہی مراد آباد کی تاسیس ہوئی۔ ان مدرسوں کے فارغ علما نے عیسائیوں سے مناظرے کیے۔ ان کی اسلام دشمن کتابوں کا رد کیا اور جگہ جگہ دینی مدارس کھول کر تحریک احیائے دین کو جاری رکھا۔ اس وقت اندرون ملک ایک ایسی تنظیم کی ضرورت تھی جو بیرون ملک انقلاب ہونے کی صورت میں اس کو کامیاب کر سکے۔ یہ تنظیم ثمر التربیہ 1889 تھی جو بعد کو جمعیۃ الانصار (1905) کے نام سے موسوم ہوئی۔ 1913 میں تحریک ریشمی رومال کا آغاز ہوا۔

پروگرام کے مطابق 19 فروری 1917 کو ہندوستان پر بیرونی حملہ اور اندرونی بغاوت ساتھ ساتھ شروع کی جائے۔ اس سلسلے میں سلطان ترکی غازی انور پاشا سے جو معاہدہ ہوا، اس کا مضمون عربی زبان میں ایک ریشمی رومال پر کڑھوالیا اور امیر افغانستان حبیب اللہ خاں کے دستخط کرائے۔ لیکن سازش کا علم انگریزوں کو ہو گیا اور تحریک ریشمی رومال ناکام ہو گئی (ص 634) اس تحریک کی تاسیس اور کامیابی کے لیے جن افراد نے نمایاں کردار ادا کیا، ان میں بالخصوص برکت اللہ بھوپالی عبیداللہ سندھی اور راجہ مہندر پرتاپ کے اسما ناقابل فراموش ہیں۔ 1916 میں حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقا مولانا حسین احمد مدنی، مولانا وحید احمد، حکیم نصرت حسین اور مولانا عزیر گل کو گرفتار کر لیا گیا۔ حضرت شیخ الہند 10 فروری 1917 کو جزیرۂ مالٹا میں قید ہوئے۔ 1920 میں رہائی کا حکم ملا۔ تین سال سات ماہ کے بعد بمبئی پہنچے۔ زمانۂ اسارت میں صحت کافی خراب ہو چکی تھی۔ دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے زیرِ علاج تھے کہ پیغام اجل آ گیا۔ 30 نومبر 1920 کو فوت ہو گئے (ص 700)۔ دارالعلوم دیوبند کے قاسمی قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔

اداریہ میں اس عزم کا اظہار کیا گیا تھا کہ حضرت شیخ الہند پر کام صرف اردو یا عربی میں نہیں بلکہ دنیا کی تمام زبانوں میں ہونا چاہیے۔ موجودہ حالات کے تناظر میں نامناسب نہیں ہوگا کہ حضرت شیخ الہند کی حیات اور وطن عزیز کی آزادی کے لیے جاں نثاری پر ایک مختصر کتاب ہندوستان کی صوبجاتی زبانوں میں تحریر کر کے شائع کی جائے اور اس کو ان زبانوں کے مراکز پر برائے تقسیم بھیجا جائے۔

ادارہ فکر انقلاب لائق ستائش ہے کہ اس نے حضرت شیخ الہند پر یہ خصوصی اشاعت شائع کر کے تاریخی نوعیت کا کام کیا ہے۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

اردو اور آزادی کا بہت گہرا رشتہ ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں جشنِ آزادی کا اہتمام

یومِ آزادی کے موقعے پر قومی اردو کونسل میں پرچم کشائی کا منظر

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند کے صدر دفتر میں 69 ویں یومِ آزادی کے موقعے پر پرچم کشائی کی تقریب کا انعقاد نہایت تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا۔ جس میں کونسل کے تمام ذمے داران اور عملے نے شرکت کی۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پرچم کشائی کی اور کونسل کے عملے نے ہندوستان کا قومی ترانہ 'جن گن من' بلند آواز میں پیش کیا۔ سبھی اسٹاف نے ترنگے کو سلامی بھی دی۔ اس موقعے پر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ہم ان شہیدان وطن کی قربانیوں کو فراموش نہیں کر سکتے جن کی وجہ سے ہمیں آزادی کی صبح نصیب ہوئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو اور آزادی کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ اردو زبان اور صحافت کی وجہ سے ہی ہندوستان کو آزادی ملی۔ اسی زبان نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا جس کی گونج پورے ملک میں پھیلی اور اسی زبان کے صحافیوں اور ادیبوں نے استعماری سامراجی طاقتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو زبان نے ہمیشہ قومی یکجہتی، اتحاد اور اخوت کا درس دیا ہے۔ یہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے اور اسی زبان میں سب سے زیادہ حب الوطنی کے نغمے اور گیت لکھے گئے ہیں اور جشن آزادی اسی حب الوطنی کا مظہر ہے۔

اس موقعے پر قومی کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر انتظامیہ جناب کمل سنگھ نے بھی یوم آزادی پر اپنی نیک خواہشات پیش کیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اگست 2015

کتابیں صحت مند معاشرے کی تشکیل میں مدد کرتی ہیں: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں تھوک خریداری اسکیم کے تحت میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند فروغ اردو سے متعلق مختلف اسکیمیں اور پروگرام چلاتی ہے۔ ان اسکیموں میں ایک اسکیم معیاری کتابوں کی تھوک خریداری کی بھی ہے جس کے تحت مختلف قلمکاروں کی کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اس اسکیم کا مقصد اردو، عربی و فارسی کے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے قومی کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں ایک اہم میٹنگ معروف شاعر اور قومی اردو کونسل کے سابق وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں اردو، عربی و فارسی کی تقریباً 500 کتابیں خریدنے کا فیصلہ کیا گیا، جن میں تخلیقی ادب، شاعری، سوانح، ادب اطفال، لغات، سائنسی وسماجی علوم، جنرل نالج، ادب، تنقید، مذہبی کتابیں اور صحافت کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہونے والے ادبی رسائل و جرائد کی تھوک خریداری بھی شامل ہے۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کونسل کی اس اسکیم کا مقصد اردو، عربی وفارسی کے قلمکاروں کو مالی تعاون دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کتابوں کی ہر عہد میں اپنی ایک اہمیت وافادیت رہی ہے۔ اس کی مدد سے آپ بہتر اور صحت مند سماج کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ انھوں نے تمام ممبران سے کتابوں کی خریداری میں پوری شفافیت اور ایمانداری برتنے کی اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ تبھی ممکن ہے جب ہم اپنی آنکھوں سے عصبیت کے چشمے اتار دیں۔ قومی اردو کونسل ملک کا سب سے بڑا اردو ادارہ ہے، جو نفع ونقصان سے اوپر اٹھ کر کتابوں کی تھوک خریداری کرتا ہے اور ملک کے دور دراز کتب خانوں میں بطور ہدیہ کتابیں ارسال کرتا ہے تاکہ اردو کے قارئین عصر حاضر میں شائع ہونے والی ان نادر ونایاب کتابوں سے استفادہ کر سکیں۔

اس میٹنگ میں شامل تمام ممبران اور صدارت کے فرائض انجام دے رہے جناب چندر بھان خیال کا کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اس موقع پر انھوں نے اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے موجودہ حکومت ہند کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا، جناب چندر بھان خیال نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی ضروری ہے تاکہ وہ پوری دل جمعی کے ساتھ اردو کی معیاری کتابیں اسی طرح تخلیق کر سکیں۔

میٹنگ کا ایک منظر

میٹنگ میں پروفیسر محمد نعمان خان، پروفیسر علیم اشرف خان، پروفیسر شفیق اشرفی، جناب چودھری ابن النصیر، پروفیسر انور الدین، ڈاکٹر محمود فیاض، محترمہ صادقہ نواب سحر، محترمہ ثروت خان، حاجی محمد اقبال خان کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر فیروز عالم، ڈاکٹر شاہد اختر، محترمہ ساجدہ بیگم وفرح دیبا، اقبال حسین نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 اگست 2015

اے پی جے عبدالکلام نے ہندوستان کا مقام پوری دنیا میں بلند کیا: پدم شری مظفر حسین

آنجہانی عبدالکلام عبقری شخصیت کے مالک تھے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں سابق صدر جمہوریہ کو خراج عقیدت

نئی دہلی: 28 جولائی۔قومی اردو کونسل میں ہندوستان کے 11 ویں صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے انتقال پر تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔اس نشست میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سابق صدر جمہوریہ ہند کے انتقال پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی موت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔انھوں نے اپنی خاکساری، خلوص اور دلنوازی سے ہندوستان کے بڑے بوڑھوں اور بچوں کو اپنا اسیر بنا رکھا تھا۔ ایسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔وہ ایسے رہنما ہیں جو ہمیشہ ہمارے درمیان رہیں گے۔ ان کی باغ و بہار شخصیت کو بھلانا ناممکن ہوگا۔انھوں نے عبدالکلام کے اس جملے ''خواب وہ نہیں ہوتے جو ہم سوتے ہوئے دیکھتے ہیں بلکہ خواب وہ ہوتے ہیں جو ہمیں سونے نہیں دیتے'' کی وضاحت بھی کی اور کہا کہ ہمیں خواب دیکھنا چاہیے اور اس کی تکمیل کی صورت بھی پیدا کرنی چاہیے۔

قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے سابق صدر جمہوریہ ہند اے پی جے عبدالکلام کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ان کے انتقال کو ناقابل تلافی نقصان بتایا۔ انھوں نے کلام صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ساتھ گزرے کئی واقعات سنائے۔گلوگیر آواز میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان کو دو کلام ملے ہیں ایک ابوالکلام اور دوسرا عبدالکلام اور دونوں نے ہمارے وطن کے لیے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ یہ دونوں ہندوستان کے ایسے ہیرے ہیں جن سے ہندوستان کو پوری دنیا میں وقار حاصل ہوا ہے۔دونوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مسلمانوں کا وقار بلند کیا ہے۔اے پی جے عبدالکلام کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس عظیم سائنس داں نے ہندوستان کو ایٹمی پاور بنایا اور دنیا کے نقشے پر ہندوستان کا نام سنہرے الفاظ میں درج کروایا۔نشست میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

نشست میں پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر حبیب نثار، پیغام آفاقی، پروفیسر محمد نعمان خاں، پروفیسر صاحب علی، پروفیسر شبنم حمید، پروفیسر محمد نعمان خاں (عربی)، پروفیسر اختر مہدی، فیروز بخت احمد، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر علاء الدین شاہ، ڈاکٹر عبدالرشید، ڈاکٹر حسنین اختر کے علاوہ کونسل کے تمام کارکنان بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 جولائی 2015

نئی نسل کو تحقیق وتنقید کی طرف راغب کرنے کی ضرورت ہے: ارتضی کریم

پٹنہ: فکشن کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں داستان، ناول، افسانہ، ڈراما اور نظم سبھی شامل ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 12 اگست 2015 کو پٹنہ یونیورسٹی میں طلبا واساتذہ سے خطاب کرتے

پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں توسیعی خطبہ کے موقع پر اسٹیج پر شموئل احمد، قاسم خورشید، مشتاق احمد نوری، پروفیسر ارتضیٰ کریم، خالد مرزا اور ڈاکٹر جاوید حیات

ہوئے یہ باتیں کہیں۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں 'پروفیسر کلیم الدین احمد توسیعی خطبہ' دے رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں تنقید کی ابتدا 1862 میں ہی ہوگئی تھی اور اس کے بانی کریم الدین ہیں، جبکہ مغرب میں 1884 میں تنقید کی ابتدا ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ دبستان عظیم آباد کو اس بات پر فخر ہے کہ کلیم الدین احمد نے داستان پر سب سے پہلے تنقید کی۔ انھوں نے طلبا و طالبات کو تنقیدی و تحقیقی کتابیں ورسائل کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری نئی نسل تحقیق وتنقید کے میدان سے دور ہوتی جارہی ہے۔ اس لیے نئی نسل کو اس طرف راغب کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ زندہ زبانوں میں تحقیق وتنقید کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ شموئل احمد نے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہمارے یہاں جو تنقید ہوتی ہے وہ تاثراتی تنقید ہوتی ہے تخلیقی تنقید نہیں، اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اس موقعے پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرنے والے مشتاق احمد نوری نے بھی بہار اردو اکادمی کی طرف سے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا۔ سابق صدر شعبہ اردو ڈاکٹر اسرائیل رضا نے کہا کہ ہمارے طلبا فکشن کی تنقید کی طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں، اس لیے طلبا کو چاہیے کہ فکشن کی تنقید کی طرف بھی متوجہ ہوں۔

قاسم خورشید نے کہا کہ تنقید میں اگر تحقیق کا عنصر شامل ہو تو اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ افتتاحی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر خالد مرزا ڈائرکٹر ہائر ایجوکیشن نے شعبہ اردو کے کانفرنس ہال میں اے سی اور بینچ ڈیسک لگانے کا وعدہ کیا اور ڈاکٹر جاوید حیات سے اس کے لیے پروپوزل مانگا۔ اس سے قبل مہمانوں کا خیر مقدم صدر شعبہ اردو ڈاکٹر جاوید حیات نے کیا، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 13 اگست 2015

قومی اردو کونسل کا پہلا مکمل ریجنل آفس عظیم آباد میں قائم ہوگا

پٹنہ: اردو اور بہار دونوں ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ اردو کو گھر گھر تک پہنچانے کے لیے عوام میں جوش اور جذبے کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل اردو خواندگی کے مراکز قائم کرنے کے لیے ملک کے گوشے گوشے میں اردو سکھانے کے مراکز قائم کرے گی اور اس کے لیے کسی طرح کے فنڈ کی کمی نہیں ہونے دی جائے گی۔ یہ باتیں 12 اگست کو اردو بھون میں ایک استقبالیہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اردو کا خادم اور سپاہی ہوں۔ جانبازی کے ساتھ اردو زبان کی بقا، ترقی اور ترویج واشاعت کے کاموں کو قومی اردو کونسل کے پلیٹ فارم سے انجام دینے میں دن رات سرگرم رہوں گا۔ وہ انجمن ترقی اردو بہار کی جانب سے منعقدہ استقبالیہ جلسے سے خطاب کررہے تھے۔ اس سے قبل روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر احمد جاوید نے قومی اردو کونسل اور بہار اردو اکادمی کے سربراہان سے یہ توقع کی کہ اردو کی شرح خواندگی کو بنیاد بنا کر بہار کے گاؤں گاؤں میں ایسے مراکز قائم کیے جائیں جہاں اردو کی تعلیم کا انتظام ہو اور ایسے کتب خانے قائم کیے جائیں جہاں اردو کے رسائل بالخصوص بچوں کے رسائل اور اخبارات منگائے جاتے ہوں جن سے لوگ استفادہ کرسکیں اور اردو کا ایک ماحول بن سکے۔ جبکہ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم اردو فکشن کے نمائندہ نقاد

ہیں اور ان کی تنظیمی صلاحیتیں بے پایاں ہیں۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے قاسم خورشید نے اس توقع کا اظہار کیا کہ ارتضیٰ کریم اور مشتاق احمد نوری تاریخی کردار ادا کریں گے اور اشرف استھانوی نے حکومت بہار کے ذمے داروں کو بہار کی اردو آبادی کے جذبات اور احساسات سے جڑنے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر ریحان غنی نے ان اداروں کے سربراہوں کو اردو عوام کے لیے نشانات طے کرکے کام کرنے کی گزارش کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں اردو اکادمی کے نومنتخب سکریٹری مشتاق احمد نوری نے اردو اکادمی کو سرگرم اور فعال بنانے سے متعلق اپنا لائحہ عمل بتایا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اکادمی کو بہار کے دور دراز علاقوں سے جوڑنا ہمارا مقصد ہوگا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کو انجمن ترقی اردو بہار کی جانب سے اردو تنقید وتحقیق کے میدان میں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انجمن ترقی اردو ایوارڈ 2015 پیش کیا گیا۔ تقریب میں ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر توقیر خاں، صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی ڈاکٹر جاوید حیات، ڈاکٹر محمد ذاکر حسین، ڈاکٹر محمد سعید عالم، ارچنا راج ورما، ڈاکٹر علی امام، شمیم قاسمی، ڈاکٹر عابدہ پروین، شکیل شاغل، محمد نصیر الدین قاسمی، ڈاکٹر ترنم جہاں، ڈاکٹر الفیہ نوری، ڈاکٹر یاسمین بانو، ڈاکٹر فرحت یاسمین، ڈاکٹر انور امام، اقبال صبا اور عظیم آباد کے مختلف شعبۂ حیات کے دیگر نمائندہ افراد شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 13 اگست 2015

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کو استقبالیہ

دھلی یونیورسٹی میں استقبالیہ

نئی دھلی: آرٹ فیکلٹی کے مختلف شعبوں کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم اور سندھی کونسل کے ڈائرکٹر روی چندانی کے

اعزاز میں استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت شعبہ لسانیات کے صدر پروفیسر آرسی شرما نے کی، نظامت ڈاکٹر سید حسنین اختر نے کی اور دونوں ڈائرکٹر صاحبان کو مبارک باد دی۔ مہمان خصوصی صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کہا کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم عرصہ دراز سے فعال ہیں ان کی خصوصیت بے باکی ہے وہ جو کہتے ہیں، کرتے ہیں۔ اس موقعے پر شعبہ سنسکرت کے صدر پروفیسر رمیش بھردواج نے کہا کہ ارتضیٰ کریم کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انھوں نے ادب میں لازوال کارنامے انجام دیے جس کے اعتراف میں انھیں بے شمار اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ شعبہ عربی کے ڈاکٹر نعیم الحسن نے شعبہ کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر کریم اور ڈاکٹر چندانی کو مبارک باد دیتا ہوں، جو زبانوں کے فروغ میں کوشاں رہتے ہیں۔ شعبہ ہندی کے صدر ہری موہن نے کہا کہ ہم لوگ مختلف شعبوں کے پھول ہیں اور جب ایک ہوجاتے ہیں تو گلدستے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ ہندی کے ساتھ اردو اور اردو کے ساتھ ہندی لازمی قرار دی جانی چاہیے کیونکہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ یہ خوشی کا موقع ہے کہ ان دونوں حضرات کو ترقی ملی ہے۔ یہ دونوں ہی دہلی یونیورسٹی کے استاد کے ساتھ ساتھ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے طالب علم بھی رہ چکے ہیں۔ سندھی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر روی چندانی نے کہا کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم میرے استاد بھی ہیں کیونکہ میں نے ان سے اردو پڑھی تھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ہمیں مل کر تمام زبانوں کو فروغ دینا ہوگا۔ تنہا کسی بھی زبان کو فروغ نہیں دیا جاسکتا۔ میں آپ لوگوں کی بے لوث محبتوں کا شکر گزار ہوں۔ انھوں نے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی چیئر کے قیام کا اعلان بھی کیا۔ ایم آئی ایل کے صدر نوین پٹنا یک نے بھی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے دونوں ڈائرکٹرز کو مبارک باد دی۔ صدارتی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر آرسی شرما نے کہا کہ اس قسم کے مشترکہ پروگرام ہمیں تقویت دیتے ہیں۔ میں دونوں ڈائرکٹر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ پروگرام کے اختتام پر صدر شعبہ فارسی پروفیسر چندر شیکھر نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر شعبۂ عربی کے اساتذہ ڈاکٹر مجیب اختر ندوی، ڈاکٹر محمد اکرم فلاحی، ڈاکٹر اصغر محمود ندوی، پروفیسر چندر شیکھر، ڈاکٹر ظفیر الدین قاسمی، ڈاکٹر مہتاب جہاں، پروفیسر علیم اشرف، شعبہ فارسی کے استاد ڈاکٹر علی اکبر شاہ، ڈاکٹر مشتاق قادری، ڈاکٹر سید تنویر حسین، سید شعیب رضا فاطمی، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن، ڈاکٹر مظفر الحسن وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اگست 2015

آئی ایچ ایف کے زیر اہتمام استقبالیہ تقریب

نئی دھلی: اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام نہرو گیسٹ ہاؤس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کمیٹی روم میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نو منتخب ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے اعزاز میں منعقدہ استقبالیہ میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اردو کی ترقی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک ہم اردو زبان پر توجہ نہیں دیں گے۔ زبان جب بولی جائے گی تبھی ادب پیدا ہوگا۔ انھوں نے کہا ہم مشاعرے اور سیمینار سے ہٹ کر کچھ ایسا کام کریں گے جس سے واقعی طور سے درس و تدریس کا فائدہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم جلد ہی نئے پروجیکٹ لا رہے ہیں جس سے علمی اور ادبی دونوں محاذ پر بڑے بدلاؤ آئیں گے۔ انھوں نے یہ بھی خوش خبری دی کہ یوپی حکومت سے مل کر وہاں کے شعرا کی یادگار کو محفوظ کریں گے۔ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم خود حساس ہیں اور اردو کے حوالے سے بہت سرگرم رہتے ہیں اس لیے ان کے آنے سے اردو زبان و ادب کو عملی طور سے فائدہ ہوگا۔ قبل ازیں پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے محمد آدم نے فاؤنڈیشن کی کارکردگی کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر نازش احتشام اعظمی نے تمام لوگوں کا استقبال کیا۔ صحافی میم ضاد فضلی نے کہا کہ موجودہ دور میں اردو اخبارات کے صحافیوں کی صورت حال بہت افسوس ناک ہے، مجھے امید ہے کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم اس سلسلے میں غور کریں گے تاکہ اردو صحافت کو حقیقی طور سے فروغ دیا جاسکے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم طلبہ کے لیے بے حد مددگار ہیں۔

صحافی سہیل انجم نے پروفیسر ارتضیٰ کریم پر بہت دلچسپ قلمی خاکہ پیش کیا جس میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کی علمی، شخصی اور ادبی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر تابش مہدی، رحمٰن مصور، پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا جبکہ احمد علی برقی اعظمی نے قومی کونسل

کے حوالے سے اپنی نظم پیش کی۔ اس موقعے پر قومی کونسل کے وائس چیئر مین پدم شری مظفر حسین نے کہا کہ ہم سب کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اردو ادب کالجوں، یونیورسٹیوں، انجمنوں اور دفتروں سے باہر نکلے کیونکہ ہماری کامیابی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک ہم اردو کو عوامی زبان نہ بنادیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 4 اگست 2015

رحمانی فاؤنڈیشن میں اسلامی کوئز کا انعقاد

مونگیر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مونگیر میں منعقد 'اسلامی کوئز' میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقعے پر رحمانی فاؤنڈیشن میں تقسیم انعامات کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔

تقسیم انعامات کے جلسے کی سرپرستی رحمانی فاؤنڈیشن کے چیئر مین اور خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشیں مفکر اسلام حضرت مولانا محمد ولی رحمانی نے فرمائی۔ اس تقریب تقسیم انعامات میں کامیاب طلبہ کو انعام سے نوازا گیا۔ اول، دوم اور سوم پوزیشن لانے والے طلبہ کے علاوہ دیگر دس طلبہ کو تشجیعی انعامات سے سرفراز کیا گیا۔ واضح ہو کہ یہ کوئز اپنے طرز کا منفرد مقابلہ ہے جس میں خصوصی طور پر اسکول کے طلبہ نے حصہ لیا، اس کا مقصد اسکول کے طلبہ کے درمیان اسلامی مزاج کا فروغ، دینی معلومات کا ذوق وشوق پیدا کرنا اور دینی مزاج سے ہم آہنگ بنانا ہے جو اپنے طرز کی نئی کوشش ہے۔ اس میں اسلام کی بنیادی معلومات اور پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ سے متعلق ایک سو آبجیکٹو طرز کے سوالات کیے گئے۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس کا خواہاں رہا ہے کہ اس کی اولاد اگرچہ انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں پڑھے لیکن اسلامی معلومات سے سرشار بھی ہوتی رہے۔ رحمانی فاؤنڈیشن کی اس کوشش کو تمام لوگوں نے سراہا اور اس طرز کے پروگرام کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 26 جولائی 2015

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

بہار میں اردو: ماضی، حال اور مستقبل

پٹنہ: اردو کی زبوں حالی کا رونا رونے سے اردو کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے اجتماعی تحریک کی ضرورت ہے۔ اس امر کا اظہار معروف صحافی ریاض عظیم آبادی نے کیا۔ الہند ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور بہار اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقدہ سیمینار میں وہ 'بہار میں اردو: ماضی، حال اور مستقبل' کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔

انھوں نے کہا کہ یہ سچ ہے کہ اردو کسی خاص طبقے یا فرقے کی زبان نہیں ہے، مگر اب ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ اردو مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے ذمے دار بھی ہم خود ہیں۔ ریاض عظیم آبادی نے کہا کہ تحریک سے ہی اردو زندہ رہے گی اور اس کا فروغ ہوگا۔

سابق رکن اسمبلی اختر الایمان نے بھی اردو کے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے کئی اہم باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ زمانے کے تغیرات اور تبدیلی کے تحت اردو زبان کے بھی تقاضے ہیں۔ نئی نسلوں کا رشتہ اردو سے منقطع ہو رہا ہے مگر ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اردو میں ہماری تہذیب وثقافت مضمر ہے۔ یہ سیاست کے تقاضے کو بھی پورا کرتی ہے کیونکہ ذہنی تربیت سے ہی سیاست کا معیار بھی بلند ہوتا ہے۔ اختر الایمان نے اردو کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے گاؤں کی سطح پر مکتب کے قیام کے لیے تحریک چلانے کی تجویز رکھی۔ فخر الدین عارفی نے سہیل عظیم آبادی، عبدالمغنی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجز اور اردو کے دیگر دانشوروں کے حوالے سے بہار میں اردو کی زریں تاریخ پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر احسان اشرف نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو کی زبوں حالی پر آنسو بہانے سے اردو کی ترقی نہیں ہوگی۔ اس کے لیے ہمیں باضابطہ لائحہ عمل تیار کر کے جدوجہد کرنی ہوگی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر آصف سلیم، سید احمد قادری نے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت اسلم جاوداں نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 3 اگست 2015

محمد علی موج رامپوری — ایک نئی روشنی

رامپور: جن سیوا شکشا سنستھان کے زیر اہتمام ایک روزہ سیمینار بعنوان 'محمد علی موج رامپوری- ایک نئی روشنی' شاہ آباد گیٹ واقع آر این پبلک اسکول میں منعقد کیا گیا۔ قومی اردو کونسل نئی دہلی کے تعاون سے منعقد سیمینار میں مولانا زاہد ضا رضوی سابق چیئر مین اترا کھنڈ حج کمیٹی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت مجسم نور نے کی جبکہ نظامت مولانا ناصر نے کی۔ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی مولانا زاہد رضا رضوی نے کہا کہ محمد علی موج کی پیدائش 1951 میں رامپور کے ایک معروف سید گھرانے میں محلہ گھیر مزار شاہ بغدادی میں سید محبوب علی میاں کے مکان میں ہوئی۔ بچپن سے ہی اردو سے شغف کے سبب موج نے اپنی زندگی کو شہرت اور بلندی تک پہنچانے کے لیے جی توڑ کوشش کی رضا ڈگری کالج سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آکاش وانی رامپور میں بحیثیت اناؤنسر ملازمت حاصل کی۔ مجسم نور نے اپنے صدارتی خطبے میں بتایا کہ محمد علی موج نے اردو شاعری کے تعلق سے رامپور کی ادبی وراثت کو قائم رکھتے ہوئے عالمی پیمانے پر اپنے وطن کو نمایاں پہچان دلائی۔ سیمینار میں بڑی تعداد میں عمائدین شہر موجود تھے۔ اس موقعے پر مقالہ نگاروں کو تحائف سے نوازا گیا۔ روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 24 جولائی 2015

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

اردو کے فروغ کے لیے مرکز اور اتر پردیش کی حکومتوں نے کئی اردو یونیورسٹیاں قائم کیں: اسمرتی ایرانی

نئی دھلی: مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اسمرتی ایرانی نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کے

حوالے سے راجیہ سبھا کو بتایا کہ مرکزی اور اتر پردیش کی حکومتوں نے ملک میں اردو کو فروغ دینے کے لیے بالترتیب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدرآباد)، تلنگانہ اور کانشی رام اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی (لکھنؤ) قائم کی ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ یو جی سی کی طرف سے گزشتہ تین برسوں اور رواں برس کے دوران منصوبہ بندی اور غیر منصوبہ بندی کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو جاری کردہ گرانٹ ضابطے کے مطابق ہے۔ محترمہ اسمرتی ایرانی نے کہا کہ اس کے علاوہ یو جی سی نے سال 13-2012 کے دوران کانشی رام اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی (لکھنؤ) کو دو کروڑ 50 لاکھ روپے کا یکمشت کیچ اَپ گرانٹ فراہم کیا ہے۔ البتہ رواں برس یو جی سی سے کوئی گرانٹ جاری نہیں کی گئی ہے۔ اردو کے فروغ کے سلسلے میں محترمہ رما دیوی کے سوال کے جواب میں مرکزی وزیر برائے فروغ وسائل اسمرتی ایرانی نے راجیہ سبھا کو مزید بتایا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے اہم نصابوں کی تفصیلات ویب سائٹ www.manuu.ac.in سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ریگولر طلبا کی تعداد کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ سال 13-2012 اور 14-2013 کے دوران یونیورسٹی سے فارغ ہونے والے طلبا کی تعداد بالترتیب 1301 اور 1164 ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 6 اگست 2015

امامیہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے زیر اہتمام دو روزہ کانفرنس

نئی دھلی: امامیہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے زیر اہتمام دو روزہ 'کانفرنس اور ایکسپو' کا انعقاد کیا گیا جس کا مقصد مسلمانوں کے درمیان تعلیم کے میدان میں بیداری پیدا کرنا، روزگار کی فراہمی اور مسلمانوں کے درمیان بزنس کا جذبہ رکھنے والوں کو بڑھاوا دینا تھا۔ اس موقعے پر امامیہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری (آئی سی سی آئی) سے وابستہ اہم شخصیات کے علاوہ وزیر مملکت مختار عباس نقوی، سید شاہد مہدی، سابق مرکزی وزیر عارف محمد خان، ایرانی سفارت کار غلام رضا انصاری،

ڈاکٹر ابوصالح شریف، فرح نقوی سمیت تعلیم، روزگار اور صنعت کے میدان میں کام کرنے والی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے آئی سی سی آئی کے صدر سید صفوی نے پروگرام کے انعقاد کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ آئی سی سی آئی کے ڈائرکٹر اور ایگزیکٹو صدر سید محمد قائم نے کہا کہ یہ تنظیم غیر سیاسی اور غیر مذہبی ہے جس کے ارتکازی مقاصد قوم کی تعمیر و ترقی اور سماجی فلاح و بہبود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے مسلمانوں کی سب سے بنیادی ضرورت تعلیم، صنعت اور روزگار کو فوکس کیا ہے۔ اس تنظیم سے ہندوستان کے کامیاب ترین صنعت کار اور کارپوریٹر حضرات وابستہ ہیں۔ فی الوقت اس کی شاخیں دہلی این سی آر، یوپی، مہاراشٹر، کرناٹک اور آندھرا-تلنگانہ میں قائم ہوچکی ہیں۔ انھوں نے اس پروگرام کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ ملک بھر میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان کے اندر بے پناہ تخلیقی اور تعمیری صلاحیت ہے لیکن ان کو موقعے نہ ملنے کی وجہ سے وہ بہت پیچھے ہیں۔ آئی سی سی آئی ان صلاحیتوں کو ابھار کر ان کو اس قابل بنائے گا تاکہ وہ ملک کی خدمت کرسکیں۔ مرکزی وزیر مملکت مختار عباس نقوی نے کہا کہ سرکاری ملازمتوں میں اقلیتوں کا تناسب ساڑھے آٹھ فیصد ہوچکا ہے اس کے علاوہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف جہات پر کام جاری ہے۔ سرکار نے تعلیم کے میدان میں اقلیتی طلبا کی حوصلہ افزائی کے لیے پری میٹرک اسکالرشپ، پوسٹ میٹرک اسکالرشپ، میرٹ کم مینس اسکالرشپ، مولانا آزاد نیشنل فیلوشپ، فری کوچنگ اینڈ الائڈ اسکیم، یو پی ایس سی، ایس ایس سی، ریاستی پبلک سروس کمیشن کے ابتدائی امتحان میں کامیاب ہونے والے اقلیتی امیدواروں کو مالی امداد اور بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے 'پڑھو پردیش' جیسی اسکیمیں چلائی جارہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اقلیتی طلبا ان اسکیموں کا فائدہ اٹھائیں۔ جامعہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ سرکار کی فلاحی اسکیموں کے تئیں لوگوں کے اندر بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں بیداری نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے طلبہ اسکیموں سے فائدہ حاصل نہیں کرپاتے ہیں۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین قمر احمد نے اقلیتی کمیشن کی اسکیموں کی طرف توجہ دلائی۔ اس موقعے پر فرح نقوی اور عارف محمد خاں نے اپنے گراں قدر خیالات پیش کیے۔ غلام رضا انصاری نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، مذہبی، علمی اور سماجی بیداری کی تعریف کی۔

ابوصالح شریف نے ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جب تک ہم تحریکی طور پر مسلمانوں کے اندر تعلیمی بیداری پیدا نہیں کریں گے اس وقت تک ہمارے درمیان بیداری پیدا نہیں ہوسکتی اور تعلیمی بیداری کے لیے ہمیں اپنے اپنے سماج سے جڑ کر زمینی سطح پر کوشش کرنی ہوں گی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 26 جولائی 2015

ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی وخود مختاری: وقت کا مطالبہ

بریلی: مسلمانوں کی اقتصادی صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چانسلر ظفر سریش والا نے کہا کہ ہندوستان میں مسلمان دینے کے لیے آیا تھا مگر

افسوس کہ وقت کی تبدیلیوں نے اسے لینے والا بنا دیا۔ وہ مائناریٹی ویلفیئر ڈیولپمنٹ سوسائٹی (ایم ڈبلیو ڈی ایس) کے زیرِ اہتمام بریلی کے آئی ایم اے ہال میں ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی خودمختاری: وقت کا مطالبہ، موضوع پر منعقدہ ایک روزہ سیمینار سے بحیثیت مہمانِ خصوصی خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں کیونکہ علم کا حصول مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک مسلمان صرف شکایتیں کرتے رہیں گے اور آگے بڑھ کر کوئی مثبت اقدام نہیں کریں گے تب تک انھیں ملک کی ترقی کا فائدہ نہیں پہنچ سکتا اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مثبت اقدامات کرکے ملک کی ترقی میں اپنی حصہ داری انجام دیں۔ پروگرام کے اعزازی مہمان امبریش دتہ نے کہا کہ آج کا دور تعلیم اور مہارت کا دور ہے اور ملک کے خصوصی دھارے میں شامل ہونے کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ مہارت میں بھی آگے آنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ دورِ حاضر میں اگر کسی کے پاس اعلیٰ تعلیم اور مہارت ہے تو اس کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر کسی بھی حالت میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو ڈیجیٹل لٹریسی اور اقتصادی مہارت کے میدان میں بھی آگے آنا چاہیے کیونکہ یہی چیزیں ایک روشن مستقبل کی ضامن ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر محمد شاہد، محسن رضا خاں، این جمال انصاری اور ڈاکٹر جسیم محمد نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے سوسائٹی کے صدر پروفیسر رضاء اللہ خاں نے اپیل کی کہ مسلم نوجوان جدید ترین پیشہ ورانہ کورسیز کو اپنائیں اور ملک کی ترقی میں اپنا مثبت تعاون پیش کریں۔ سیمینار کے مہمان خصوصی ظفر سریش والا اور اعزازی مہمان امبریش دتہ کو یادگاری نشانات پیش کرکے سرفراز کیا گیا۔ سیمینار کے اختتام پر اتفاق رائے سے ایک تجویز پاس کرکے ظفر سریش والا کے توسط سے وزیراعظم کو ایک میمورنڈم پیش کیا گیا جس میں کہا گیا کہ حکومت مسلمانوں کے لیے اسپیشل اقتصادی پیکج اور بینک لون جاری کرے اور مسلم اکثریتی علاقوں میں اسکل ڈیولپمنٹ کے لیے تربیتی مراکز قائم کیے جائیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 28 جولائی 2015

'میری ماں' کا اردو ترجمہ سن کر جذباتی ہوگئے تھے عبدالکلام

علی گڑھ: کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ سابق صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام فطری طور پر انتہائی حساس تھے اور

اپنی سوانح عمری 'ونگس آف فائر' کی نظم 'میری ماں' کا اردو ترجمہ سن کر جذباتی ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر کلام کی سوانح عمری 'ونگس آف فائر' کا انگریزی سے اردو ترجمہ علی گڑھ کے حبیب الرحمٰن چغانی نے تقریباً 17 ماہ کے عرصے میں کیا تھا۔ اس کی اشاعت 2005 میں ہوئی تھی۔ داؤد پور کی گوشت والی گلی کے رہنے والے حبیب الرحمٰن پٹنہ میں واقع خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر اور اے ایم یو کے مولانا آزاد لائبریری کے ڈپٹی لائبریرین رہ چکے ہیں۔ اے ایم یو کے بانی سرسید کی طرف سے جاری کردہ ماہانہ میگزین 'تہذیب الاخلاق' کے لیے انھوں نے 'ونگس آف فائر' کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو مسلسل 17 قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) نے 2005 میں اسے 'پرواز' کے نام سے شائع کیا۔ مسٹر رحمٰن نے بتایا کہ ڈاکٹر کلام اردو نہیں جانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے این سی پی یو ایل کے اس وقت کے ڈائرکٹر حمید اللہ بھٹ سے اس کی کچھ سطریں پڑھوا کر سنی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر بھٹ نے ڈاکٹر کلام کو 'میری ماں' نظم کا اردو ترجمہ پڑھ کر سنایا تھا اور اسے سن کر وہ بہت جذباتی ہوگئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ پٹنہ میں ہی 2005 میں ڈاکٹر کلام سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ جب انھوں نے بتایا کہ 'ونگس آف فائر' کا اردو ترجمہ انھوں نے ہی کیا ہے تو ڈاکٹر کلام بہت خوش ہوئے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 30 جولائی 2015

اردو اصناف کی تدریس پر ورکشاپ

نئی دھلی: سی آئی آئی ایل سولن کے اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کے زیر اہتمام منعقدہ دوروزہ اردو اصناف کی تدریس کے موقعے پر اردو کی اہم اصناف پر اہل علم و دانش نے اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔ اس موقعے پر پروفیسر ابن کنول نے داستان کی تدریس، ڈاکٹر عقیل احمد نے غزل کی تدریس، ڈاکٹر حنان خان نے نظم کی تدریس، پروفیسر نعمان خان نے قصیدہ کی تدریس، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے مثنوی کی تدریس، پروفیسر انور پاشا نے مکتوبات کی تدریس، ڈاکٹر شمیم احمد نے انشائیہ/مضمون نگاری کی تدریس اور انجم عثمانی نے میڈیا کی تدریس پر اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اس طرح کے ورکشاپ درس و تدریس کے لیے نہایت مفید ہوتے ہیں۔ مختلف تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد باہم گفتگو کے بعد ایک نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ادب یا ادبی اصناف کی تدریس کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیے جائیں۔ اس ورکشاپ میں مختلف اصناف کی تدریس سے متعلق دو دن جو مباحثے ہوئے اس سے کافی نتائج سامنے

اقلیتوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق سیمینار کا منظر

آئے۔ ان نتائج کی بنیاد پر جو کتاب تیار ہوگی وہ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لیے کارآمد ہوگی۔ اس اہم کام کے لیے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی واقعی قابل مبارکباد ہیں۔ پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ اس ورکشاپ کا بنیادی مقصد ان طلبہ کے لیے اصناف ادب کی تدریس سے متعلق کتاب تیار کرنا ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اس ورکشاپ میں ادبی اصناف کے بنیادی پہلوؤں اور ان کی تدریس کے طریقہ کار کے حوالے سے تفصیلی گفتگو ہوئی اور عصری تقاضے اور تدریس کے نئے طریقہ کار اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ یکساں فارمیٹ کے تحت اسباق کی تیاری کی جائے۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ پروگرام میں بہت مفید اور ضروری باتیں ہوئیں، اب اساتذہ کو ادب کی تدریس کے لیے وافر خطوط فراہم کیے جانے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ ادب کا فہم و ادراک حاصل کرسکیں۔ پروفیسر نعمان خان نے اس ورکشاپ کو مفید بنانے کی امید ظاہر کی کہ اس سے متعلق شائع ہونے والی کتاب بھی اردو آموزگاروں کے لیے مفید و معاون ثابت ہوگی۔ اس سیمینار کے کنوینر اور ممتاز محقق ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کہا کہ اس حوالے سے مزید کئی ورکشاپ کیے جائیں گے۔ اس کے بعد ایک کتاب منظر عام پر آئے گی۔ روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 1 اگست 2015

اقلیتوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق سیمینار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے یو جی سی ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ سینٹر کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار کی اختتامی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے پرو وائس چانسلر بریگیڈیئر ایس احمد علی نے کہا کہ ملک کی ترقی اقلیتوں کے فروغ میں ہی پوشیدہ ہے اور اقلیتوں کو بھی دیگر لوگوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ملک کی ترقی میں سرگرم رول ادا کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اب اقلیتی فرقے میں بھی تعلیم کے تعلق سے بیداری پیدا ہورہی ہے اور اب غریب طبقہ کے ناخواندہ لوگ بھی اپنے بچوں کو یونیورسٹی اور اسکولوں میں داخلہ دلانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تفریق کی ذہنیت سے اوپر اٹھ کر بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ بریگیڈیئر علی نے اپنے تجربات سے روشناس کراتے ہوئے کہا کہ فوج کی اپنی ملازمت کے دوران انھیں کہیں بھی کسی قسم کی تفریق کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک میں رہنے والے سبھی شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں اور اقلیتوں کو بھی ان حقوق سے فیضیاب ہونا چاہیے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی آگرہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایم مزمل نے کہا کہ دورِ حاضر میں مدارس کو جدید تعلیم سے جوڑے جانے کی سخت ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر بروقت یہ اقدام کرلیا گیا ہوتا تو آج مسلمانوں کی صورت حال مختلف ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ عدم بیداری کے سبب اقلیتی فرقے سرکاری اسکیموں اور اسکالرشپ کا فائدہ نہیں اٹھا پارہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد اب اس پر عمل کیے جانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر مزمل نے کہا کہ اسکولوں میں مسلم بچوں کے ڈراپ آؤٹ پر حکومت کو توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ درمیان میں ہی تعلیم چھوڑ دینے سے مسلم بچوں کو روکا جاسکے۔ یو جی سی ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر اے آر قدوائی نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں بھی اس قسم کے پروگرام منعقد کیے جانے کی ضرورت ہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر فائزہ عباسی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 4 اگست 2015

عبدالرحیم خان خاناں کے مقبرے کی جدید کاری

نئی دہلی: ہندوستان کے قدیم شاعر اور ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت عبدالرحیم خان خاناں (رحیم) کے برسوں سے بدحال اور نظرانداز مقبرے کی شان و شوکت بحال ہونے والی ہے اور جلد ہی اس کی پرانی رنگت واپس آجائے گی۔ ہندوستانی آثار قدیمہ (اے ایس آئی) کی طرف سے محفوظ جنوبی دہلی کے نظام الدین ریلوے اسٹیشن اور ہمایوں مقبرے کے قریب واقع یہ مقبرہ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے خستہ حال ہوچکا ہے۔ اس مقبرے کی تعمیر خود رحیم نے اپنی بیگم کی یاد میں کروائی، جن کی موت 1598 میں ہوگئی تھی۔ بعد میں عبدالرحیم خان خاناں کو 1627 میں ان کی موت کے بعد اسی مقبرے میں دفن کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقبرے کے بلوا پتھر اور سنگ مرمر کو نکال کر صفدر جنگ کے مقبرے میں لگا دیا گیا۔ رحیم کا مقبرہ تاج محل کی پیشرو عمارتوں میں سے ایک ہے۔

مورخوں کا خیال ہے کہ آزادی کے بعد اس مقبرے کو لوگوں نے کافی نقصان پہنچایا۔ لیکن اب صورتِ حال تبدیل ہونے لگی ہے۔ اس مقبرے کے سنہرے دن واپس لانے کی ذمے داری آغا خان ٹرسٹ نے لی ہے۔ اسی ٹرسٹ نے ہمایوں کے مقبرے کی بھی تزئین کی تھی۔ رحیم کے مقبرے کی مرمت کے لیے پوری رقم، انٹرگلوب فاؤنڈیشن کی جانب سے دی جارہی ہے اور ہندوستانی آثار قدیمہ کی نگرانی میں اس کام کو انجام دیا جارہا ہے۔ اس پورے منصوبے پر تقریباً 10 سے 12 کروڑ روپے کی لاگت آنے کا امکان ہے اور اس کے 3 سال میں مکمل ہونے کی توقع ہے۔ گزشتہ 6 ماہ سے اس مقبرے کے تحفظ کا کام چل رہا ہے۔ سب سے پہلے پورے مقبرے کی لیزر اسکیننگ کی گئی، جس سے باریک سے باریک دراڑوں کا پتہ چل سکے۔ اب سب سے پہلے انھیں دراڑوں کو بھرنے کا کام کیا جارہا ہے۔

آغا خان ٹرسٹ کے دہلی کے کنوینر رتیش نندا نے بتایا کہ پہلے اس عمارت کی مرمت کے دوران سیمنٹ کا استعمال کیا گیا، جس سے اس کی دیواروں کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ اس لیے اس سیمنٹ کو نکال کر دوبارہ بلوا پتھر کا استعمال کرتے ہوئے عمارت کو محفوظ کیا جائے گا۔ مقبرے کے اندر قبروں کی دیواریں خستہ حال ہیں اور دیواروں میں کافی بڑی بڑی دراڑ آنے کی وجہ سے اسے محفوظ کرنے میں زیادہ وقت لگ رہا ہے۔ اس کے لیے انگلینڈ سے خاص طور سے اسٹرکچرل انجینئر کو بلایا گیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 21 جولائی 2015

'اردو میں بچوں کا ادب فن اور روایت'

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کا قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم ایک اور تاریخی سیمینار 'اردو میں بچوں کا ادب فن اور روایت' کا گہوارہ بنا۔ اس سہ روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کا آغاز صبح گیارہ بجے ہوا اور حسب پروگرام اکادمی کے اسسٹنٹ

سکریٹری راغب الدین نے افتتاحی اجلاس کے معزز مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے اکادمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور آنجہانی سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام اور دہلی اور دہلی کے معروف استاد شاعر نصرت گوالیاری کے انتقال پر دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے خراجِ عقیدت پیش کرنے کی سامعین سے استدعا کی۔ بعدازاں جلسے کی نظامت کے لیے پروفیسر شہزاد انجم کو آواز دی گئی۔ پروفیسر شہزاد انجم نے اکادمی کی ادبی سرگرمیوں سمیت سیمینار کی غرض و غایت پر بھی روشنی ڈالی اور استقبالیہ کلمات کے لیے اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر خالد محمود کو دعوت دی۔ پروفیسر خالد محمود نے بھی سب سے پہلے مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کا ذکر کرتے ہوئے بچوں سے ان کے دیرینہ التفات کا ذکر کیا اور پھر تمام مہمانوں کا فرداً فرداً خیر مقدم بھی کیا۔ اس دوران قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے نومنتخب ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کا بطور خاص استقبال کیا اور ان کے تنقیدی و تحقیقی کارناموں کو سنگِ میل قرار دیا ساتھ ہی یہ امید بھی جتائی کہ ایک فعال اور سرگرم شخصیت کی سربراہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ترقی کے نئے آسمانوں تک رسائی حاصل کرے گی۔ پروفیسر موصوف نے افتتاحی اجلاس میں شامل تمام سامعین کا بھی شکریہ ادا کیا اور یہ اعلان بھی کیا کہ جلد ہی اردو اکادمی، دہلی 'بچوں کے عبدالکلام' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب شائع کرے گی۔ سیمینار کا باضابطہ افتتاح سید شاہد مہدی نے فرمایا پروفیسر شاہد مہدی کے بعد مہمانِ اعزازی پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کے ادب سے میرا رشتہ بہت گہرا رہا ہے اور میرا ماننا ہے کہ جس سماج میں بچوں اور خواتین پر لکھنے کی روایت باقی نہ رہے اس سماج کا قائم رہنا مشکل ہے۔

''آج کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ بچوں کو ادب کے مطالعے کے لیے کس طرح سے راغب کیا جائے، اس کے لیے ہمیں اپنے گھروں میں ادبی ماحول قائم کرنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی میں سہ روزہ سیمینار 'اردو میں بچوں کا ادب فن اور روایت' کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کیا۔ اس اجلاس کی نظامت شعیب رضا فاطمی نے کی۔ ڈاکٹر رضا حیدر نے پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور محمد خلیل کے ذریعے بچوں کے لیے سائنسی مضامین لکھنے کی تعریف کی۔ اجلاس کے دوسرے صدر و سینئر صحافی اسد رضا نے کہا کہ بچوں کے لیے سائنسی ادب اسی لیے لکھا جاتا ہے کہ تاکہ بچے سائنس پڑھنے کی جانب راغب ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اسے مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اجلاس میں طٰہٰ نسیم، ڈاکٹر جاوید نسیمی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر محبوب راہی، مختار ٹونکی، پروفیسر علی احمد فاطمی اور محمد خلیل نے مقالے پیش کیے۔ اجلاس کے آخر میں اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر خالد محمود نے تمام مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کی۔ وہیں سامعین کا بھی شکریہ ادا کیا اور یہ وضاحت بھی کی کہ زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو کے املا، جملے اور تلفظ کا خیال رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ دوپہر بعد دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر معین الدین جینابڑے اور فیروز بخت احمد شامل تھے۔ نظامت ثاقب عمران نے کی۔ سیمینار کے آغاز میں ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر شاداب علیم، شاہد اختر، ڈاکٹر محمد عرفان عالم، کوثر صدیقی اور پروفیسر محمد ظفر الدین نے مقالے پڑھے۔ مقالات کے بعد فیروز بخت احمد نے کہا کہ یہ سچ ہے کہ ہیری پوٹر سے بہت پہلے ہمارے ادیبوں نے بچوں کے لیے اس جیسی کہانیاں لکھ دی تھیں لیکن ہم یوروپ کی ذہنی غلامی کی وجہ سے اپنی میراث کو حقیر جانتے ہیں اور اپنے کلاسیکی ادب پر توجہ نہیں دیتے۔ پروفیسر معین الدین جینابڑے نے کہا کہ آج کے دور نے بچوں سے ان کی معصومیت چھین لی ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے بچوں کی تربیت و تعلیم کے دوران انسانی اقدار کو مستحکم بنیاد فراہم کرنے پر زور دیا اور کہا کہ تعلیم سے زیادہ آج کے بچوں کے لیے تربیت کی ضرورت ہے۔ اجلاس کے اختتام پر سیمینار کمیٹی کے کنوینر پروفیسر شہپر رسول نے مقالہ نگاروں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ کل ہند سہ روزہ سیمینار 'اردو میں بچوں کا ادب فن اور روایت' کے تیسرے دن پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر انور پاشا نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں محمد محفوظ عالم، ڈاکٹر خان احمد فاروقی، ڈاکٹر نصرت جہاں، ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، فاروق سید اور عارف عزیز وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ بچوں کے ادب کے موضوع پر سیمینار کے انعقاد پر اکادمی مبارک باد کی مستحق ہے۔ تلخ حقیقت ہے کہ بچوں کا ادب کمتر تصور کیا جاتا ہے کیونکہ بڑے ادبا کی توجہ اس جانب نہیں ہے اور یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ مستقبل سے بیگانہ ہو کر کوئی بھی قوم بہتر سمت کی جانب گامزن نہیں ہو سکتی۔ ہمارے بچے ہمارا مستقبل ہیں اور مستقبل کے سپہ سالار ہیں۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ اکادمی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ نئے موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا۔ سیشن کے اختتام پر کنوینر سیمینار کمیٹی پروفیسر شہپر رسول نے اظہار تشکر کیا۔ دوپہر ڈھائی بجے سیمینار کا آخری اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت میں پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر شہپر رسول شامل تھے جبکہ نظامت جناب سلمان فیصل نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر زبیر شاداب، ڈاکٹر ابوبکر عباد اور انجم عثمانی نے مقالے پڑھے۔ سیمینار کے آخر میں معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر جی آر کنول، پروفیسر علی احمد فاطمی، فیروز بخت احمد، شمیم طارق وغیرہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ ایسا سوچنا کہ بچوں کا ادب از کار رفتہ ہو چکا ہے یہ غلط خیال ہے۔ پروفیسر خالد محمود نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو طاقتور زبان ہے اور اس میں وہ دم ہے کہ اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا، جو لوگ پیشہ ورانہ طور پر اردو سے جڑے ہوئے ہیں وہ اردو کے خادم نہیں بلکہ مخدوم ہے، اردو ان کی خدمت کر رہی ہے، ہمیں اردو کا احسان مند ہونا چاہیے اور ہمیں احتساب بھی کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 و 3 اگست 2015

جواہر سرکار نے ٹیگور اسکیم کی ستائش کی

نئی دھلی: ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ایک تاریخی اور بیش بہا ادبی و ثقافتی کارنامہ ہے

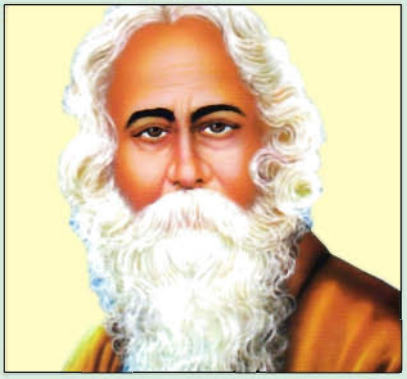

جسے ادب میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس غیر معمولی علمی کارنامے کا ذکر میں خصوصی طور پر صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی اور نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری سے کروں گا۔ کتابیں ہماری زندگی کا سرمایہ اور علمی وراثت ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحت جن کتابوں کی اشاعت ہوئی ہے اس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ اردو اور بنگلہ زبان کے رشتے کا یہ ایک انمٹ نقش ہے۔ یہ رشتہ ہندوستانی تاریخ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ کا ایک روشن باب ثابت ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار جواہر سرکار سی ای او پرسار بھارتی نے پی ٹی آئی بھون میں کیا۔ پی ٹی آئی بھون میں ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے کو آرڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم، جامعہ کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی، گیتانجلی کے مترجم ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی اور شعبہ کے ریسرچ اسکالر جاوید حسن نے جواہر سرکار کی خدمت میں ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کی مطبوعات ناول گورا، گیتانجلی، ٹیگور شناسی، رابندر ناتھ ٹیگور: شاعر اور دانشور، ٹیگور کی بازیافت، ٹیگور اور اقبال، باغبان، کلامِ ٹیگور، میری یادیں، ٹیگور کے مضامین، ٹیگور کی کہانیاں، ٹیگور کے ڈرامے، رابندر ناتھ ٹیگور: فکر وفن کے ہزار رنگ اور ٹیگور پروجیکٹ معلوماتی کتابچہ کے چار سیٹ پیش کیے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ ہم وزارت ثقافت حکومت ہند کے سبھی ارباب حل وعقد کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے یہ یادگاری اور قیمتی پروجیکٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے سپرد کیا جسے شعبہ کے اساتذہ و ریسرچ اسکالرز نے دیگر ادبا و مترجمین کی مدد سے بے حد انہماک اور سنجیدگی سے متعینہ وقت پر مکمل کیا۔ پروجیکٹ کوآرڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ یقیناً اس پروجیکٹ کے ذریعے پورے ہندوستان میں ٹیگور شناسی اور ٹیگور فہمی کے نئے سلسلے کا آغاز ہوا اور نئی نسل ٹیگور کی شاعری، فکشن، ان کی روشن خیالی، سیکولر اقدار، ادب و آرٹ دوستی سے بخوبی واقف ہوئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 جولائی 2015

ایران کلچر ہاؤس میں نئے سرٹیفکٹ کورس کا آغاز

نئی دھلی: ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی میں فارسی زبان کی ترویج و ترقی کے لیے فارسی میں سرٹیفکیٹ کورس کے لیے نئے سیشن کی کلاسوں کا آغاز عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ایران کلچر ہاؤس کے ڈپٹی کلچرل کونسلر احمد عالمی نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جب ہم کوئی زبان سیکھتے ہیں تب ایک نئی دنیا دریافت کرتے ہیں، ہم اس زبان کی

تہذیب و ثقافت سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ فارسی زبان کا شمار بھی دنیا کی قدیم تاریخی اور متمدن زبانوں میں ہوتا ہے۔ فارسی زبان کے اثرات ہندوستانی تہذیب وتمدن اور زبانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چونکہ فارسی زبان نے ہندوستان میں آٹھ سو سالوں تک یہاں کی سرکاری زبان کے طور پر حکومت کی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کا صحیح اور غیر جانب دار مطالعہ فارسی زبان کی تاریخی کتابوں کے مطالعے کے بغیر نامکمل ہے۔ اگر آپ اپنے ملک ہندوستان کی تاریخ جاننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے تمام حوالے فارسی زبان کے ہی ملیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات کو فروغ دینے میں فارسی زبان کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ ایران کے فارسی شعرا نے ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور یہاں کی سماجی صورت حال پر بہت سے اشعار لکھے ہیں جو سبک ہندی کے نام جانے جاتے ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے ملک الشعرا بہار کی ایک مثنوی کے چند اشعار پیش کیے۔ فارسی کلاس میں بڑی تعداد میں فارسی طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ پچھلے سیشن میں کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات کو سرٹیفکٹ پیش کیے گئے۔ اس موقعے پر فارسی زبان کے ایرانی معلم مجید احمدی، خانم محبوبہ طیران بھی موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت ایران کلچر ہاؤس میں فارسی زبان کے کوآرڈینیٹر علی ظہیر نقوی نے انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جولائی 2015

جامعہ کی طالبہ زینب سعید نے UPSC کے انٹرویو میں ٹاپ کیا

نئی دھلی: یوپی ایس سی کے حالیہ نتائج میں 37 مسلم امیدواروں کی کامیابی کے بعد سے کئی مثبت خبریں

سامنے آئی ہیں، غنچہ صنوبر نے بہار کی پہلی مسلم آئی پی ایس بننے کا ریکارڈ اپنے نام کیا ہے، اب ایک اور خبر یہ ہے کہ ایک خاتون مسلم امیدوار نے 2014 کے یوپی ایس سی کے انٹرویو میں سب سے زیادہ نمبرات حاصل کرنے کا ریکارڈ اپنے نام کیا ہے۔ زینب سعید نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اے کے جے، ایم سی آر سی سے 2011 میں جرنلزم میں ماسٹر ڈگری حاصل کی، انھیں یوپی ایس سی کے انٹرویو کے 275 نمبر میں سے 220 نمبر حاصل ہوئے ہیں یہ اس بار کے امتحان کا سب سے زیادہ نمبر ہے۔ انھیں 107 ویں رینک حاصل ہوئی ہے اور آئی ایف ایس ملا ہے۔ جبکہ یوپی ایس سی ٹاپر ایرا سنگھل کو 162 نمبر ملے ہیں۔ زینب نے زکوٰۃ فاؤنڈیشن کی مالی مدد سے جامعہ کوچنگ سینٹر سے تیاری کی ہے، یہ کولکاتہ کی رہنے والی ہیں اور ان کا تعلق بوہرہ مسلم کمیونٹی سے ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 24 جولائی 2015

دھلی:

اردو کی پیڈیا کی موجودہ عہد میں اہمیت وضرورت

نئی دھلی: اردو کی توسیع واشاعت اور اسے بامعنی اور مفید بنانے کے لیے اردو کی پیڈیا بہت اہم رول ادا کرسکتی ہے۔ یہ بات اردو کی پیڈیا کے روح رواں سائنس داں اور محبّ اردو نثار احمد سید نے ایک مذاکرے میں کہی۔ انھوں نے کہا کہ اردو علم کا خزانہ ہے لیکن یونیکوڈ میں نہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگوں کی پہنچ سے باہر ہے۔

انھوں نے کہا کہ دوسری زبان کی طرح اردو میں بھی معلومات انگیز مضامین، تحقیقی مقالے، ریسرچ پیپر اور دیگر موضوعات پر فکر انگیز مضامین لکھے جاتے ہیں لیکن ان پیج اور فونٹ فائل میں ہونے کی وجہ سے مستفیدین اس سے فائدہ نہیں اٹھاپاتے ہیں۔نثار احمد نے کہا کہ ہم لوگوں نے انٹرنیٹ سے اردو کے مواد کو جوڑنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ جگہ جگہ لوگوں اور اردو تنظیموں سے ملاقات کر کے اردو کی پیڈیا کے بارے میں انھیں آگاہ کر رہے ہیں۔ کیرالہ کی سنسکرت یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر عطاء اللہ خاں سنجری نے کہا کہ ہم لوگوں کا مقصد اردو والوں کو اس سلسلے میں بیدار کرنا اور اردو کی پیڈیا کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ اردو میں ادیبوں اور دانشوروں سے متعلق وکی پیڈیا میں بہت ہی ناقص معلومات ہیں۔اسے بہتر کیا جائے تو اردو میں بیش قیمتی خزینہ دستیاب ہوسکتا ہے۔مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے کہا کہ انٹرنیٹ پر اردو کے حوالے سے معلومات دے کر ہم اردو قاری کو بہتر مواد مہیا کراسکتے ہیں۔ہیومن چین کے چیئر مین انجینئر محمد اسلم علیگ نے کہا کہ یہ کارنامہ اردو دنیا کے لیے ایک اہم تحفہ ثابت ہوگا۔ اس موقعے پر عابد انور، اردو اسکالر جاوید اختر، فیض الاسلام فیضی اور دیگر حضرات شامل ہیں۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 6 اگست 2015

انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری پر مذاکرہ

نئی دھلی: شمیم طارق ایک بہترین شاعر ونثر نگار کے ساتھ ساتھ ملت کے غمخوار بھی ہیں۔انھوں نے علمی وادبی کتابوں کے علاوہ صوفیا کے حوالے سے جو کتاب لکھی ہے

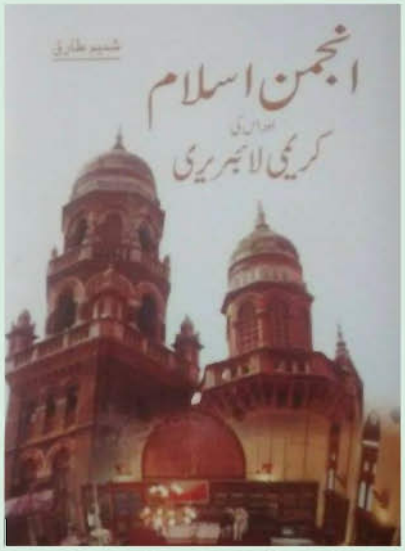

اور جو واقعات پیش کیے ہیں وہ اہم ہیں۔ انھوں نے اپنے علمی کمالات کے جوہر اس کتاب میں ظاہر کیے ہیں۔ انجمن اسلام ممبئی کے مسلمانوں کا روشن باب ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر خالد محمود نے شمیم طارق کی کتاب 'انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری' پر غالب اکادمی میں منعقدہ مذاکرے میں اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ تحقیق کے لیے جس علمی شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ شمیم طارق کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔انھوں نے اس کتاب میں ان تحقیقی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ شمیم طارق کی یہ تصنیف ایک تاریخی اور غیر معمولی کارنامہ ہے۔شمیم طارق نے عمیق مطالعہ، مشاہدہ اور تحقیق کی خوبیوں کے ساتھ اس کتاب کو لکھا ہے۔انجم عثمانی نے اس کتاب پر ایک مضمون پیش کرتے ہوئے کہا کہ شمیم طارق نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بالخصوص ممبئی کے مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال، انجمن اسلام اور کریمی لائبریری کا جو خاکہ کھینچا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ سہیل انجم نے کہا کہ یہ کتاب ایک بے حد اہم موضوع پر انتہائی تحقیقی انداز میں تصنیف کی گئی ہے۔اس کی تیاری میں شمیم طارق نے جس عرق ریزی اور دقت نظر سے کام لیا ہے اس کی گواہی ایک ایک سطر دے رہی ہے۔ غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر کئی اہم شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 اگست 2015

اینگلو عربک اسکولز اینڈ دہلی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا اجتماع

نئی دھلی: اینگلو عربک سینئر سکنڈری اسکول اور دہلی کالج کے سابق طلبہ کی تنظیم 'اینگلو عربک اسکولز اینڈ دہلی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ)' نے جلسے کا اہتمام کیا۔اسکول کے تاریخی ہال میں منعقدہ جلسے کی صدارت انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر اور ایسوسی ایشن کے صدر سراج الدین قریشی نے کی۔ پروفیسر طلعت احمد، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور صدر دہلی ایجوکیشنل سوسائٹی نے جلسے میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ان کے علاوہ ذاکر حسین دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، معروف صحافی اور انڈین نیشنل کانگریس کے قومی ترجمان م افضل، دہلی ایجوکیشنل سوسائٹی کی سکریٹری ڈاکٹر ثروت علی،

'اینگلو عربک اسکولز اینڈ دہلی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ)' کے پروگرام کا منظر

اینگلو عربک سینئر سکنڈری اسکول کے منیجر ڈاکٹر وسیم احمد خان، شفیق میموریل سینئر سکنڈری اسکول کے منیجر ڈاکٹر ارشد اکرام احمد اور دہلی وقف بورڈ کی چیئر پرسن محترمہ رعنا پروین صدیقی اعزازی مہمانوں کے طور پر جلسے میں شریک ہوئے۔ قاری نصیر احمد، امام وخطیب مسجد باغ والی، نے تلاوتِ کلام پاک کے ساتھ جلسے کا آغاز کیا۔ایسوسی ایشن کے سینئر نائب صدر اور معروف تعلیمی وسماجی کارکن حاجی میاں فیاض الدین نے افتتاحی خطاب کرتے ہوئے تمام شرکا اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا جبکہ ایسوسی ایشن کے خزانچی اشرف کمال نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ کانگریس کے ترجمان م افضل نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں متحد ہوکر پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے قرآنی آیات کے حوالے سے عدل کی تعریف کی اور اساتذہ کو پوری لگن کے ساتھ اپنا کام انجام دینے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر ثروت علی، سکریٹری، دہلی ایجوکیشنل سوسائٹی، نے عوام اور اسکول انتظامیہ کے درمیان باہمی روابط کی ضرورت پر زور دیا۔

ڈاکٹر وسیم احمد خان، منیجر، اینگلو عربک سینئر سکنڈری اسکول نے اسکول کے بنیادی ڈھانچے میں تیزی سے بہتری لانے کے عزم کو دہرایا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر طلعت احمد، وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی مصروفیات کے باوجود اسکولوں کے لیے وقت نکالنے کے حوالے سے کہا کہ یہ اسکول ہماری قوم کا اثاثہ ہے اور ہم سب کو اس کی حفاظت اور آبیاری کرنی ہوگی۔ جلسے کے اختتام پر ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری ذوالفقار قریشی نے شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر صغیر اختر نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اگست 2015

اتر پردیش:

رضا لائبریری بورڈ کی میٹنگ

رام پور: گورنر ہاؤس میں گورنر جناب رام نائک کی صدارت میں منعقد رام پور رضا لائبریری بورڈ کی میٹنگ میں کئی اہم فیصلے لیے گئے۔ منعقد میٹنگ میں بورڈ کے ذمہ داران نے مولانا محمد علی جوہر کے نام سے منسوب ہر

سال دو ایوارڈ صحافت، شاعری اور مولانا سے متعلق سرگرمیاں انجام دینے والی شخصیات کو دینے کا اعلان کیا جس میں 40 سال سے زیادہ عمر کی شخصیات کو سینئر ایوارڈ، انعامی رقم ایک لاکھ اور جونیئر ایوارڈ انعامی رقم 50 ہزار دینے کا اعلان کیا گیا جبکہ منشی نول کشور شرما کے نام سے منسوب پبلشر کو بھی ایوارڈ دیے جانے کا اعلان کیا گیا، جس کی انعامی رقم ایک لاکھ روپے متعین کی گئی ہیں اس کی شروعات اسی سال سے ہوگی۔ اس موقعے پر گورنر رام نائک نے تعلیمی سرگرمیوں پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تعلیم سے ہی سماج میں پھیلی برائیوں کو ختم کیا جاسکتا ہے اور مولانا محمد علی جوہر جیسی شخصیات نسل نو کے لیے ایک نظیر ہیں جن کے نقش قدم پر چل کر ہم اپنے بچوں کو صحیح سمت میں لے جاسکتے ہیں۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی 29 جولائی 2015

ملک وملت کی تعمیر میں اردو اخبارات کا اہم کردار ہے

سہارنپور: جنگ آزادی میں اردو اخبارات نے جو کردار ادا کیا ہے اسے کوئی نظرانداز نہیں کرسکتا، فرنگی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے اردو اخبارات نے صف

اول کا کردار ادا کیا ہے، مولانا آزاد کا الہلال ہو یا مولانا محمد علی جوہر کا کامریڈ ہو ان اخبارات نے انگریزی حکومت کا نہ صرف ناطقہ بند کررکھا تھا بلکہ پوری قوم کے اندر آزادی کی لہر بھی پھونک دی تھی، ان خیالات کا اظہار اتراکھنڈ و یوپی کے سابق گورنر جناب عزیز قریشی نے ہندوستان ایکسپریس کے سہارنپور بیورو چیف صالح احقر سے خصوصی گفتگو کرتے ہوئے کیا، انھوں نے کہا انگریزی حکومت نے اردو اخبارات کی اشاعت روکنے اور اخبارات کو بند کرنے کے کئی طرح کے ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے مگر اس وقت کے اردو صحافیوں نے اپنی جان و مال اور اپنے خاندان کی پروا نہ کرتے ہوئے انگریزوں سے کھل کر ٹکر لی اور انگریزی حکومت کے خاتمے تک اپنے کاز میں مصروف رہے، انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد بھی ملک وملت کی تعمیر میں اردو اخبارات کا اہم کردار رہا ہے ان اخبارات کا آزادی کے بعد مسلمانوں کا حوصلہ بڑھانے اور قدم جمانے میں جو کردار رہا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، انھوں نے یوپی میں اردو زبان کی زبوں حالی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان خود اردو سے دور ہوتا جارہا ہے جو اردو کے لیے اچھی علامت نہیں ہے جو علاقے اردو کے نہیں ہیں وہاں اردو زبان اور اردو اخبارات خوب پھل پھول رہے ہیں اور خوب ترقی کررہے ہیں جبکہ یوپی میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اردو کو گلے لگائیں اپنے گھر میں اردو کا چلن پیدا کریں اپنے بچوں کو پرائمری سطح سے اردو کی تعلیم دلائیں تاکہ آنے والے وقت میں اردو کا چراغ مزید روشن ہوتا رہے انھوں نے کہا اردو کی ترقی اور اشاعت میں دینی مدارس کا جو کردار ہے اس کو کوئی نظرانداز نہیں کرسکتا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 31 جولائی 2015

رامپور رضا لائبریری میں قرآن کریم کے مخطوطوں کی نمائش

رام پور: حسب روایت امسال بھی 11 جولائی سے شروع ہوکر 20 جولائی تک جاری رہنے والی اس نمائش کا افتتاح نائب امام جامع مسجد مولوی عبدالوہاب خاں فیضان کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے ذریعے رضا لائبریری کے زیر اہتمام شائع کیلی گرافی کے کیٹلاگ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی نائب امام جامع مسجد عبدالوہاب خاں فیضان نے کہا کہ رضا لائبریری ہر سال قرآن کریم کے نسخوں کی نمائش کا اہتمام کرتی ہے لیکن اس مرتبہ اسلامی کیلی گرافی کی فہرست بھی شائع کی گئی ہے جو ایک قابل تحسین کام ہے۔ اس موقعے پر لائبریری کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر ایس ایم عزیز الدین حسین نے کہا کہ عربی خطاطی ایک طلسماتی فن ہے جو نہ صرف خطاطی تکنیک بلکہ اس کی عملی اور روحانی جذبات کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔ عربی رسم الخط کے مصوروں، ماہرین اور فنکاروں نے اسے حسن و جمال کا سب سے بڑا نمونہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عربی رسم الخط کے ماہرین نے ہر صدی میں نئے نئے انداز سے قرآن پاک کی اپنے فن خطاطی کے ذریعے خدمات انجام دی ہیں۔ دنیا کے مختلف مقامات سے تعلق رکھنے والے ماہرین خطاط کی کتابت کیے ہوئے قرآن مجید کے سیکڑوں نادر و نایاب مخطوطات رضا لائبریری میں موجود ہیں۔ نمائش کے کنوینر ڈاکٹر ارشاد ندوی نے بھی خطاب کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس نمائش میں کوفی رسم الخط میں ساتویں صدی عیسوی میں حضرت علیؓ کے ذریعہ لکھا گیا نادر قرآن مجید، کوفی رسم الخط کا آٹھویں صدی عیسوی میں امام ابوعبداللہ جعفر بن محمد بن علی کے ذریعہ لکھا گیا نادر قرآن مجید، عربی نسخ بہار رسم الخط کا 1379 کا قرآن مجید جس میں بادشاہ عالمگیر کے منصب دار غضنفر کی مہر ثبت ہے، عربی نسخ رسم الخط کا 1315 کا لکھا ہوا بہت ہی خوبصورت قرآن مجید، ثلث رسم الخط میں 1669 کا قرآن مجید جو اس سے بہت ہی خوبصورت طریقہ سے ہر صفحہ پر 3 سطر ثلث رسم الخط میں سونے سے لکھا اور 12 سطور میں نسخ رسم الخط میں کالی سیاہی سے کاغذ پر لکھا ہے۔ اسی طرح نسخ رسم الخط کا 1103 کا قرآن مجید، عربی نسخ رسم الخط کا 1743 کا قرآن مجید جس کو محمد رضا کشمیری کے ذریعے بہت ہی خوبصورت کاغذ پر کتابت کیا گیا ہے۔ جس کی سطروں کے درمیانی جگہ کو سونے کے پانی سے مزین کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عربی نسخ رسم الخط کا 1152 کا قرآن مجید جس کے کاتب کمال الدین حسن بن محمد میرک الحسینی النجفی ہیں وغیرہ کو بھی نمائش میں رکھا گیا ہے۔ اس موقعے پر لائبریری کے افسران اور ملازمین کے ساتھ ساتھ شہر کے معززین بھی موجود رہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر'، دہلی، 12 جولائی 2015

ڈی اے وی کالج نے اردو کی تعلیم شروع کی

بلرامپور: ڈی اے وی انٹر کالج کے منیجر سنجے تیواری نے تعلیم کے میدان میں نئی شروعات کی ہے۔ انھوں نے انٹر میں لڑکوں ولڑکیوں کے لیے اردو کی تعلیم کا بہتر نظم کیا ہے۔ اس سلسلے میں بات کرتے ہوئے سنجے تیواگری نے بتایا کہ ضلع میں کہیں بھی انٹر میں اردو کی تعلیم کا انتظام طالبات کے لیے نہیں ہے جبکہ انھوں نے کالج میں طالبات کے لیے الگ سے کلاس روم کا انتظام اردو کی تعلیم کے لیے کیا ہے۔ واضح رہے کہ بلرام پور میں گرلس کالج میں صرف ہائی اسکول تک اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ایم پی پی انٹر کالج میں صرف لڑکوں کے لیے ہی اردو کی تعلیم کا انتظام ہے جس سے ضلع کی لڑکیوں کو کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سنجے تیواری نے بتایا کہ اردو کے علاوہ سب کے لیے سائیکالوجی، ڈرائنگ، سوشل سائنس، بائیولوجی وغیرہ کا بھی نظم کیا گیا ہے جس کے لیے اجازت مل چکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو طالبات اردو پڑھنا چاہتی ہیں وہ ڈی اے وی میں اپنی تعلیم پوری کرسکتی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 23 جولائی 2015

بہار:

اعلیٰ تعلیم اور اقلیتیں

بہار: جو وقت کے ساتھ نہیں چلتا وقت اس کا ساتھ نہیں دیتا، جو وقت کی قدر نہیں کرتا وقت اس کی قدر نہیں کرتا اور جو

وقت کو فضول سمجھتا ہے وقت اسے فضول ثابت کر دیتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار سرسید اویئرینس فورم کے صدر اور مسلم یونیورسٹی کے معروف استاد پروفیسر شکیل صمدانی نے علیگ ٹوریلز کی جانب سے منعقدہ کانفرنس بعنوان 'اعلیٰ تعلیم اور اقلیتیں' کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بطور مہمان خصوصی کیا۔ انھوں نے کہا کہ تربیت کے بنا تعلیم فضول ہے کیونکہ تعلیم یافتہ شخص کو اگر اچھی تربیت نہیں دی گئی تو اکثر و بیشتر یہ تعلیم اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اور معاشرے کے لیے بھی۔ انھوں نے کہا کہ سرسید احمد خان نے جہاں جہاں بھی تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں انھوں نے تربیت کا بھی لفظ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر طلبا صرف میڈیکل اور انجینئرنگ کی ہی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں جبکہ آج کے دور میں قانون، میڈیا، کارپوریٹ سیکٹر، کمپیوٹر سائنسز جیسے بہت سے نئے کورسز ہیں جن میں ترقی کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔ مسٹر ٹی بی تھامس، پرنسپل سینٹ جوزف اکادمی نے کہا کہ اقلیت ہونا کوئی کمزوری نہیں ہے بلکہ اقلیت ہونے پر ہمیں مزید مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ ہمیں تعلیمی اور ثقافتی حقوق کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے روز میری لینڈ کالج کے ڈائرکٹر انصار رضوی نے کہا کہ ہمیں وقت کی قدر کرنی چاہیے اور یہ ذہن نشین کرنا چاہیے کہ کامیابی کے لیے سخت محنت اور یکسوئی درکار ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر طلبا اور طالبات نے پروفیسر صمدانی کے گراں قدر خیالات کو اپنی زندگی میں اتارا تو ان کی زندگی کامیاب ہو جائے گی۔ اس موقعے پر سینئر علیگیرین الحاج نسیم اختر (علیگ)، قیس عالم وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تابش اقبال نے انجام دیے۔ اس موقعے پر نازیہ احمد اور محمد عاقب کو بہترین کامیابی کے لیے مہمانِ خصوصی کے ذریعے انعامات سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 1 اگست 2015

مہاراشٹر:

تمام سرکاری اسکولوں میں اردو اختیاری مضمون ہوگی

ممبئی: مہاراشٹر سرکار نے اعلان کیا ہے کہ ریاست کے تمام سرکاری اسکولوں میں اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے متعارف کرے گی۔ یہ باتیں تعلیم اور ترقی کے موضوع پر ایک کانفرنس سے خطاب کے دوران مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ دیویندر فڑنویس نے کہیں۔ اس کانفرنس کا اہتمام وزیر اعظم کے معتمد سمجھے جانے والے ظفر سریش والا نے کیا تھا۔ انھوں نے اس کے ساتھ بتایا کہ حکومت اس بات کا بھی ارادہ رکھتی ہے کہ ریاست میں اردو میڈیم جونیئر اور ڈگری کالجوں کو کھولا جائے تاکہ مسلمانوں میں تعلیم کے اوسط کو بڑھایا جائے جو اس لیے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں کہ دسویں کلاس کے بعد اردو میڈیم کالج نہیں ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے اس بات کی حمایت کی کہ طالب علم کو مادری زبان کے علاوہ بھی مزید کوئی اور زبان سیکھنی چاہیے اور سرکار اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اردو کو تمام سرکاری اسکولوں میں اختیاری زبان بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ مدرسوں میں میتھ، سائنس اور انگلش پڑھانے سے ان کی نوکری کے امکانات وسیع ہوں گے۔ واضح رہے کہ وزیر اعلیٰ کے علم میں یہ بات غالباً نہیں کہ بیشتر مدارس میں ان سبجیکٹ کی تعلیم کا انتظام ہے اور مدارس کے طلبا میں بے روزگاری کی شرح جدید تعلیمی اداروں کے فارغین کے مقابلہ کم ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئے ادارے کھولنے میں پیسے کی کمی مانع نہیں ہوگی، کیونکہ ریاست میں تعلیم کے لیے 44000 کروڑ روپے کا بجٹ مختص ہے۔ اگر اس بجٹ میں اقلیتوں کے لیے مزید 500 کروڑ روپے کا اضافہ ہو جائے تو میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ انھوں نے کہا کہ آپ اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے منصوبے لے کر آئیں سرکار آپ کو فنڈ مہیا کرے گی۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 5 اگست 2015

گیارہویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ تقریب کا منظر

اعزاز و اکرام:

گیارہویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ کی تقریب

نئی دھلی: ''حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا کارنامہ غیر محیط ہے۔ قرآن فہمی اور عصر حاضر کے مسائل میں قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کرنے کی جو تحریک شروع کی تھی وہ آج بھی اتنی ہی اہم ہے۔ لہٰذا ہمیں ہندوستان میں دعوت قرآن کی تعلیم کو عام کرنے پر خصوصی توجہ دینا چاہیے۔'' انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انجینئرنگ آڈیٹوریم میں منعقدہ گیارہویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ کی تقریب میں صدارتی خطاب کرتے ہوئے آل انڈیا ملی کونسل کے صدر حکیم مولانا عبدالمغیثی نے کہا کہ مولانا سید رابع حسنی ندوی کو اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے وہ بہت صحیح ہے کیونکہ ان میں بھی شاہ ولی اللہ کی فکر پائی جاتی ہے۔ قبل ازیں مولانا رابع حسنی ندوی کے نمائندے ڈاکٹر شاہ عباد الرحمٰن نشاط نے ان کی جانب سے یہ ایوارڈ وصول کیا۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے کے چیک اور میمنٹو پر مشتمل ہے۔ مولانا رابع ندوی اپنی علالت کے سبب نہیں آسکے۔ انھوں نے اپنا پیغام بھیجا تھا جسے ان کے نمائندے نے پڑھ کر سنایا۔ سپاس نامہ ایس ایم شفیق اور ندوۃ العلما لکھنؤ کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد رابع حسنی ندوی کا قلمی خاکہ نوجوان صحافی اور وائس آف امریکا کے نمائندے سہیل انجم نے پیش کیا۔

اس موقعے پر دو جونیئر مقالہ نگاروں محمد کفایت اللہ اور نجم السحر کو ان کے مقالے پر شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے تحت مشترکہ 25 ہزار روپے کا چیک دیا گیا۔ جبکہ 12 ویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے لیے 'میڈیا، سماج اور ہندوستانی مسلمان' کے موضوع کا اعلان کیا گیا ہے۔ آئی او ایس چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے ایوارڈ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد نئی نسل کو ثقافتی ورثہ سے جوڑنا ہے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے شاہ ولی اللہ

کے افکار ونظریات پر روشنی ڈالی۔ سابق چیف جسٹس اے ایم احمدی نے تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی قوم تعلیم کے بغیر ترقی یافتہ نہیں بن سکتی۔ مولانا سید جلال الدین عمری نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ ڈاکٹر سید فاروق نے حضورؐ کی سیرت پر گفتگو کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 اگست 2015

گلزار دہلوی کی 90 ویں سالگرہ

نئی دھلی: نامور شاعر وادیب پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کہا کہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب پر بہت برا وقت آن پڑا ہے تاہم انھیں امید ہے کہ یہ سیاہ بادل ضرور

چھٹیں گے۔ وہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اپنی 90 ویں سالگرہ کے موقع پر منعقد ایک خصوصی تقریب میں خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایسے مشکل وقت میں بھی اردو اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ فروغ پارہی ہے۔ اس سے قبل آئی آئی سی کے صدر سراج الدین قریشی نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں گلزار دہلوی کی اردو زبان وادب کے تئیں خدمات کی ستائش کرتے ہوئے انھیں ایک عہد ساز شخصیت قرار دیا۔ گلزار دہلوی نے اپنے ایک گھنٹہ کے خطاب میں جدوجہد آزادی 'اردو کے فروغ وزوال' ہندو مسلم یکجہتی اور مسلمانوں کی قربانیوں کے واقعات پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ انھوں نے اردو کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ مفتی کفایت اللہ 1907 سے 1937 تک کانگریس کے اجلاسوں اور میٹنگوں کی روداد اردو میں ہی لکھتے رہے۔ تقریب سے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نائب صدر صفدر امام قادری نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جولائی 2015

حنیف سید کو تاج رتن آگرہ اوّل ایوارڈ

آگرہ: کل ہند اجتماعِ مذاہب، کمپاؤنڈ آگرہ کلب، آگرہ (رجسٹرڈ) کی جانب سے 2 جولائی 2015 کو مرکز کے صدر پیرزادہ الحاج رمضان علی شاہ کے 71 ویں یوم ولادت کے موقعے پر مرکز کی جانب سے 'تاج رتن آگرہ' کا اوّل ایوارڈ' 2015 جناب حنیف سیّد کے آپریشن کے باعث، جناب رئیس الدین قریشی کے بہ دست

حنیف سیّد کی صاحبزادی حنا سیّد کو دیا۔ اس موقع پر شہر کے معزز حضرات سیّد سنوان احمد شاہ، سابق ایم پی محترم پربھو دیال کٹھریا، شبیر عبّاس، پردیش ویاپار کے سینو جک شری رام ٹنڈن، نائب سجادہ پیرزادہ بندو میاں، رمضان خاں، لیڈر سلطان خان، سیّد معراج الدین، سمیع آغائی، الحاج عمران علی، عبدالسعید خان، پرم جیت سنگھ، الحاج قاسم علی اومیش چندیل وغیرہ سیکڑوں افراد حاضر رہے۔

اس سے پیشتر بھی مرکز صابری، کمپاؤنڈ آگرہ کلب نے حضرت خواجہ سیّد فتح الدین بلخیؒ کے 13 جون سے 16 جون تک منعقدہ عرس میں 14 رجون کے منقبتی مشاعرہ میں افسانہ نگار حنیف سیّد کو 'سیّد فتح الدین بلخیؒ اوّل ایوارڈ 2015 سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مرکز کے سکریٹری نے اعلان کیا کہ یہ ایوارڈ ہر سال جناب حنیف سیّد سے زیادہ صلاحیت کے حامل ادیب کو بنا تفریق دیا جائے گا۔ آخر میں مرکز کے صدر پیرزادہ رمضان علی شاہ چشتی صابری نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: سکریٹری، وجے کمار جین المعروف زین العابدین، کل ہند اجتماع مذاہب، کمپاؤنڈ آگرہ کلب، آگرہ (رجسٹرڈ)

فرزانہ فرحت کو اعزاز

جرمنی میں قائم اردو زبان وادب کی خدمت میں سرگرم عمل تنظیم اردو انجمن برلن نے عظیم افسانہ نگار عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی کی صد سالہ سالگرہ پر ایک خوبصورت تقریب پالاسٹ (محل) نامی عمارت میں منعقد کی۔ جس میں ہندوستان اور پاکستان کے اہل قلم کے ساتھ ساتھ جرمن دانشوروں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ اس موقعے پر لندن سے تشریف لانے والی معروف شاعرہ محترمہ فرزانہ فرحت کو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں اردو انجمن کی اعزازی شیلڈ سے سرفراز کیا گیا۔ فرزانہ فرحت کے دو شعری مجموعے 'بدلتی شام کے سائے' اور 'خواب خواب زندگی' دبستان ادب کی زینت بن چکے ہیں اور ان مجموعہ کلام کی بین الاقوامی سطح پر بھی پذیرائی ہو چکی ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا ہر رنگ ملتا ہے۔ ملکی حالات، حالاتِ حاضرہ، معاشی بدحالی معاشرتی عدم استحکام، قدرتی مناظر، بدلتے موسموں کے سبھی رنگ اور لطیف انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ جبکہ خواب ان کی شاعری کا استعارہ ہے۔ فرزانہ فرحت شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت میں بھی سرگرم عمل ہیں۔ اور لندن سے جاری ہونے والے ادبی علمی جریدہ 'شمس میگ' کی مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے فروغ اردو ادب میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ وہ مختلف بین الاقوامی سیمینار اور کانفرنسز اور مشاعروں میں شرکت کر چکی ہیں۔

پریس ریلیز: شفیق مراد، جرمنی 10 جولائی 2015

فاروق سید کو استقبالیہ

نئی دھلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی جانب سے ممبئی سے آئے ہوئے بچوں کے ادیب اور 'گل بوٹے' کے مدیر فاروق سید کو مکتبہ جامعہ کے دفتر واقع جامعہ نگر میں استقبالیہ دیا گیا۔ صدارت صوبہ مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ کے سابق چیف جسٹس فخر الدین نے کی جبکہ مہمان خصوصی شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی تھے۔ تقریب کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ اس کے بعد 'پیام تعلیم' اور 'کتاب نما' کے نائب مدیر محمد محفوظ عالم نے مکتبہ جامعہ کا تعارف پیش کیا، آفس انچارج رضوان مصطفیٰ عرشی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر ذی سلام کے پروڈیوسر شکیل جمالی اور این او آئی ایس کے شعبۂ اردو کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ مکتبہ جامعہ کے منیجنگ ڈائرکٹر ڈاکٹر عمران احمد عندلیب نے مکتبہ جامعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں اس ادارے نے اردو زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب بھی ہے۔'' مہمان خصوصی پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ بچوں کے ادب کو بچوں کے لیے بوجھ نہ بنائیں۔ انھیں سائنس یا دوسری چیزوں کی تفصیلات میں نہ الجھائیں کیونکہ وہ کورس کی کتاب میں سب کچھ پڑھ لیتا ہے اس کو ایسا مواد فراہم کریں جس سے تہذیب واخلاق کی جڑیں مضبوط ہوں۔ فاروق سید نے اپنی تقریر میں کہا کہ میرا بس ایک جذبہ ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کے لیے کچھ کروں۔ جسٹس فخر الدین ریٹائرڈ نے کہا کہ مجھے بہت دنوں کے بعد ایسی محفل میں شریک ہونے کا موقع ملا، میرے بچپن کی یادیں تازہ کردیں۔ مختار احمد قاسمی کے شکریے کے ساتھ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اگست 2015

رسم اجرا:

فراق پر لکھی کتاب کا اجرا

نئی دھلی: ہر شاعر اپنے لہجے اور آواز سے پہچانا جاتا ہے، فراق کی اصلی آواز جمالیات کی آواز ہے اور ان کا لہجہ دیگر ہم عصر شعرا میں سب سے الگ ہے۔ ان کی

شاعری میں انسانیت، آزادی اور حریت شامل ہے لیکن جوش اور مجاز کی طرح اعلانیہ کوئی نظریہ نہیں ہے۔ ان خیالات کا اظہار آکسفورڈ بک سینٹر میں اجے مان سنگھ کی معروف اردو شاعر فراق گورکھپوری پر کتاب کا اجرا کرنے کے بعد مشہور نقاد دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 'ہندوستانی آواز' کی بانی محترمہ رخشندہ جلیل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ فراق بہت انوکھی، نرالی اور زریں شخصیت کا نام ہے۔ ان کے سامنے زبان کھولنا کوئی آسان نہیں ہوتا تھا۔ وہ جتنا اردو میں زندہ تھے اتنا ہی ہندی میں بھی رچے بسے تھے۔ انھوں نے کہا کہ فراق کا ماننا تھا کہ کوئی بھی زبان کسی حکومت کے دم پر نہیں بلکہ اپنے دم پر پھلتی پھولتی ہے۔ وہ ترقی پسند اور روشن خیال شاعر تھے لیکن جب شاعری اور ادب کو پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی گئی تو انھوں نے اس کے خلاف آواز بھی بلند کی۔ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر نارنگ نے کہا کہ فراق کوئی معمولی شاعر نہیں تھے لیکن ہندی والوں سے ان کی ہمیشہ لگی رہتی تھی۔ ہندی میں وہ پنت، نرالا اور مہادیوی ورما کا زمانہ تھا۔ دراصل فراق صاحب کا کہنا تھا کہ ہندی ایک وشال زبان ہے لیکن اسے اپنی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لیے اردو کی شستگی اور شگفتگی لانی چاہیے۔ پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ زبانیں کبھی سرکار کے زیر سایہ نہیں پنپتیں اور نہ ہی پھلتی پھولتی ہیں۔ انھوں نے مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندی کو قومی زبان بنا تو لیا گیا لیکن آج بھی عدلیہ ہو یا اعلیٰ تعلیم ہر جگہ انگریزی کا تسلط ہے اور 65 سال گزر جانے کے باوجود ہم ایسا نظام قائم نہیں کر پائے جس میں ہمارے بچے ہندی میں بایولوجی یا کیمسٹری پڑھ سکیں۔ اردو کے تعلق سے اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ عمارتوں میں سب سے خوبصورت عمارت تاج محل ہے اور زبانوں میں سب سے زیادہ خوبصورت زبان اردو ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 جولائی 2015

سرکنارۂ شام

علی گڑھ: حرف زار لٹریری سوسائٹی، ابنِ سینا اکادمی اور غالب اسٹڈی سینٹر کے زیر اہتمام ابن سینا اکادمی، علی گڑھ میں ممتاز استاد شاعر رئیس الدین رئیس کے پانچویں شعری مجموعہ 'سرِ کنارۂ شام' کی رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سینئر استاد اور ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ اس پرآشوب دور میں اردو کی کتاب اور خصوصی طور پر شعری مجموعہ شائع کرنا آسان کام نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ رئیس الدین رئیس نے بے حد تناؤ بھرے ماحول کو اپنی شاعری میں استعاراتی انداز میں پیش کیا ہے جس میں بصری اور حرکی پیکر جلوہ گر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسرار ذات و کائنات کے ساتھ تہذیبوں اور روایتوں کی اعلیٰ قدروں کی نشاندہی بھی رئیس الدین رئیس کی غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ پروگرام کے مہمانِ خصوصی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں سینئر استاد پروفیسر شکیل احمد صمدانی نے کہا کہ وہ رئیس الدین رئیس کو حد درجہ پسند کرتے ہیں اور رئیس کی شاعری صرف ادب ہی نہیں زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کرتی ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ نئی نسل کو اردو زبان سے جوڑنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ انھوں نے پروگرام کے انعقاد میں تعاون کے لیے ابن سینا اکادمی اور غالب اسٹڈی سینٹر کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا، اس موقعے پر الجوف یونیورسٹی سعودی عرب میں انگریزی کے استاد عبدالوہاب سخن نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ابن سینا اکادمی کے ڈائرکٹر پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے رئیس الدین رئیس کو ان کے پانچویں مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ابنِ سینا اکادمی اور غالب اسٹڈی سینٹر ہمیشہ علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی کے لیے حاضر ہیں۔ انھوں نے حرف زار لٹریری سوسائٹی کے سکریٹری ڈاکٹر مجیب شہزر کو اس پروگرام کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے ہر شہر کو شہزر جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے تاکہ اردو زبان و ادب کا مستقبل مزید روشن ہو، نظامت کے فرائض اویس جمال شمسی نے ادا کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 جولائی 2015

وفیات:

'بھارت رتن' ڈاکٹر عبدالکلام کا انتقال

شیلانگ: بھارت رتن اور میزائل مین کے نام سے معروف سماج کے ہر طبقے میں مقبول سابق صدر اے پی جے عبدالکلام کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 84 سال کے

تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے پورے ملک میں رنج وغم کی لہر پھیل گئی۔ صدر جمہوریہ، نائب صدر، وزیر اعظم، کانگریس صدر سمیت ملک کے مقتدر رہنماؤں نے ان کے انتقال کو ملک کا عظیم نقصان قرار دیتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے اپنے پیغام میں کہا کہ ان کے انتقال سے ملک نے اپنا ایک عظیم سپوت کھودیا ہے۔ ان کی گراں قدر خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ وہ نوجوانوں اور سماج کے دوسرے طبقوں کے لیے مشعل راہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی ذات سے ہمیشہ رہنمائی ملتی رہے گی۔ تفصیلات کے مطابق ڈاکٹر کلام شیلانگ کے آئی آئی ایم میں 27 جولائی کو شام قریب ساڑھے چھ بجے لیکچر دے رہے تھے، تبھی اچانک وہ بیہوش ہوکر گر پڑے۔ انھیں فوری طور پر بیتھانی ہسپتال لے جایا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے انھیں مردہ قرار دے دیا۔ وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ نے کہا کہ ڈاکٹر کلام کے اچانک انتقال سے انھیں گہرا دھچکا لگا ہے۔ ان کے انتقال سے ملک کو ایک غیر معمولی نقصان ہوا ہے اور ان کے انتقال سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جسے بھرنا مشکل ہوگا۔'' وزیر خزانہ ارون جیٹلی نے کہا کہ ڈاکٹر کلام نہ صرف ملک کے لیے مشعل راہ تھے بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ مثالی شہری بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف صدر کے طور پر بلکہ ایک سائنس داں کے طور پر بھی ملک کی خدمت کی۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر کلام 2002 سے 2007 تک صدر جمہوریہ رہے۔ وہ ملک کے 11 ویں صدر تھے۔ پوکھرن دھماکے میں ان کا

بہت اہم رول تھا۔ میزائل ٹکنالوجی کو بام عروج پر پہنچانے اور ہندوستان کو ایک سے ایک میزائل دینے میں ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے رول کو کوئی نظرانداز نہیں کرسکتا۔ صدارت کے دوران ان کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں تھا اور جب ایوان صدر سے رخصت ہوئے تو معمولی فقیر کی طرح رخصت ہوئے۔ ڈاکٹر کلام ایک ایسی شخصیت تھے جن کے لیے ہر دل میں پیار تھا۔ وہ 84 سال کے ہونے کے باوجود متحرک تھے اور بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 28 جولائی 2015

نصرت گوالیاری کا انتقال

نئی دھلی: معروف استاد شاعر محمد عثمان عرف پیارے میاں المتخلص بہ نصرت گوالیاری کا دوپہر دل کا دورہ پڑنے سے چتلا گیٹ واقع ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ وہ 73 سال کے تھے اور کافی عرصے سے علیل

تھے۔ بعد نماز عشا ان کی جنازہ کی نماز مسجد فیض الٰہی میں ادا کی گئی جبکہ تدفین قبرستان مہندیان میں عمل میں آئی جس میں بڑی تعداد میں دہلی کی ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ ان کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ان کے مرحوم بھائی کے ہیں جن کی پرورش خود نصرت گوالیاری نے ہی کی ہے۔ نصرت گوالیاری کی پیدائش 1942 میں گوالیار میں ان کے ننیہال میں ہوئی تھی۔ ان کے آباواجداد کا تعلق دہلی سے ہے۔ ان کا خاندان مہرولی میں رہائش پذیر تھا جو دور شاہجہانی میں فصیل بند شہر میں منتقل ہوگیا تھا اور آج بھی کوچہ رحمٰن میں مقیم ہے۔ نصرت گوالیاری 13 سال کی عمر میں 1955 میں دہلی آگئے اور ہمیشہ کے لیے دہلی کے ہی ہوکر رہ گئے لیکن اپنے تخلص کے ساتھ 'گوالیاری' کو برقرار رکھا۔ نصرت گوالیاری کو شاعری کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنا کلام شمیم فرحت اور صاحب زادہ جاں نثار اختر کو دکھایا لیکن بعد میں برصغیر کے معروف شاعر حضرت احسان دانش کے اسکول میں داخل ہوگئے اور عشرت کرت پوری کی شاگردی اختیار کرلی۔ 'سائبان' اور 'سب خواب' کے نام سے ان کے دو شعری مجموعے بھی منظرعام پر آکر کافی مقبول ہوئے۔ انھیں ان کی شعری خدمات کے لیے دہلی اردو اکادمی کی جانب سے ایوارڈ برائے اردو شاعری بھی پیش کیا جاچکا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 جولائی 2015

اکبری خانم کا انتقال

لدھیانہ: جنگ آزادی کے عظیم مجاہد رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کے بڑے صاحب زادے مجاہد آزادی مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانوی کی اہلیہ اکبری خانم (85) کا اٹھارہ رمضان المبارک کی شام کو نماز مغرب کے وقت پھگواڑہ میں انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون، یہاں جامع مسجد لدھیانہ میں مجلس احرار اسلام ہند کی جانب سے ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا گیا جس کی صدارت نائب شاہی امام مولانا محمد عثمان رحمانی لدھیانوی نے فرمائی، اس موقعے پر قرآن پاک کی تلاوت کے بعد مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت بھی کی گئی۔ اس موقعے پر نائب شاہی امام نے کہا کہ مولانا خلیل لرحمٰن لدھیانوی نے ملک کی جنگ آزادی میں جب قربانیوں کا سلسلہ شروع کیا تو ان کی اس بہادر اہلیہ نے ہمیشہ ہی ان کا ساتھ دیا، انھوں نے بتایا کہ مرحومہ مستقل مزاج اور نہایت ہی ہمت والی خاتون تھیں مرحومہ نے کبھی بھی اپنے خاوند کے مشن میں لغزش نہیں پیدا ہونے دی، نائب شاہی امام نے بتایا کہ مرحومہ پنجاب کے شاہی امام مولانا حبیب الرحمٰن ثانی کی حقیقی چچی تھیں، آپ کی اولاد میں بالترتیب مولانا اویس الرحمٰن، صفی الرحمٰن، رضی الرحمٰن، جمال حبیب، سمیہ خاتون، صفیہ رحمٰن زوجہ حافظ عبدالستار مکہ مکرمہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مرحومہ کی تدفین ان کے خاوند کے مزار کے ساتھ ہی پھگواڑہ میں کی گئی نماز جنازہ نائب شاہی امام مولانا محمد عثمان رحمانی لدھیانوی نے ادا کرائی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 جولائی 2015

خراج عقیدت:

ڈاکٹر بشیشر پردیپ

لکھنؤ: ارم ایجوکیشنل سوسائٹی اندرانگر کے زیر اہتمام تعزیتی جلسے کا انعقاد سوسائٹی کے بانی منیجر ڈاکٹر خواجہ سید محمد یونس کی صدارت میں ہوا جس میں مشہور افسانہ نگار اور ملک کے قابل فخر ادیب ڈاکٹر بشیشر پردیپ کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا اور ان کی موت کو اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان بتایا گیا۔ تعزیتی جلسے میں آنجہانی ڈاکٹر بشیشر پردیپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ سید محمد یونس نے کہا کہ ڈاکٹر بشیشر پردیپ زبان وادب کی خدمات میں منہمک رہے اور انھوں نے سائنسی موضوعات کو خصوصیت کے ساتھ اپنے افسانوں کے لیے منتخب کیا اور جدید ترین سائنسی ایجادات کو اپنے افسانوں کے ذریعے اردو قارئین کو باخبر رکھنے کا فریضہ انجام دیا۔ اس موقعے پر محمد عارف نگرامی نے کہا کہ ڈاکٹر بشیشر پردیپ کے افسانے جیتے جاگتے انسان کے مسائل حاضرہ سے نبردآزما نظر آتے ہیں ان کے افسانے صرف دلچسپی کے ہی باعث نہیں ہوتے بلکہ ان سے علم وآگہی کے دروازے بھی کھلتے نظر آتے ہیں انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر بشیشر پردیپ کی کتابوں کا ترجمہ ہندی، انگریزی، گجراتی، تیلگو، پنجابی اور تمل، زبانوں میں بھی ہوا ہے یہ ان کے افسانوں کی مقبولیت کی انتہا ہے۔ اس تعزیتی جلسے میں ڈاکٹر خواجہ رزمی یونس، ڈاکٹر طارق حسین، خواجہ بزمی یونس انجینئر خواجہ فیضی یونس، خواجہ سیفی یونس، انیچ ایم یاسین موجود تھے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 21 جولائی 2015

محمد حنیف

نئی دھلی: پرانی دہلی کے سرکردہ سماجی کارکن اور معروف گلوکار محمد حنیف نے جس طرح ہندوستانی فن و ثقافت کو فروغ دیا وہ ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ محمد حنیف نے صرف گلوکاری کے میدان میں ہندوستان کا نام روشن نہیں کیا بلکہ موسیقی کی دنیا میں بھی نمایاں خدمات کے باعث ہر خاص و عام میں ایک منفرد مقام حاصل کیا یہ باتیں 'نئی روشنی' کے صدر اعجاز اے نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تنظیم کے دفتر میں ایک تعزیتی جلسے میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ محمد رفیع مرحوم کو اپنا استاد ماننے والے محمد حنیف نے تمام عمر محمد رفیع کے طرز پر فلمی گانے گا کر نہ صرف موسیقی کی دنیا بلکہ اسٹیج و آرٹ کے میدان میں بھی لوگوں کو بے حد متاثر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد آج ہم ایک بڑی کمی محسوس کررہے ہیں۔ اعجاز اے نے کہا کہ نئی روشنی

کے بے شمار پروگراموں میں مرحوم محمد حنیف نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے لوگوں کو دادِ تحسین دینے پر مجبور کیا بلکہ دلی آرٹ و اردو ادب و ثقافت کو بھی نمایاں طور پر فروغ دیا ہے انھوں نے اعلان کیا کہ نئی روشنی بہت جلد ان کی یاد میں ایک ادبی وثقافتی پروگرام کا انعقاد کر کے ان کی خدمات کو اجاگر کرے گی۔ جلسے میں صدر سکریٹری و دیگر ممبران کے علاوہ سلیم شیخ، محمد خالد، شکیل آرٹسٹ، محمد فرید، محمد ریحان، محمد سلیمان کے علاوہ دہلی و بیرونی دہلی کے فن وثقافت سے وابستہ فنکار موجود تھے۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 3 اگست 2015

ایک شام اعزاز افضل کے نام

کولکاتا: 'بزمِ افضل' کی جانب سے پروفیسر اعزاز

افضل کے یومِ ولادت مورخہ 20 جولائی 2015 کے موقع پر مغربی بنگال اردو اکادمی کے مولانا ابوالکلام آزاد آڈیٹوریم میں 'ایک شام اعزاز افضل' کے نام سے منائی گئی۔ بزم کے سرپرست جناب شاہ محمد قادری نے افتتاحی کلمات میں سامعین سے خطاب کرتے ہوئے استاذ محترم پروفیسر اعزاز افضل کی ہمہ جہت شخصیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ 'بزمِ افضل' کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر نعیم انیس نے بزم کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 2005 میں پروفیسر اعزاز افضل کے انتقال کے فوراً بعد ان کے شاگردوں اور پرستاروں کی خواہش پر اس بزم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تب سے اب تک اس ادارے نے پروفیسر مرحوم کے کلام اور ان کے فن و شخصیت پر رسائل و جرائد کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ سب سے پہلے ان کے تین شعری مجموعوں 'زخمِ صدا'، 'ان پڑھ آندھی' اور 'قلم برداشتہ' کو یک جا کر کے 'کلامِ اعزاز افضل' کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس کے بعد ان کے رثائی کلام کا مجموعہ 'بہہ رہی ہے فرات آنکھوں سے' کے نام سے منظرِ عام پر لایا گیا اور ان کے فن و شخصیت پر ایک کتاب 'اعزاز افضل: فن اور فن کار' کی بھی اشاعت کی گئی۔ گذشتہ سال جولائی میں بزمِ افضل کی جانب سے ایک سہ ماہی ادبی جریدے 'فکر و تحریر' کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے اب تک چار شمارے منظرِ عام پر آ کر اہالیانِ علم و فن سے دادِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔ یہ جلسہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جناب کلیم حاذق نے اعزاز افضل کے فن و شخصیت پر توسیعی خطبہ پیش کیا۔ مہمانِ خصوصی جناب قمر الدین ملک نے کہا کہ افضل صاحب سے میری براہِ راست رسم و راہ نہیں تھی لیکن ان کے صاحب زادے جناب تنویر افضل کے حوالے سے میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ ایک اچھا شاعر، نثر نگار، استاد اور ان سب سے بڑھ کر ایک اچھا انسان یہ خوبیاں انھیں ہمارے دلوں میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ معروف افسانہ نگار جناب انیس رفیع (سابق ڈپٹی ڈائریکٹر، دوردرشن گواہاٹی) نے افضل صاحب سے اپنے دیرینہ مراسم کا اظہار کرتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر شمیم انور نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ 'بزمِ افضل' نے افضل صاحب کو زندہ رکھنے کا کام کیا ہے۔ 'بزمِ افضل' افضل کی یادوں کو تازہ کرنے کا کام گاہے گاہے کرتی رہتی ہے جو بڑی خوش آئند بات ہے۔ اس موقعے پر شریمتی جوشنا گانگولی اور شریجانی بنرجی نے ان کی غزلیں سنائیں۔

پریس ریلیز، انیس نعیم، مغربی بنگال، 20 جولائی 2015

ساجد رشید کی چوتھی برسی

ممبئی: ہفت روزہ 'خبر مشن' کرلا کے زیر اہتمام صحافی

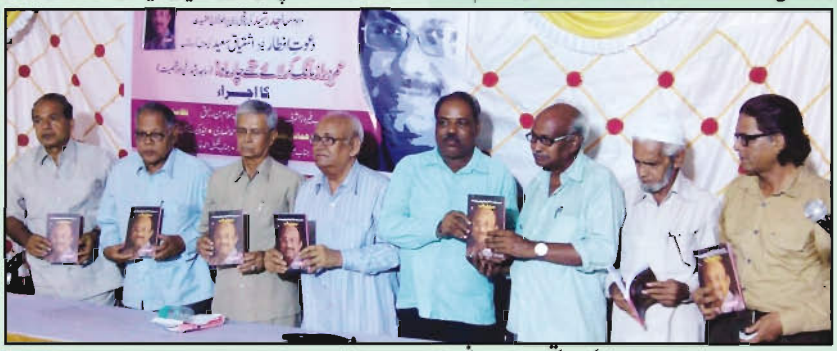

اور افسانہ نگار مرحوم ساجد رشید کی چوتھی برسی پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ نیز افسانہ نگار اشتیاق سعید کی مرتب کردہ کتاب 'عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار ماہ' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ کتاب کا اجرا بزرگ صحافی فیروز اشرف کے ہاتھوں انجام پایا۔ جبکہ تقریب کی صدارت ممتاز افسانہ نگار سلام بن رزاق نے کی۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے کامریڈ اسرار احمد انصاری، ایڈوکیٹ یٰسین مومن (بھیونڈی) م ناگ، فاروق سیّد، شیخ عبدالباری اور شکیل احمد خان (ممبئی) شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر عالم ندوی نے انجام دیے۔ یہ تقریب ساجد رشید کی چوتھی برسی 11 جولائی 2015 بروز سنیچر ایم ای ایس اُردو ہائی اسکول، ہلاوَیل، کُرلا (مغرب) میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی ابتدا میں مشہور ناول 'اُداس نسلیں' کے خالق عبداللہ حسین اور معروف شاعر بشر نواز کے انتقال پر دعائے خیر کی گئی کہ اللہ ربّ العزّت دونوں ہی مرحومین کو غریقِ رحمت کرے (آمین)

گُل بوٹے کے مدیر فاروق سیّد نے ساجد رشید سے والہانہ وابستگی کا ذکر کیا اور کہا کہ صحافت میں جو شُد بُد مجھے حاصل ہوئی وہ ساجد رشید ہی کی بدولت ہے۔ کامریڈ اسرار احمد انصاری نے ساجد کی شخصیت اور اُن کی خوبیوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ بڑے بڑے مسلم مسائل کو حل کرنے کی قوت رکھتے تھے اور نہ صرف اپنے مخالفین پر لفظی حملہ کرتے تھے بلکہ وہ اپنے اوپر ہونے والے حملوں کو برداشت کرنے کی قوت رکھتے تھے۔ ایڈوکیٹ یٰسین مومن نے ساجد سے اپنے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا۔ تقریب کے صدر سلام بن رزاق نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ ساجد دراصل صحافت کا آدمی تھا وہ افسانہ نگاری کی طرف یوں ہی چلا آیا تھا لیکن اس میں بھی لوہا منوالیا۔ وہ سیاسی اور سماجی شعور کی کہانیاں لکھتا تھا۔ تقریب کے اختتام پر کنوینر عبدالباری ایم کے نے مہمانان و حاضرین نیز ایم ای ایس اسکول کے صدر ماسٹر وسیم الدین اعظمی کا بھی شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، اشتیاق سعید، ممبئی، 14 جولائی 2015

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیاتِ ابراہیم یوسف (جلد اوّل تا چہارم)

مرتب: محمد نعمان خان
صفحات: 3228 (مکمل سیٹ)
قیمت: 1343 روپے (مکمل سیٹ)

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو) کامرس

ادارہ
صفحات: 306
قیمت: 141 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل تا سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 1454 (مکمل سیٹ)
قیمت: -/420 روپے (مکمل سیٹ)

ہمارا طرزِ زندگی اور بیماریاں

مصنف: ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی
صفحات: 69
قیمت: -/42 روپے

ادبی صحافت (آزادی کے بعد)

مصنف: عبدالحی
صفحات: 414
قیمت: -/185 روپے

لکیر کا فقیر

مصنف: ڈاکٹر نسرین رمضان سیّد
صفحات: 131
قیمت: -/30 روپے

شرارِ جستجو

مصنف: قیصر ضحیٰ عالم
صفحات: 125
قیمت: -/80 روپے

زندگی نامہ: قرۃ العین

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 296
قیمت: 143 روپے

لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر

مصنف: سید عبدالباری
صفحات: 690
قیمت: -/286 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل
صفحات: 83
قیمت: -/24 روپے

حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد

مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

ٹی وی نیوز پروڈکشن فن اور طریقۂ کار

مصنف: سمیع الرحمٰن
صفحات: 217
قیمت: 93 روپے

کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن

مصنف: خورشید عالم
صفحات: 180
قیمت: 144 روپے

دیوانِ بیدار

مرتب: پروفیسر نسیم احمد
صفحات: 256
قیمت: 122 روپے

اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے

مصنف: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 500
قیمت: -/174 روپے

انگریزی اصطلاحوں اور محاوروں کی جدید صحافتی فرہنگ

مصنف: سید راشد اشرف
صفحات: 493
قیمت: -/238 روپے

ابتدائی نفسیات

مصنف: سید محمد حسن
صفحات: 240
قیمت: -/94 روپے

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا

مصنف: اختر اورینوی
صفحات: 347
قیمت: -/124 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, September-2015, Vol.17, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/08/2015**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Prof. Syed Ali Karim, Tel : 49539000